ارمغانِ حق

جلد 2

از قلم

مولانا محمد ابوبکر غازی پوری

غیر مقلّدین کے بہت سے اعتراضات کا کتاب وسنّت کی روشنی میں تسلّی بخش جواب

پیش کش

مفتی محمد عبد المجید دین پوری

نائب رئیس دار الافتاء جامعة العلوم الاسلامیة
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

بیت العمار کراچی

فہرس

(۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

ارمغان حق جلد اول گزشتہ سال سے پیوستہ جب ہم نے شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اندازہ نہیں تھا کہ اللہ تعالی اسکو اتنی مقبولیت دیں گے جس کا مشاہدہ اسکے شائع ہونے کے بعد ہوا۔ الحمد اللہ اس کتاب کے نسخے سال بھر کے اندر ہی ختم ہونے کے قریب ہو گئے تھے تھوڑے سے نسخے ہم نے اہم ضرورت کے لیے روک لیے تھے اب قریب الختم ہیں پاکستان میں بھی یہ کتاب بڑی آب وتاب کے ساتھ چھپی اور وہاں کے موٴخر جرائد نے اس پر بہترین تبصرہ کیا۔

اس کتاب کی جلد اول منظر عام پر آجانے کے بعد شائقین کا بے حد اصرار تھا کہ اسکی جلد دوئم بھی جلد سے جلد سے شائع ہو، ہم وقت کا انتظار کررہے تھے کہ جلد دوئم کے مواد جو زمزم میں شائع ہو رہے تھے اس کی معتد بہ مقدار جمع ہو جائے تو جلد دوئم کی اشاعت کا پروگرام بنا یا جائے خدا کا شکر ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے اور ہم شائقین اور اہل علم کی خدمت میں ارمغان حق کی جلد دوئم پیش کرنے جارہے ہیں یہ جلد بھی اپنی ضخامت کے اعتبار سے تقریبا پہلی جتنی رکھی گئی ہے حالانکہ اس دو سال کے دوران کاغذ کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے مگر ہم نے اسکو نظر انداز کر دیا ہے تا کہ کم قیمت پر یہ کتاب زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچے۔

ان دونوں جلدوں میں غیر مقلدیت کے سلسلہ کے بہت اہم مواد جمع ہو گئے ہیں اور جو حضرات فقہ حنفی کے بارے میں کسی طرح کے شکوک وشبہات میں بتلا ہیں اگر انکی نیت صاف ہے اور طبعیت میں عناد نہیں ہے تو ان دونوں جلدوں کے مطالعہ سے اگر اللہ نے چاہا تو انکے تمام شکوک وشبہات ختم ہو جائینگے۔ غیر مقلدین حضرات عوام کو بہکانے کے کام میں بہت سرگرم ہیں اسلئے ضرورت ہے کہ اس کتاب کی دونوں جلدوں کو زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچایا جائے

دعا ہے کہ اللہ تعالی اس جلد سے بھی اسکی پہلی جلد کیطرح لوگوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے

محمد ابوبکر غازی پوری

۲ مئی ۲۰۰۶ء ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

عیداور جمعہ اگر ایک ہی روز پڑ جائیں
تو کیا جمعہ پڑھنا واجب نہیں ہے؟

محترم حضرت مولانا محمد ابوبکر صاحب غازی پوری دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'!

زمزم اور آپ کی کتابوں کے ذریعہ آپ سے تعارف بہت قدیم ہے ،زمزم کے مضامین بڑے بصیرت افروز،مدلل اور پراز معلومات ہوتے ہیں،اللہ نے آپ کو تفہیم کا سلیقہ بھی خوب دیا ہے بارک اللہ فی حیاتکم وعلمکم وافادتکم۔

امسال بقرعید جمعہ کے روز پڑی تھی،شہر آرہ میں اہلحدیث حضرات کی ایک مسجد ہے جس کو مسجد ابراہیم کہتے ہیں،غالباً مولانا ابراہیم آروی صاحب کے نام پر یہ مسجد ہے اس میں نماز پڑھنے کا ہمارے بعض ساتھیوں کو اتفاق ہوا،تو امام صاحب کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ اس مسجد میں بقرعید کے روز جمعہ کی نماز نہیں ہوگی ظہر کی ہوگی ،ہمارے ساتھیوں کو تعجب ہوا کہ یہ کون سا مسئلہ ہے۔براہ کرم آپ اس سلسلہ میں جو صحیح بات ہو اس کی طرف رہنمائی فرمائیں امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

نیاز احمد گیا بہار

زمزم!

آپ جس قوم کو اہلحدیث کہہ رہے ہیں ،دینی وشرعی مسائل میں ان کا اعتبار نہیں ہے۔یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے اپنی گردن سے تقلید کا قلادہ اتار دیا ہے اور ان کا ہر چھوٹا بڑا بزعم خود مجتہد بنا ہوا ہے،ائمہ فقہ وحدیث سے ان کا رشتہ ٹوٹا ہوا ہے اسلاف کی راہ سے الگ ان کی راہ ہے،ان کے قول وفعل کا نہ کوئی سر ہوتا ہے نہ پیر۔

اہلحدیث حضرات بزعم خود صرف قرآن وحدیث کی پیروی کے دعویدار ہوتے ہیں،مگر ان کا یہ دعویٰ صرف ہوائی ہوتا ہے،حقیقت اور واقع سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔اب اسی مسئلہ میں ان کو پرکھ لیجئے اور ان سے پوچھئے کہ کسی ایک صحیح حدیث سے ان کا بڑے سے بڑا عالم یہ ثابت کردے کہ آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ اور عید کے جمع ہونے کی شکل میں صرف عید کی نماز پڑھی ہے جمعہ کی نہیں پڑھی ہے تو ان کے چہرہ پر ہوائیاں اڑیں گی اور ان کے حصہ میں صرف شرمندگی آئے گی۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پورے ذخیرہ حدیث میں ایک حدیث بھی نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ جمعہ کے روز عید اور بقرعید پڑنے کی شکل میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف عید کی نماز پڑھنے پر اکتفاء کیا ہو اور جمعہ نہ پڑھا ہو،صحابہ کرامؓ میں سے بعض حضرات سے یہ ضرور ثابت ہے کہ انہوں نے جمعہ کے روز عید پڑنے کی صورت میں صرف عید کی نماز پر اکتفاء کیا تھا۔مگر صحابہ کرامؓ کا عمل ان بزعم خود ''اہلحدیث'' حضرات کے یہاں کوئی حجت شرعی نہیں ہے،صحابہ کرام کے بارے میں ان کا عقیدہ بہت مشہور ہے کہ صحابہ کرامؓ کا نہ فعل حجت ہے،نہ قول حجت ہے،اور نہ ان کی رائے قابل اعتماد ہے،یہ قوم تو صرف قرآن وحدیث پر عمل کرنے والی ہے،تو اگر صحابہ کرامؓ میں

سے کسی ایک دو سے اس کا ثبوت ہو بھی کہ انہوں نے عید جمعہ کے روز پڑنے کی شکل میں صرف عید کی نماز پر اکتفا کیا ہو تو اس سے ان غیر مقلدین کو کیا فائدہ پہنچے گا، غیر مقلدین کو لازم ہے کہ وہ آنحضور اکرمؐ سے اس کا ثبوت پیش کریں۔

جس حدیث کے بل بوتے پر غیر مقلدین نے جمعہ کے روز عید پڑنے کی شکل میں صرف عید پڑھنے کا مسئلہ اختیار کیا ہے وہ حدیث ابو داؤد، ابن ماجہ وغیرہ میں یہ ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

قداجتمع فی یومکم ھذا عیدان ومن شاء اجزاہ من الجمعة وانامجمعون.

(ابو داؤد)

یعنی آج کے دن دو عید جمع ہو گئی ہے (عید اور جمعہ) پس جو چاہے تو عید کی نماز اس کو جمعہ سے کافی ہے، ہم لوگ تو جمعہ ادا کریں گے

۔

یہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے، حضرت زید بن ارقم کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا من شاء ان یصلی فلیصل

آپ نے عید کی نماز پڑھنے کے بعد فرمایا جمعہ کی نماز جو پڑھنا چاہے پڑھے (ابو داؤد)

یعنی آپ ﷺ نے لوگوں کو جمعہ پڑھنے اور نہ پڑھنے کا اختیار دیا۔ ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے

قال اجتمع عیدان علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصلی بالناس ثم قال من شاء ان یاتی الجمعة فلیاتھاومن شاء ان یتخلف

(ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عید اور جمعہ ایک ہی روز پڑے، تو آپ ﷺ نے عید کی نماز پڑھ کر فرمایا جو چاہے جمعہ کو آئے اور جو نہ آنا چاہے مت آئے۔

اور عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ آج دو عیدیں اکٹھی ہو گئی ہیں (یعنی جمعہ کے روز عید پڑی ہے) پس جو چاہے تو عید کی نماز اسے کافی ہے اور ہم لوگ تو ان شاءاللہ جمعہ پڑھیں گے۔ (ابن ماجہ)

یہی وہ حدیثیں ہیں جن کو غیر مقلدین نے عید کے روز جمعہ نہ پڑھنے کی دلیل بنایا ہے مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ کسی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ آنحضور ﷺ نے عید اور جمعہ کے جمع ہونے کی شکل میں صرف عید کی نماز پڑھنے پر اکتفاء کیا ہو، بلکہ آپ نے تو صحابہ کرامؓ کے مجمع میں یہ اعلان کیا تھا کہ انا مجمعون ہم لوگ جمعہ پڑھیں گے، تو آپ انصاف سے بتلائیں کہ آنحضور اکرم ﷺ کی سنت جمعہ کا پڑھنا ہوا یا آپ کی سنت عید کے روز جمعہ کا ترک کرنا ہوا، آرہ کی مسجد میں غیر مقلدوں کو کیا اعلان کرنا چاہئے تھا، احادیث کی روشنی میں اگر ان میں حدیث پر عمل کرنے کا بڑا جذبہ ہی تھا تو ان کو یہ اعلان کرنا چاہئے تھا کہ لوگو! آج عید اور جمعہ دونوں جمع ہو گئے ہیں ہم لوگ تو جمعہ کی نماز ادا کریں گے جس کا جی چاہے آئے اور جس کا جی چاہے نہ آئے، آپ ﷺ نے اسی طرح کا اعلان کیا تھا، اگر امام صاحب نے اس طرح کا

اعلان کیا ہوتا تو ان کا یہ اعلان حدیث کے مطابق ہوتا، مگر یہ اعلان تو اس وقت کیا جاتا جبکہ آنحضور اکرم ﷺ کی سنت پر عمل کرنے کا جذبہ ہوتا، ان حضرات کی تو عادت محض احناف کی مخالفت ہے، چاہے اس سے حدیث کی مخالفت ہی کیوں نہ ہو اس کی ان کو پرواہ نہیں ہوتی۔ شر وفساد جب مقصود ہو تو سنت پر عمل کرنے کی توفیق ان کو نصیب کہاں ہوگی

بہر حال ان احادیث سے کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ جمعہ کے روز عید پڑنے کی شکل میں آنحضور اکرم ﷺ نے صرف عید کی نماز پڑھی تھی اور جمعہ چھوڑ دیا تھا بلکہ یہ پتہ چلتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے عید اور جمعہ دونوں نمازیں ادا کی تھیں البتہ ان احادیث کے ظاہر الفاظ سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ چاہیں تو جمعہ کی نماز پڑھیں اور اگر چاہیں تو جمعہ کی نماز نہ پڑھیں، ان کو صرف عید کی نماز کافی ہو جائیگی۔

غیر مقلدین نے آنحضور اکرم ﷺ کی اسی رخصت والی بات کو اپنا مذہب بنالیا ہے، اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ آنحضور اکرم ﷺ نے جمعہ نہ پڑھنے کی یہ رخصت کس کو دی تھی، آپ کی یہ اجازت عام تھی اور اس کے مخاطب سارے صحابہ کرامؓ تھے یا یہ اجازت صرف ان صحابہ کرامؓ کے لئے تھی جو دور دراز علاقوں سے عید کی نماز پڑھنے کے لئے مدینہ تشریف لائے تھے، غیر مقلدین نے اپنی غلط فہمی اور کم علمی کی وجہ سے اس اجازت کو عام سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ اجازت صرف ان کو تھی جو مدینہ کے باہر سے عید کی نماز پڑھنے کے لئے تشریف لائے تھے کہ اگر وہ چاہیں تو چونکہ ان پر جمعہ واجب نہیں ہے وہ جاسکتے ہیں۔

غیر مقلدین تو دینی و شرعی مسائل میں صحابہ کرامؓ کو بالکل کالعدم کئے ہوئے ہیں حالانکہ صحابہ کرامؓ کو نظر انداز کر کے دین کو نہیں سمجھا جا سکتا ہے، صحابہ کرامؓ کو چھوڑ کر نہ قرآن صحیح سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ احادیث کا صحیح مفہوم واضح ہو سکتا ہے، اب یہیں دیکھئے کہ غیر مقلدین نے مذکورہ حدیثوں کے صرف ظاہر کو دیکھا اور یہ مذہب بنالیا کہ عید کے روز جمعہ پڑھنے کی کسی کو ضرورت نہیں ہے، اور اس کا ان کی مسجدوں میں اعلان بھی کیا جانے لگا، اور یہ اس بات سے بالکل غافل رہے کہ آپ ﷺ کی یہ اجازت صرف دیہات والوں کے لئے تھی، اہل شہر کے لئے نہیں تھی، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بھی عید اور جمعہ دونوں اکھٹے ہو گئے تھے تو حضرت عثمانؓ نے عید کی نماز پڑھ کر یہ اعلان کیا تھا۔

ان هذا یوم اجتمع فیه عیدان للمسلمین فمن کان ههنامن اهل العوالی فقداذناه ان ینصرف ومن احب ان یمکث فلیمکث .(ابن ابی شیبه)

اے لوگو آج ایسا دن ہے کہ مسلمانوں کی دو عیدیں اکٹھی ہوگئی ہیں پس جو یہاں اہل عوالی میں سے ہے (یعنی جس نے ہمارے ساتھ اہل عوالی میں سے عید کی نماز پڑھی ہے) ہماری طرف سے اس کو واپس جانے کی اجازت ہے (یعنی اس کو جمعہ کی نماز کے لئے رکنا ضروری نہیں ہے) اور جو جمعہ کے لئے رکنا چاہے وہ رکے۔

اہل عوالی ان لوگوں کو کہا جاتا تھا جو مدینہ شہر سے باہر رہا کرتے تھے یعنی دیہات کے لوگ عید کی نماز کے لئے مدینہ شریف حاضر ہوتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ نہ پڑھنے کی رخصت صرف مدینہ سے باہر سے آنے والوں کے لئے تھی۔ یہ

رخصت عام مسلمانوں کے لئے نہیں تھی ،اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ جمعہ کی نماز پڑھا کرتے تھے ان کا معمول یہی تھا اور صحابہ کرامؓ کا معمول خصوصاً خلیفہ وقت کا معمول اپنی رائے سے نہیں ہوگا ان کا وہی معمول ہوگا جو آنحضور اکرم ﷺ کا عام طریقہ اور آپ کی اصل سنت تھی ۔تو اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ احادیث میں جو آنحضور ﷺ کی طرف سے رخصت کا اعلان تھا وہ صرف اہل عوالی یعنی مدینہ شریف کے باہر سے آنے والوں کے لئے تھا،شہر مدینہ میں رہنے والوں کے لئے نہیں تھا،بدایۃ المجتھد میں علامہ ابن رشد لکھتے ہیں۔

وقال قوم ھذہ رخصۃ لاھل البوادی الذین یردون الامصار للعید والجمعۃ خاصۃ کماروی عن عثمانؓ انہ خطب فی یوم عید وجمعۃ فقال :من احب من اھل العالیۃ ان ینتظر الجمعۃ فلینتظر ومن احب ان یرجع الی فلیرجع رواہ مالک فی المؤطا روی نحوہ عن عمربن عبدالعزیزؒ وبہ قال الشافعیؒ

یعنی ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ یہ رخصت خاص طور پر ان دیہات والوں کے لئے تھی جو عید اور جمعہ کے لئے مدینہ تشریف لایا کرتے تھے ،جیسا کہ حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس روز خطبہ دیا جس دن عید اور جمعہ اکٹھے ہوگئے تھے ،آپ نے فرمایا تھا دیہات سے آنے والوں میں سے جو جمعہ کی نماز پڑھنا چاہے وہ انتظار کرے اور جو واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے (اسلئے کہ دیہات والوں پر جمعہ واجب نہیں ہے)حضرت عمر بن عبدالعزیز (خلیفہ راشد) سے بھی اسی طرح کی بات منقول ہے ،امام شافعیؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔

غیر مقلدین نے حضرت عثمانؓ کے اس خطبہ اور اعلان کو یکسر نظر انداز کردیا ہے ،حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ کے کسی عمل یا قول کی حقیقت اور اس کا منشاء اور صحیح مطلب جاننے کے لئے اکابر صحابہ کرام کے قول وعمل کو بھی دیکھنا ضروری ہوتا ہے صحابہ کرامؓ کے اقوال وافعال حضور اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ کے لئے شرح وتفسیر ہوتے ہیں ،اسلاف کرام کا یہی طریقہ تھا کہ وہ آنحضور ﷺ کی احادیث مبارکہ کو صحابہ کرامؓ کی سنتوں اور ان کے عمل کی روشنی میں دیکھا کرتے تھے ،غیر مقلدین نے اسلاف کے اسی طریقہ کو چھوڑ رکھا ہے۔

ایک بات اور ذہن میں رکھئے کہ حضرت امام مالکؒ کا یہ مذہب سب کو معلوم ہے کہ ان کے نزدیک اہل مدینہ کے عمل کی بڑی اہمیت تھی حتی کہ اگر کوئی صحیح حدیث بھی اہل مدینہ کے عمل کے خلاف ہوا کرتی تھی تو وہ اہل مدینہ کے عمل کو ترجیح دیا کرتے تھے ،اور حدیث پاک کو چھوڑ دیا کرتے تھے ،حضرت امام مالکؒ کی پوری زندگی مدینہ پاک میں گزری تھی ،اگر مدینہ پاک میں مسلمانوں کا یہی عمل ہوتا کہ جمعہ اور عید جمع ہوجانے کی شکل میں صحابہ وتابعین جمعہ نہ پڑھا کرتے تو حضرت امام مالکؒ کا بھی یہی مذہب ہوتا اور وہ بھی اسی کے قائل ہوتے کہ عید اور جمع ہوجانے کی شکل میں جمعہ نہ پڑھا جائے مگر حضرت امام مالکؒ کا اس بارے میں وہی مذہب ہے جو امام ابوحنیفہؒ کا ہے ،یعنی ان کے نزدیک بھی مسلمانوں پر جمعہ پڑھنا واجب ہے اور فرض ہے۔علامہ ابن رشد فرماتے ہیں:

وقال مالکؒ وابوحنیفۃؒ اذا اجتمع عید وجمعۃ فالمکلف مخاطب بھما جمیعاً العید علی انہ سنۃ والجمعۃ علی انھا فرض ولاینوب احدھما عن الآخر وھذا ھو الاصل .

یعنی حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر کسی سال عید اور جمعہ دونوں کا اجتماع ہوجائے تو جو مکلف ہے

یعنی جس پر شرعی احکام وعبادات کی ادائیگی واجب اور ضروری ہے وہ ان دونوں کا مخاطب ہے، یعنی اسے عید کی بھی نماز پڑھنی ہے اس وجہ سے کہ وہ سنت ہے اور جمعہ بھی پڑھنا ہے اس وجہ سے کہ وہ فرض ہے، اور ایک نماز دوسری نماز کے قائم مقام نہیں ہوسکتی اور یہی اصل حکم ہے ۔

اور اصل حکم اور اصل شریعت یہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فرض فرض کے قائم مقام ہو اور سنت سنت کے قائم مقام ہو یہ بات تو عقلاً سمجھ میں آتی ہے، مگر سنت فرض کے قائم مقام ہو یہ عقل کے بالکل خلاف ہے اور شریعت کا کوئی حکم عقل کے خلاف نہیں ہوسکتا عید کی نماز سنت، اور جمعہ فرض ہے تو عید کے لئے جمعہ چھوڑ دیا جائے اور عید کی نماز جمعہ کے قائم مقام ہوجائے یہ بات غیر مقلدین کی عقل قبول کرے تو کرے مگر دین کی فہم رکھنے والا شریعت کے اصول سے واقف کوئی انسان یہ بات نہیں کہہ سکتا۔

غیر مقلدین کی دین کی فہم کا تو عالم یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جمعہ کی نماز واجب نہیں ہے البتہ ظہر کی نماز پڑھنی ضروری ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ جب غیر مقلدین یہ کہتے ہیں کہ عید کی نماز جمعہ کے قائم مقام ہوتی ہے عید کی نماز پڑھنے سے جمعہ ساقط ہوجاتا ہے تو یہ جمعہ تو ظہر کا قائم مقام تھا اب تو ظہر بھی ساقط ہوگی، تو اب ظہر کا پڑھنا کیوں ضروری ہے؟

ذرا غیر مقلدین کسی حدیث پاک سے ثابت کردیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسے موقع پر یعنی عید اور جمعہ کے جمع ہونے کی شکل میں عید کی نماز بھی پڑھی ہو اور ظہر بھی پڑھی ہو؟ تو جو کام حضور ﷺ نے نہیں کیا اس کام کو غیر مقلدین اپنی عقل اور اپنے اجتہاد سے سنت قرار دے رہے ہیں، ماشاء اللہ یہ ہے انکا اجتہاد اور حدیث پر عمل کرنے کا جذبہ، حالانکہ غیر مقلدین کا یہ عمل سراسر آنحضور ﷺ کے عمل کے خلاف ہے، اور آپ ﷺ کے عمل کے خلاف کوئی عمل کرنا اور اس کو اصل دین قرار دینا بدترین قسم کی گمراہی اور بدترین قسم کی بدعت ہے، جب آدمی تقلید کا پھندا گلے سے اتار دیتا ہے اور ائمہ دین اور ماہرین فقہ وحدیث کی اتباع سے گریزاں ہوتا ہے تو وہ اسی قسم کی گمراہی میں پڑتا ہے اور اس کی بدبختی کی بات یہ ہوتی ہے کہ اس گمراہی کو اصل دین سمجھتا ہے۔

غیر مقلدین کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ حدیث پر عمل کرنے والے لوگ ہیں، ان کا عمل حدیث پر کس طرح کا ہوتا ہے، اوپر کی گفتگو میں اس کی حقیقت واضح کردی گئی ہے۔

اب ہمیں آپ سے یہ کہنا ہے کہ یہ پروپیگنڈائی گروہ ہے، ان کے عوام بیچارے تو عوام ان کے علماء تک کو احادیث کے معنی ومفہوم کا ادراک نہیں ہوتا اور نہ ان کو اس کی توفیق ہوتی ہے کہ وہ احادیث پر غور وفکر کے بعد عمل میں لائیں، مثلاً یہاں اسی حدیث میں جو شروع میں حضرت ابو ہریرہؓ کی ذکر کی گئی ہے دیکھئے کہ آنحضور ﷺ نے عید کی نماز پڑھنے کے بعد کیا ارشاد فرمایا تھا، آپ کا یہ ارشاد تھا کہ انا مجمعون (ہمیں تو جمعہ پڑھنا ہی ہے) یعنی کلمہ ان جو عربی زبان میں تاکید کے لئے آتا ہے، اس کا آپ ﷺ نے استعمال کیا، اس کا لفظی ترجمہ ہوگا، بیشک ہم لوگ جمعہ کی نماز ادا کریں گے، یعنی اس کا محاورۃ ترجمہ ہوگا ہمیں تو جمعہ ادا کرنا ہی ہے، یعنی ہم چونکہ اسی شہر کے رہنے والے ہیں، دیہات سے نہیں آئے ہوئے ہیں اس وجہ سے ہمارے اوپر تو جمعہ کا پڑھنا لازم ہی ہے۔ ہمارے لئے رخصت نہیں ہے ، رخصت باہر سے آنے والوں کے لئے ہے یعنی حدیث پاک کا لفظ خود ہی بول رہا ہے کہ شہر والوں پر جمعہ کی ادائیگی واجب اور ضروری ہے

مگر غیر مقلدوں کو اتنی فرصت کہاں کہ ان باریکیوں میں پڑیں، اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے غور وفکر کی زحمت برداشت کریں، زحمت تو وہ برداشت کریں جن کے نزدیک کتاب وسنت کی اہمیت ہوتی ہے اور کتاب وسنت پر عمل کرنے کا صحیح جذبہ ہوتا ہے۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر بالفرض والمحال حدیث پاک کا وہی مفہوم ہوتا جو غیر مقلدین نے اپنی قلت فہم اور دین میں بے بصیرتی سے سمجھا ہے، تب بھی اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرنا اصول شریعت کے خلاف ہوتا، اس لئے کہ جمعہ تو قرآن کی نص قطعی سے واجب اور فرض ہے، اور احادیث خصوصاً جو مشہور اور متواتر نہ ہوں وہ ظنی ہوتی ہیں اگر قرآن وحدیث میں تعارض اور ٹکراؤ کی شکل پیدا ہو تو علماء شریعت اور اسلاف امت قرآن کو مقدم رکھتے ہیں اور احادیث کو چھوڑ دیتے ہیں۔ احادیث کے بارے میں شبہ ہوسکتا ہے کہ راویوں سے غلطی ہوگئی ہو، صحیح طور پر حدیث نقل نہ ہوئی ہو، مگر قرآن کے بارے میں اس طرح کے شبہ کا امکان نہیں ہے، قرآن پاک میں خدا کا ارشاد ہے۔

یا ایھاالذین امنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ

اس آیت کریمہ نے جمعہ کی نماز کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیا ہے، اس لئے کسی مسلمان سے بلا عذر شرعی نماز جمعہ کے ساقط ہونے کا سوال ہی نہیں ہوتا ہے، اور نہ کوئی حدیث جس کا مفہوم اس آیت پاک کے خلاف ہو قابل قبول ہوسکتی ہے۔

افسوس غیر مقلدین نے حدیث حدیث کا ایسا نعرہ بلند کیا کہ ان کے نزدیک قرآن کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے، اور نہ قرآن پر عمل نہ کرنے کا ان کو غم ستاتا ہے وہ حدیث کے مقابلے میں بلا تکلف قرآن سے منہ موڑ لیتے ہیں اور افسوس تو یہ ہے کہ اپنی اس گمراہی پر ان کو ناز ہوتا ہے اور ان کی اہل حدیثیت کو چار چاند لگتے ہیں۔

میں نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے اس کی تائید حضرت امام شافعیؒ کے اس بیان سے مزید ہوتی ہے وہ اپنی کتاب ''کتاب الام'' میں فرماتے ہیں۔

(امام شافعیؒ نے کہا) اور اگر عید الفطر کا دن جمعہ کا ہو تو امام جب نماز کا وقت ہو جائے تو عید کی نماز پڑھائے گا پھر ان کو جو شہر کے لوگ نہیں ہیں اجازت دے گا کہ اگر وہ چاہیں تو واپس ہو جائیں اور اپنے گھروں کو جائیں اور جمعہ پڑھنے دوبارہ نہ آئیں اور ان کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ ٹھہرے رہیں اور جمعہ پڑھ کر گھروں کو جائیں یا واپس جا کر دوبارہ آئیں اور جمعہ پڑھیں، اور یہ حکم ان کا ہے جو شہر کے لوگ نہیں ہیں، غیر شہر والوں میں سے کسی کے لئے یہ حکم نہیں ہے کہ وہ جمعہ چھوڑیں اگر چہ وہ عید کا دن ہی کیوں نہ ہو الا یہ کہ ان کو کوئی عذر شرعی ہو، اور یہی حکم عید الاضحیٰ کا بھی ہے

(کتاب الام ص ۲۳۹ ج ۱)

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کلام اس مسئلہ کی حقیقت کو خوب واضح کر رہا ہے بشرطیکہ آدمی مسائل شرعیہ کو ائمہ فقہ وحدیث سے سمجھنا بھی چاہے۔

اب اخیر میں دنیائے غیر مقلدیت کے سب سے بڑے غیر مقلد اور غیر مقلدوں کے امام ابن حزم کا یہ کلام بھی ملاحظہ ہو ابن حزم اپنی مشہور کتاب محلی میں فرماتے ہیں

واذا اجتمع عید یوم جمعة صلی للعید ثم للجمعة ولابد ولایصح اثر خلاف ذلک

قال ابو محمد الجمعة فرض والعید تطوع والتطوع لایسقط الفرض

(محلی ص ۹۳ ج ۳)

یعنی اگر عید جمعہ کے روز پڑ جائے تو عید کی نماز ادا کر کے جمعہ کی نماز پڑھے گا اور یہ ضروری ہے اور کوئی حدیث اس کے خلاف صحیح سند سے ثابت نہیں ہے ابن حزم فرماتے ہیں کہ جمعہ فرض ہے اور عید کی نماز نفل ہے اور نفل فرض کو ساقط نہیں کرتا۔ لیجئے ابن حزم نے تو اعلان کر دیا کہ غیر مقلدین زمانہ جس اثر یا حدیث سے استدلال کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے اب اس کے باوجود بھی یہی کہیں کہ نہیں جناب حق ہم ہی لوگوں کے ساتھ ہے اور حدیث پر ہمارا ہی عمل ہے اور مسئلہ یہی ہے کہ عید کے روز جمعہ کی فرصت ہے اور عید کے روز جمعہ کی نماز پڑھنا یہ خلاف سنت ہے تو ان کی زبان وقلم کو کون پکڑ سکتا ہے ان سے تو اللہ ہی سمجھے گا۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ کتاب وسنت اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اور اسلاف امت سے یہی ثابت ہے کہ اگر عید کے روز جمعہ پڑ جائے تو شہر والوں کو جمعہ پڑھنا واجب اور ضروری ہے جمعہ ان سے ساقط نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

از نورالدین نوراللہ الاعظمی

حضرت مولانا غازی پوری مدظلہ نے اس مسئلہ پر بڑی محققانہ نگاہ ڈالی ہے اور بحث کا کوئی گوشہ چھوڑا نہیں ہے مولانا غازی پوری نے دلائل کی روشنی میں واضح کر دیا ہے کہ آنحضور اکرم ﷺ کی اصل سنت یہی تھی کہ عید اور جمعہ ایک دن پڑنے کی شکل میں جمعہ کی نماز پڑھنا بھی واجب اور ضروری ہے آنحضور ﷺ کا جو معمول تھا اس پر روشنی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی پڑتی ہے جس کو ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ عیدین اور جمعہ میں پہلی رکعت میں سبح اسم ربک اور دوسری رکعت میں ھل اتک حدیث الغاشیہ پڑھا کرتے تھے اور کبھی عید اور جمعہ ایک ہی دن جمع ہو جاتے تو بھی آپ ﷺ عید اور جمعہ میں ان ہی دونوں سورتوں کو پڑھا کرتے تھے، اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ عید کے روز جمعہ ترک نہیں کیا کرتے تھے۔

انورلدین نوراللہ الاعظمی

آمین کا مسئلہ
کتاب وسنت اور عقل کی روشنی میں

غیر مقلدین اور منکرین سنت کے مابین بہت سی وجوہ اشتراک ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ منکرین سنت کہتے ہیں کہ ہم سنت کو نہیں مانتے، ہمارے لئے قرآن کافی ہے، اور غیر مقلدین کہتے ہیں کہ جو چیز سنت میں آگئی ہے تو اب قرآن کی کیا ضرورت ہے، البتہ دونوں فریقوں میں فرق یہ ہے کہ منکرین سنت تو سنت کا انکار بانگ دہل کرتے ہیں، لیکن غیر مقلدین قرآن کا انکار عملاً کرتے ہیں، زبان سے نہیں منکرین سنت کے نزدیک قرآن اصل ہے اور غیر مقلدین کے نزدیک قرآن کے مقابلہ میں سنت کو ترجیح دی جاتی ہے۔

منکرین سنت کا سنت کا منکر ہونا تو ایک طے شدہ بات ہے، البتہ غیر مقلدین چونکہ نفاق سے کام لیتے ہیں اس وجہ سے ان کا مذہب وعقیدہ سمجھنے کے لئے ان کے عمل کا جائزہ لینا پڑے گا۔

غیر مقلدین کے قرآن سے عملاً انحراف کی چند مثالیں عرض کروں گا۔

(۱) قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں خدا کا یہ حکم ناطق ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو خاموش رہو۔ ارشاد باری ہے۔

واذاقرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون

یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر خدا کی رحمت ہو۔

امام احمد بن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے سلسلہ (۱)

کی ہے، جس کا صاف مطلب ہے کہ مقتدی کو نماز میں خاموش رہ کر امام کی

قرأت کو سننا چاہئے، مگر غیر مقلدین کا عمل یہ ہے کہ وہ اس آیت کو مانتے نہیں اور امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

(۲) قرآن کا واضح ارشاد ہے۔

الطلاق مرتان فامساک بمعروف اوتسریح باحسان

طلاق (جس کے بعد رجعت ہو) دو مرتبہ ہے پھر چاہے تو بیوی کو روک لے اور چاہے اچھے طریقہ پر چھوڑ دے۔

پھر فرمایا گیا۔

فان طلقها فلاتحل له من بعد حتی تنکح زوجاً غیره .

یعنی اگر (دو طلاق کے بعد) بیوی کو تیسری طلاق دے تو بیوی بلا دوسرے شوہر سے نکاح کئے ہوئے پہلے شوہر کیلئے حلال نہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص دو طلاق کے بعد تیسری طلاق دے گا خواہ

جمو عاً خواہ مفرقاً اس کی طلاق پڑ جائے گی اور عورت اس کے لئے حرام ہو جائے گی، اور قرآن کے اس حکم کو سوائے چند لوگوں کے تمام امت نے تسلیم کیا مگر غیر مقلدین ان کے

(۱)ابن تیمیہ فتاویٰ میں فرماتے ہیں۔وذکر احمد بن حنبل الاجماع علی انها نزلت فی ذلک (فتاویٰ ص ۲۶۹ ج ۲۳) یعنی امام احمد فرماتے ہیں کہ اس پر اجماع ہے کہ یہ آیات قرأت خلف الامام کے بارے میں ہے نیز ابن تیمیہ فرماتے ہیں وقد استفاض عن السلف انها نزلت فی القرأة فی الصلوٰة (ایضاً) یعنی سلف سے یہ بات بطور شہرت کے منقول ہے کہ یہ آیات نماز میں قرآن پڑھنے کے بارے میں اتری ہے۔

ساتھ ہوگئے جو قرآن کے اس حکم کے منکر ہیں یا اس کی بعید از فہم تاویل کرتے ہیں

(۳) قرآن کا واضح حکم ہے:

واتبع سبیل من اناب الی

اس آیت سے صراحۃً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کے فرماں برداروں کی اتباع کی جائیگی (۱)

اوران کا راستہ اختیار کیا جائے گا، خواہ وہ اللہ والا ایک ہو یا چند ہوں، اس آیت سے تقلید ائمہ کی شرعی حیثیت اور اس کا جواز معلوم ہوتا ہے ، اس لئے کہ منیبین کی جو فہرست تیار ہوگی اس میں ائمہ اربعہ کا مقام اعلیٰ ترین ہوگا۔مگر غیر مقلدین نے ائمہ اربعہ کی تقلید واتباع کا صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ اس کو شرک تک کہا، اور اس طرح عملاً وعقیدۃً انہوں نے قرآن کے اس حکم کو ٹھکر دیا۔

قرآن کا رشاد ہے۔

الفتنة اشد من القتل

جس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ فتنہ کو ختم کرنے کیلئے ہر ممکن تدبیر کا اختیار کرنا واجب ہے، اور فتنوں میں سے بہت بڑا فتنہ یہ بھی ہے کہ انسان دین سے گمراہ ہوجائے، خواہشات کا بندہ بن کر اپنی من چاہی زندگی گزارے ، خدا کے جس حکم کو جب چاہے ٹھکرا دے اور جس

(۱) اتباع اور تقلید دونوں کا مفہوم ایک ہے یعنی کسی کے علم وفضل پر اعتماد کرکے اسی کی بات کو اختیار کرلیا جائے جس طرح کسی کی اتباع کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس سے ہر ہر بات کے لئے دلیل طلب کی جائے اسی طرح تقلید کا بھی یہی مفہوم ہے کہ بلا طلب دلیل جس کے علم وفضل وورع وتقویٰ اعتماد ہو اس کی بات قبول کرلی جائے۔

کو جب چاہے لے لے، کتاب وسنت کو اپنی خواہش کا پابند بنالے اور ان کی تشریحات اپنے علم وعقل کے بل بوتے پر کرنے لگے، یہ بہت بڑا دینی فتنہ ہے جو پہلے بھی تھا اور اب

بھی ہے اور ہر زمانہ میں رہے گا۔

اور اسی فتنہ کے سد باب کے لئے امت کے ارباب حل وعقد نے جب یہ فتنہ بہت سر اٹھانے لگا تھا تو تقلید ائمہ کو واجب قرار دیا ، بلکہ مزید اس فتنہ کی جڑ اکھاڑ دینے کے لئے۔

ایک ہی امام کی تقلید کو واجب قرار دیا اور ساری امت نے اس فیصلہ کو قبول کرلیا مگر غیر مقلدوں نے کہا کہ ہمیں امت کے سواد اعظم کا یہ فیصلہ

خواہ قرآن کی روشنی ہی میں کیوں نہ ہو تسلیم نہیں۔

کچھ اسی قسم کا رویہ غیر مقلدین نے ''آمین'' والے مسئلہ کے بارے میں اختیار کیا ہے،۔''آمین'' دعا ہے امام بخاریؒ نے حضرت عطاء سے نقل کیا ہے کہ آمین دعا ہے (قال عطاء آمین دعاء بخاری) آمین کے معنی ہے یا اللہ ہماری دعا قبول فرما لیجئے ،قرآن میں بھی آمین کو دعا کہا گیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کر رہے تھے، آپ کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام ان کے ساتھ آمین کہہ رہے تھے، ان کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا۔قال قد اجیبت دعوتکما

یعنی اللہ نے کہا کہ تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی

قرآن نے حضرت ہارون کے آمین کہنے کو دعا ہی سے تعبیر کیا، اور امت کا سواد اعظم آمین کو دعا ہی کہتا ہے اور دعا کے سلسلے میں جو قرآن کی تعلیم اور ہدایت ہے وہ یہ ہے۔ادعوا ربکم تضرعاً وخفیۃ

یعنی تم اپنے پروردگار کو عاجزی اور چپکے سے پکارو

اس کا کھلا مطلب ہے کہ دعاؤں میں اصل یہی ہے کہ وہ بلند آواز سے نہ ہو آہستہ سے ہو (کسی وقتی ضرورت یا مصلحت کے تحت بلند آواز سے دعا کرنے کی بات الگ ہے) اور چونکہ آمین دعا ہی ہے اس وجہ سے اس میں بھی قرآن کے اس ناطق اور منصوص حکم کی روشنی میں اصل یہی ہوگی کہ آمین کو آہستہ کہا جائے (۱)

لیکن غیر مقلدوں نے قرآن کے اس حکم پر دھیان نہیں دیا نہ اسے قابل عمل جانا اور قرآنی احکام سے انحراف کی جو ان کی قدیم روش ہے اس پر یہاں بھی قائم ہے اور کہا تو یہی کہا کہ ہم تو آمین زور ہی سے کہیں گے، اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ آمین زور سے کہو سنت یہی طریقہ ہے۔

اور جب ان سے کہا گیا کہ صرف ایک حدیث صحیح پیش کر دو جس میں آنحضورﷺ کا یہ ارشاد موجود ہو کہ امام ومقتدی آمین جہراً وبا آواز بلند کہیں تو یہ لگے دائیں بائیں جھانکنے اور آنحضورﷺ کا یہ حکم کسی صحیح سے تو کیا ضعیف حدیث سے بھی نہیں دکھا سکے، اس تہی دامنی کے باوجود حوصلہ و ہمت یہی ہے کہ وہ قرآن کی بات نہیں مانیں گے جس میں خدا کا یہ حکم موجود ہے کہ اللہ سے دعا تضرع واخفا سے کرو۔

اور لطف تو یہ ہے کہ جن احادیث سے آمین بالجہر پر وہ استدلال کرتے ہیں اس میں بھی نہ عقل کو کام میں لائے اور نہ صحیح نقل ہی پیش کر سکے بلکہ ہوا یہ کہ اپنے اصول موضوعہ ومقررہ کی بھی انہوں نے نفی کر دی آیئے ذرا ان کے دلائل کا جائزہ لیں۔

(۱) البتہ تعلیم کو تعلم کی غرض سے یا اس وجہ سے کہ لوگ آمین کہنے کو بدعت قرار دے یا زور سے کہنے کو جائز ہی نہ سمجھے تو زور سے آمین کہنا اس اصل کے خلاف نہیں قرار پائے گا۔

غیر مقلدین آمین بالجہر پر حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک اس روایت سے استدلال کرتے ہیں۔

عن ابی ھریرۃؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذافرغ من قرأۃ ام القرآن رفع صوتہ وقال آمین

یعنی حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سورۃ فاتحہ سے فارغ ہوتے تو اپنی آواز بلند کرتے اور آمین کہتے۔

اس روایت کی سند میں ایک راوی یحیٰی بن عثمان ہے، اور جس سے وہ اس کو روایت کرتا ہے اس کا نام اسحاق زبیدی ہے، اور استاذ وشاگرد دونوں ہی ضعیف ومتکلم فیہ ومجروح ہیں، یحیٰی بن عثمان کے بارے میں ذہبی فرماتے ہیں کہ اس کی روایتیں منکر بھی ہوتی ہیں اور اس کے استاذ کے بارے میں ابوداؤد فرماتے ہیں کہ یہ کوئی چیز نہیں ہے، نسائی فرماتے ہیں وہ ثقہ نہیں ہیں، محمد بن عوف کہتے ہیں کہ وہ جھوٹا ہے۔نسائی فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے نہ اس روایت کو بخاری نے روایت کیا ہے اور نہ ہی مسلم نے نہ ابوداؤد، نہ ترمذی ،نسائی اور ابن ماجہ نے، غرض صحاح ستہ میں اس روایت کا وجود ہی نہیں، اور روایت ضعیف ہے، مگر اس ضعیف روایت کو جس کو اصحاب صحاح ستہ نے رد کردیا ہے، غیر مقلدین چند محدثین کے اقوال کی بنیاد پر صحیح قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کو قرآن کے حکم منصوص کے رد کرنے کی بنیاد بناتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی ایک دوسری حدیث ہے جس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اس سے بھی غیر مقلدین استدلال کرتے ہیں ، وہ روایت یہ ہے

عن ابی ھریرۃؓ قال :ترک الناس التامین وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذاقال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین قال آمین حتی یسمع اھل الصف الاول فیرتج بہ المسجد.

یعنی حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے آمین کو ترک کردیا ہے حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ جب غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہتے تو آمین کہتے جس کو صف اول کے لوگ سن لیتے اور مسجد گونج جاتی۔ اولاً تو یہ حدیث بھی ضعیف ہے، اس لئے کہ اس کی سند میں ایک راوی بشر بن رافع ہے جس کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں، اس کی حدیث کی متابعت نہیں کی جاتی ، اور امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے، اور امام الجرح والتعدیل ابن معین فرماتے ہیں کہ وہ منکر حدیثیں روایت کرتا تھا، اور نسائی فرماتے ہیں کہ قوی نہیں ہے، حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں وہ ضعیف ہے اور محدثین کے نزدیک وہ منکر الحدیث ہے۔ابن حبان فرماتے ہیں کہ وہ موضوع حدیثیں روایت کرتا تھا، حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اس کی حدیث قبول نہیں کی جائیگی ،غرض یہ حدیث سند کے لحاظ سے بالکل ضعیف ہے۔

اس حدیث کا حال تو یہ ہے مگر غیر مقلدین اس سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ پھر اس حدیث میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمین صرف صف اول کے لوگ سنتے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ مسجد بھی گونج جاتی تھی ، کیا غیر مقلدین غور فرمائیں گے، کہ یہ دونوں باتیں صحیح ہوسکتی ہیں؟(۱)

(۱) اگر غیر مقلدین یہ کہیں کہ حضور ﷺ کی آمین سن کر لوگ آمین کہتے تھے اس وجہ سے مسجد گونج جاتی تھی تو عرض یہ ہے کہ حدیث میں اس کا کہیں دور دور تک نشان نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابو ہریرہؓ اس کا ذکر ضرور کرتے۔

پھر ذرا اس پر بھی آپ دھیان دیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانہ میں مسجد نبوی کچی تھی، دیواریں بھی کچی تھیں اور چھت بھی، چھت کھجور کی شاخیں ڈال کر بنائی گئی تھی۔ کیا اس شکل میں گونج والی کیفیت مسجد نبوی میں پیدا ہو سکتی تھی، کاش غیر مقلدین عقل سے بھی کام لیتے

اور پھر غیر مقلدین نے اس پر بھی قطعاً توجہ نہیں دی کہ یہ حدیث تو صراحۃً اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرمؓ کے زمانے میں اجماعاً آمین بالجہر نہیں کہی جاتی تھی، خود حضرت ابو ہریرہؓ اس حدیث میں فرماتے ہیں کہ ترک الناس التامین یعنی لوگوں نے آمین کہنا چھوڑ دیا ہے، اگر جہراً آمین کہنا ہی مسنون ہوتا تو لوگ وہ بھی صحابہ کرامؓ نماز کی اس سنت کو بالاتفاق بقول حضرت ابو ہریرہؓ چھوڑ کیوں دیتے۔ کیا کسی مسلمان کی عقل یہ باور کر سکتی ہے کہ آنحضور ﷺ کی ثابت شدہ سنت کو صحابہ کرامؓ اجماعی طور پر ترک کر دیں۔

غرض یہ حدیث جو غیر مقلدین کا اہم مستدل ہے نہ عقلاً لائق قبول ہے اور نہ نقلاً مسند اسحاق بن رھویہ کی اس روایت سے بھی غیر مقلدین آمین بالجہر پر استدلال کرتے ہیں حضرت ام حصین کی روایت ہے۔

انها صلت خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم فلما قال ولا الضالين قال آمين فسمعته وهى فى صف النساء

یعنی ام حصین نے رسول اکرم ﷺ کے پیچھے نماز ادا کی تو جب آپ نے ولا الضالین کہا تو انہوں نے باوجودیکہ وہ عورتوں کی صف میں تھیں سنا کہ آپ ﷺ نے آمین کہا۔

مگر یہ روایت بھی ضعیف ہے، اس کی سند میں ایک راوی اسماعیل بن مسلم مکی ہے، عام طور محدثین اس کی روایت کو قبول نہیں کرتے ہیں امام احمد وغیرہ فرماتے ہیں کہ وہ منکر الحدیث ہے، امام نسائی کہتے ہیں کہ وہ متروک ہے، ابن مدینی استاد امام بخاری فرماتے ہیں کہ وہ ایک حدیث کو تین تین طرح سے بیان کرتا تھا یحیٰی ابن معین فرماتے تھے کہ وہ کوئی چیز نہیں ہے، علی ابن مدینی کا اس کے بارے میں یہ قول بھی ہے۔ کہ اس کی حدیث لکھی نہیں جائیگی، سعدی فرماتے ہیں کہ وہ بہت کمزور ہے۔

جی ہاں جو روایت بہت کمزور متروک اور منکر الحدیث راوی کی سند سے ہے وہ بھی آمین بالجہر کے سلسلہ میں غیر مقلدین کا اہم مستدل ہے، اور تعجب تو یہ ہے کہ غیر مقلدین شاخ نازک پر آشیانہ قائم کرنے کے باوجود میدان میں اس دم خم سے کودیں گے کہ دنیا ان کی لن ترانیوں سے مرعوب ہو جائے۔

غیر مقلدین کا اس مسئلہ میں جو سب سے اہم مستدل ہے وہ ترمذی کی روایت ہے جو بطریق سفیان ثوری ہے۔

عن وائل بن حجر قال سمعت النبى ﷺ قرأ غير المغضوب عليهم ولا الضالين وقال آمين ومد بها صوته

یعنی حضرت وائل بن حجرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا کہ نبی کریم ﷺ نے غیر المغضوب علیھم ولا الضالین پڑھا تو آمین کہا اور اپنی آواز کو کھینچا۔

غیر مقلدین اس روایت کو آمین بالجہر کے سلسلہ میں صریح قرار دیتے ہیں، مگر کوئی غیر مقلد آپ کو یہ نہیں بتلائے گا کہ امام ترمذی نے انہیں وائل بن حجرؓ سے بطریق امام شعبہ ایک اور حدیث روایت کی ہے جس میں صراحتہً یہ لفظ موجود ہے وخفض بھا صوتہ یعنی آپ نے بلند آواز سے آمین نہیں کہا، حضرت وائل بن حجر کی دوسری روایت یہ ہے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرأ غیر المغضوب علیھم والاالضالین فقال آمین وخفض بھا صوتہ

یعنی نبی اکرم ﷺ نے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھا اور آمین کہا تو جہراً اور بلند آواز سے آمین نہیں کہا۔

حضرت وائل کی یہ دو روایتیں ہیں، امام ترمذی نے ان دونوں کو روایت کیا ہے۔ پہلی روایت حضرت امام سفیان ثوری کی ہے اور دوسری روایت امام شعبہ کی سند سے ہے اور یہ دونوں محدث ایک ٹکر کے اور ہم پلہ ہیں، امام سفیان ثوری کو بھی امیر المؤمنین فی الحدیث کہا گیا ہے اور امام شعبہ بھی امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں امام سفیان ثوری کو سند کے حفظ کا بہت زیادہ اہتمام تھا اور امام شعبہ کی توجہ حدیث کے متن کو محفوظ رکھنے کی طرف زیادہ تھی، اور ظاہر بات ہے کہ یہ بات زیادہ اہم ہے کہ حدیث کا متن محفوظ رکھا جائے اس سے کہ حدیث کی سند کے حفظ کا اہتمام کیا جائے یہ اور بات ہے کہ ان دونوں ہی چیزوں پر حدیث کی حفاظت کا مدار ہے۔

اب ان دونوں حدیثوں کے بارے میں ایک طریقہ تو احناف کا ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہ دونوں حدیثیں اگرچہ مختلف المعنی ہیں مگر دونوں صحیح ہیں اسلئے کہ خواہ امام سفیان ثوری ہوں خواہ امام شعبہ دونوں کی جلالت قدر اس کا تقاضا کرتی ہے کہ نہ سفیان ثوری کی روایت رد کریں اور نہ امام شعبہ کی، اور اسی بناپر احناف نے ان دونوں روایت کو قبول کرلیا اور کہا کہ اگرچہ آنحضور اکرم ﷺ کی مستمر عادت یہی تھی کہ آپ آمین آہستہ آواز سے کہتے تھے مگر کبھی کبھی آپ ﷺ لوگوں کی تعلیم کی غرض سے بلند آواز سے بھی کہتے تھے، چنانچہ وائل بن حجر جو ملک یمن کے رہنے والے تھے اور آنحضور ﷺ کی خدمت میں ان کی حاضری کبھی کبھار ہوا کرتی تھی، انہوں نے کبھی آپ کو بلند آواز سے آمین کہتے سنا اور کبھی انہوں نے دیکھا کہ آپ نے بلند آواز سے آمین نہیں کہی، یہ تو اس شکل میں ہے جب کہ مد بہا صوتہ کا ترجمہ آواز بلند کرنا کیا جائے لیکن اس کا ترجمہ آمین کو قصر کے ساتھ ادا نہیں کی بلکہ مد کے ساتھ ادا کیا ہو تو پھر دونوں حدیث میں کسی طرح کا تعارض باقی نہیں رہے گا، اور مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے آمین کو آہستہ کہا اور بالمد اس کی ادائیگی فرمائی۔

احناف کے اس طریق پر نہ سفیان ثوری والی حدیث کا ترک لازم آتا ہے اور نہ امام شعبہ کی حدیث کو متروک کہنا پڑتا ہے، اور دونوں حدیثیں قابل عمل رہتی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کسی حدیث کو ترک کرنے سے احتراز کرتے تھے اور دو مختلف المعنی احادیث کے درمیان تطبیق دینے کو آپ زیادہ پسند فرماتے تھے، یہ حدیث کے بارے میں انتہائی درجہ تورع ہتقویٰ اور احتیاط کی بات ہے۔

مگر غیر مقلدین نے اس معقول طریقہ کو چھوڑ کر اپنی ساری توانائی اس پر صرف کر دی کہ شعبہ والی حدیث کو غلط قرار دیں اور اس غیر معقول رویہ کو اختیار کرنے پر بھی وہ احناف کو تارک حدیث کہہ کر مطعون کریں گے اور اپنے کو اہل حدیث کہیں گے۔

اب رہی یہ بات کہ آپ کا کبھی کبھی جہراً آمین کہنا بغرض تعلیم تھا، اس کی دلیل کیا ہے تو وائل بن حجر ہی سے روایت ہے فرماتے ہیں

-

رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم حین فرغ من الصلوٰة حتی رأیت خده من هذا الجانب ومن هذا الجانب وقرأ غیر المغضوب علیهم ولاالضالین فقال آمین .یمد بها صوته ماأراه الالیعلمنا .اخرجه الحافظ ابوبشر الدولابی (فی کتا ب الاسماء والکنی اعلاء السنن)

میں نے رسول اکرم ﷺ کو نماز سے فارغ ہونے کے بعد دیکھا، میں نے آپ ﷺ کے رخسار کو دونوں جانب سے دیکھا، اور آپ نے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھا تو اپنی آواز کو آمین کہہ کر کھینچا، اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا آمین کا مد کرنا ہماری تعلیم کے لئے تھا اگر چہ سنداً یہ روایت کمزور ہے مگر اس سے یہ شہادت حاصل کی جاسکتی ہے کہ آپ ﷺ کا آمین کو کھینچ کر کہنا بغرض تعلیم تھا، اس لئے کہ ہر ضعیف حدیث قابل رد نہیں ہوتی، خود غیر مقلدین نے بہت سے مسائل میں اور خود اس مسئلہ میں ضعیف حدیثوں سے استدلال کیا ہے(۱)

اور یہ بات میں ہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ غیر مقلدین کے مستند و معتبر ممدوح حافظ ابن قیم بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ آنحضور ﷺ کا جہراً آمین کہنا بغرض تعلیم تھا، چنانچہ ابن قیم زاد المعاد میں قنوت النوازل کی بحث میں فرماتے ہیں۔

فاذاجهربه الامام لیعلم به المامومین فلاباس بذلک فقد جهر عمر بالافتتاح لیعلم المامومین وجهر ابن عباس بقرأة الفاتحة فی صلاة الجنازة لیعلمهم انها سنة ومن هذا ایضاً جهر الامام بالتامین

یعنی اگر قنوت کو امام مقتدیوں کی تعلیم کے لئے جہراً پڑھے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ مقتدیوں کی تعلیم کے لئے حضرت عمرؓ نے ثنا کو جہراً پڑھا، اور حضرت ابن عباس نے نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ جہراً پڑھا تھا تا کہ لوگوں کو بتلائیں کہ یہ سنت ہے، اور اسی طرح امام کا آمین کو بھی جہراً! کہنے کا مسئلہ ہے (کہ یہ بھی بغرض تعلیم اور یہ بتلانے کیلئے ہے کہ آمین بھی سنت ہے)

(۱) اس کے لئے آپ میری کتاب غیر مقلدین کے لئے لمحہ فکریہ دیکھئے۔

غرض اگر سفیان والی حدیث کو تعلیم پر محمول کر لیا جائے تو دونوں حدیثوں میں سے کسی ایک کا ترک کرنا لازم نہیں آتا ہے، اور اللہ کے رسول ﷺ کی کسی حدیث کو ترک کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اس کو معمول بہ بنایا جائے۔ پس اب مسئلہ یہ ہوگا کہ آمین میں اخفا تو آنحضور اکرم ﷺ کی عادت مستمرہ تھی کہ آمین دعا ہے اور دعا میں قرآن کے حکم کے مطابق اخفاء ہی اصل ہے مگر تعلیماً و بیاناً للسنۃ آپ ﷺ نے کبھی کبھی آمین کو زور سے بھی کہا ہے۔

مگر غیر مقلدین نے اس معقول راستہ کو چھوڑ کر امام شعبہ والی روایت کو غلط قرار دینے پر اپنے اصرار کو باقی رکھا، اور مد صرف والی روایت ہی کو قبول کیا، اور امام شعبہ پر مختلف وجوہ سے کلام کر کے ان کی حیثیت گھٹانے کا نیک کام انجام دیا۔

غیر مقلدین جب شعبہ پر سفیان والی حدیث کو مقدم قرار دیتے ہیں اور اس کی وجوہ ترجیح ذکر کرتے ہیں تو دیانت وانصاف کا خون کرتے ہوئے وہ اصل بات چھپا جاتے ہیں اور وہ بات جو غیر مقلدین کی ساری دھماچوکڑی ختم کے لئے تنہا کافی ہے یہ ہے کہ وہ یہ نہیں بتلاتے کہ حضرت سفیان ثوری جنہوں نے آمین بالجہر والی حدیث روایت کی ہے خود ان کا مذہب کیا تھا؟ کیا سفیان ثوری جہراً آمین کہتے تھے یا ان کا مذہب آمین کے اخفاء کا تھا۔

تمام اہل علم اس بات سے واقف ہیں کہ حضرت سفیان ثوری اگرچہ مد والی حدیث کے راوی ہیں لیکن خود ان کا عمل اس روایت پر نہیں تھا، ان کا مذہب یہ تھا کہ آمین سراً کہی جائے گی نہ کہ جہراً اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی یہی عادت مستمرہ تھی اور حضرت سفیان کے زمانہ میں عام طور پر لوگوں کا معمول یہی تھا اور جہراً آمین کہنے کو معمول بنانا ان کی تحقیق میں درست نہیں تھا۔

اب آپ از راہ عقل خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ اگر جہراً آمین کہنا ہی اولیٰ اور افضل اور آنحضور اکرم ﷺ کی عادت مستمرہ ہوتی تو امام سفیان جو خود جہر والی روایت کے راوی ہیں اس پر عمل کیوں چھوڑتے؟ کیا حضرت سفیان کے بارے میں جو امیر المؤمنین فی الحدیث تھے اور زبردست فقیہ بھی تھے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ جو چیز ان کے نزدیک ثابت ہو اس کو چھوڑ کر غیر افضل اور غیر اولیٰ کو اختیار کریں گے؟ اگر آدمی عقل سے کام لے اور صرف سندوں کے ادھیڑ بن میں نہ رہے تو تنہا یہی ایک بات کافی ہے کہ آمین میں اصل سنت اخفاء ہے اور اس طرح شعبہ والی روایت کو امام سفیان والی روایت پر اگر سنداً تقدم بھی حاصل نہ ہو تو بھی معنی اسے تقدم حاصل ہوگا۔

اور پھر ذرا آپ اس پر بھی غور کریں کہ اگر آمین میں جہر ہی اصل ہوتا تو جو نماز دن میں پانچ مرتبہ پڑھی جاتی ہے اور ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ بھی پڑھی جاتی ہے جس کے بعد آمین کہا جاتا ہے اس جہری آمین کے راوی صرف ایک صاحب ہیں جو یمن کے باشندہ تھے کسی اور صحابی سے جہر کی کوئی صحیح حدیث کیوں نہیں منقول ہے، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں آمین کے جہراً کہنے کا باب ضرور باندھا ہے مگر وہ کسی ایسی حدیث کو نہیں پیش کر سکے جس سے کہ آمین کا جہراً کہنا صراحۃً ثابت ہو، وہ اپنی صحیح میں جو حدیث لائے ہیں وہ یہ ہے کہ اذا امن الامام فامنوا یعنی جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، ظاہر ہے کہ اس کو بذریعہ تاویل ہی جہر پر فٹ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس حدیث میں نہ جہر کا لفظ ہے نہ رفع کا لفظ ہے نہ مد کا لفظ ہے جن سے آمین کا جہراً کہنا ثابت ہوتا ہے۔

بہر حال یہ بات بہت قابل توجہ ہے کہ سوائے وائل بن حجر کے کسی اور صحابی سے جہراً آمین کی کوئی صحیح وصریح روایت ثابت نہیں ہے، اگر آمین کا جہراً کہنا اللہ کے رسول ﷺ کا معمول ہوتا اور یہی اصل سنت ہوتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ متعدد صحابہ سے اسے نقل نہ کیا جاتا، اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے کے بعد سب سے زیادہ خیر وبرکت کا زمانہ خلفائے راشدین کا زمانہ تھا مگر نہ خلفائے راشدین سے اور نہ ان کے زمانہ کے کسی اور صحابی سے جہراً آمین کہنا ثابت ہے۔

مگر اس پر بھی غیر مقلدین کا اصرار یہی ہے کہ آمین میں اصل جہر ہی ہے۔ غیر مقلدین حضرات کا ایک مستدل آمین کے جہراً کہنے

کے سلسلہ میں یہ بھی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر اپنے زمانہ میں نماز میں جہراً آمین کہتے تھے اور جو لوگ ان کے پیچھے ہوتے وہ بھی زور سے آمین کہتے تھے۔

ہمیں غیر مقلدین کے بے اصولے پن پر حد درجہ تعجب ہوتا ہے، کبھی تو وہ اپنا اصول یہ بنائیں گے کہ ''در فعل صحابی حجت نیست'' کہ صحابہ کرامؓ کے فعل سے حجت نہیں پکڑی جاسکتی۔ اور اسی بنا پر وہ کبار صحابہؓ بلکہ خلفائے راشدین تک کے عمل کو بلکہ صحابہ کرامؓ کے اجماع تک کو رد کردیتے ہیں، اور جب کبھی گاڑی پھنستی ہے تو وہ صحابہ کے فعل سے حجت پکڑتے ہیں، آخر ان کی یہ دورنگی پالیسی کیوں، کیا ان کا یہ اضطراب ان کے دلائل کی حقانیت سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہے؟

پھر ان کو خلفائے راشدین کے زمانہ کا کوئی عمل ہاتھ نہیں آیا تو حضرت عبداللہ بن زبیر کے زمانہ میں پہنچ گئے، سوال یہ ہے کہ خلفائے راشدین میں سے کسی کے عمل کے مقابلہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر کا عمل کیسے ترجیح پا سکتا ہے۔ (ناظرین ابھی معلوم کرلیں گے کہ کبار صحابہ وخلیفہ راشد حضرت عمرؓ کا معمول آمین کے سلسلہ میں کیا تھا) اور پھر ہم احناف تو کہتے ہی آرہے ہیں کہ زور سے آمین کہنا نہ حرام ہے نہ بدعت بلکہ مصلحت کا تقاضا ہو تو کبھی ضروری ہوجاتا ہے مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ آمین زور ہی سے کہنا اولیٰ اور افضل اور آنحضورﷺ اور صحابہ کرامؓ کی سنت مستمرہ تھی۔

غیر مقلدین حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا یہ عمل بطور دلیل پیش کرتے ہوئے غالباً یہ بھول جاتے ہیں یا تجاہل برتتے ہیں کہ ان کا آمین کو جہراً کہنا اس وجہ سے تھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے آمین کہنا ہی ترک کردیا تھا، اور اس کو بدعت سمجھنے لگے تھے اس لئے حضرت عبداللہ بن زبیر نے اس کو زور سے کہنا شروع کردیا تھا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ آمین کہنا بدعت نہیں بلکہ سنت ہے غیر مقلدین حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے زور سے آمین کہنے کی جو اصل وجہ تھی اس کو ظاہر نہیں کرتے، کیا یہی اہلحدیث لوگوں کا طریقہ ہوتا ہے؟ (۱)

غیر مقلدین حضرات کا ایک مستدل حضرت عطا کا یہ قول بھی ہے، فرماتے ہیں کہ

ادرکت مأتین من اصحاب رسول الله ﷺ فی هذا المسجد اذاقال الامام ولاالضالین سمعت لهم رجة بأمین (بیهقی)

عطا کا یہ قول بھی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے اس مسجد میں دوسو صحابہ کرام کو پایا جب امام ولا الضالین کہتا تو میں ان کی آمین کی گونج سنتا۔

مگر یہ حضرت عطاء کی مرسل روایت ہے اور مرسل روایت کا اعتبار غیر مقلدین نہیں کرتے، پھر یہ کہ محدثین کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ حضرت عطاء کی مرسل روایتیں مرسل

(۱) یہ تمام گفتگو تو اس روایت کو صحیح مان کر ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ روایت جس سند سے مروی ہے وہ انتہائی کمزور ہے امام بخاری نے اس کو بلا سند نقل کیا ہے بلا سند قول کسی کا بھی معتبر نہیں بیہقی نے سنن کبریٰ میں اس کی سند ذکر کی ہے جو انتہائی درجہ کمزور ہے تعجب ہے کہ ایسی واہی تباہی سند والی روایت سے اہل حدیث نام کے لوگ استدلال کرتے ہیں دوسروں سے صحیح سند کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

روایتوں میں سب سے زیادہ کمزور شمار کی گئی ہیں، حافظ سیوطی نے تدریب میں اس کی تصریح کی ہے، اور دوسری سب سے بڑی علت جو اس روایت کو نا قابل اعتبار بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حضرت عطاء کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے یہ فرمایا کہ میں نے دوسو اصحاب رسول کو اس مسجد میں پایا حالانکہ یہ بات قطعاً غلط اور خلاف واقعہ ہے حضرت حسن بصری عطا سے عمر میں بڑے تھے ان کی ملاقات صرف ایک سو بیس صحابہ سے ثابت ہے تو حضرت عطا کی ملاقات دوسو صحابہ سے کیسے ثابت ہو جائے گی۔

آمین بالجہر کے سلسلہ میں غیر مقلدین کے دلائل کا ہم نے یہ مختصر جائزہ لیا ہے، اور آپ نے دیکھا کہ کتاب وسنت اور علم وعقل درایت وفقہ کی کسوٹی پر غیر مقلدین کا مذہب بہت کمزور ثابت ہو رہا ہے اور جہراً آمین کو عادت مستمرہ بنالینے پر جن دلائل سے وہ استدلال کرتے ہیں وہ تحقیق کی نگاہ میں بہت کمزور اور نا قابل التفات ہیں۔

اس بحث کو مکمل کرنے کے لئے اب ہم ایک نگاہ احناف کے دلائل پر بھی ڈالیں گے جیسا کہ معلوم ہے کہ احناف کا آمین کے سلسلہ میں معمول بہ مذہب یہ ہے کہ اگر چہ آمین جہراً کہنا بھی ضرورۃً ومصلحۃً جائز ہے مگر افضل یہ ہے کہ سراً آمین کہی جائے اور اسی کو عادت مستمرہ بنایا جائے، اور احناف کے دلائل اس سلسلہ میں درج ذیل ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ آمین دعا ہے، اور قرآن کا ارشاد جیسا کہ گزرا دعا کے بارے میں یہ ہے کہ وہ آہستہ کہی جائے۔

(۲) حدیث میں بھی دعا کا ادب یہی بتلایا گیا ہے کہ وہ چپکے چپکے ہو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے۔

قال رفع الناس اصواتهم بالدعاء فقال رسول الله ﷺ ایھاا لناس اربعوا علیٰ انفسکم فانکم لاتدعون اصم ولاغائباً ان الذی تدعونه سمیع قریب (تفسیر ابن کثیر ص ۲۲۰ ج ۲)

یعنی لوگوں نے بلند آواز سے دعا مانگی تو آپ ﷺ نے فرمایا اربعوا علی انفسکم یعنی درمیانہ روی اختیار کرو تم کسی بہرے غائب کو نہیں پکار رہے ہو جسکو تم پکار رہے ہو وہ سننے والا اور قریب ہے (تفسیر ابن کثیر ص ۲۲۰ ج ۲)

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ دعا میں اصل یہی ہے کہ آہستہ آواز سے ہو اور بلا ضرورت آواز نہ بلند کی جائے۔

(۳) بخاری کی روایت ہے کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو اس لئے کہ

فانه من وافق تامینه تامین الملا ئکة غفرله ماتقدم من ذنبه.

جس کا آمین کہنا ملائکہ کے آمین کہنے کے موافق ہو جاتا ہے اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

اور ملائکہ کا آمین خاموش طریقہ سے ہوتا ہے نہ کہ جہراً اور بلند آواز سے، اس لئے ملائکہ کے آمین کہنے کے ساتھ موافقت سراً آمین

کہنے میں ہے نہ کہ جہراً کہنے میں۔

(۵) امام مسلم کی ایک روایت ہے جس کے راوی حضرت ابوموسی اشعریؓ ہیں، اس میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے۔

واذاقال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا آمین یحبکم اللہ

یعنی جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو، اللہ تم سے محبت کرے گا

اس سے معلوم ہوا کہ ولا الضالین کے بعد آمین کہنا سراً ہے اگر جہراً ہوتا تو آپ ﷺ یہ نہ فرماتے کہ جب وہ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے اس وقت آمین کہو، بلکہ یہ فرماتے کہ جب تم امام کی آمین سنو تو آمین کہو۔

(۶) امام ترمذی نے حضرت وائل بن حجر کی امام سفیان کے طریق سے حدیث روایت کی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اس میں یہ ہے کہ

اللہ کے رسول ﷺ نے ولا الضالین کے بعد آمین کو آواز کھینچ کر کہا تھا اس سے غیر مقلدین جیسا کہ عرض کیا گیا اپنے مذہب پر استدلال کرتے ہیں اور اس کو آمین بالجہر کی صریح دلیل قرار دیتے ہیں۔

لیکن میں بتلا چکا ہوں کہ خود حضرت سفیان جو اس حدیث کے راوی ہیں ان کا مذہب آمین بالجہر کا نہیں تھا بلکہ وہ سراً آمین کہنے کے قائل تھے، اور حضرت سفیان کا اس حدیث کی روایت کے باوجود اس پر عمل نہ کرنا یہ اس کی بہت بڑی دلیل ہے کہ آمین سراً کہی جائے گی جہراً نہیں۔ یا پھر ان کے نزدیک مد کا معنی جہراً نہیں ہے بلکہ آواز کھینچ کر آمین کہنا ہے۔

رہا غیر مقلدین کا یہ کہنا کہ اعتبار راوی کی روایت کا ہوتا ہے نہ کہ اس کے عمل کا یہ بالکل خلاف عقل بات ہے، اگر راوی کے نزدیک (اور وہ بھی راوی حضرت سفیان جیسا محدث جس کو فقاہت میں درجہ امامت کے ساتھ ساتھ حدیث میں بھی) امامت کا درجہ حاصل تھا روایت میں کوئی علت ایسی نہ ہو جس کی وجہ سے وہ حدیث قابل ترک قرار پائے تو وہ راوی اس حدیث کو قطعاً متروک نہیں قرار دے گا، اگر وہ صحیح اور ثابت شدہ روایت پر بلا کسی معقول وجہ کے عمل چھوڑتا ہے تو اس سے اس کی عدالت ساقط ہو جاتی ہے۔

بہر حال حضرت سفیان کی یہ حدیث جس میں "مد بھا صوتہ" کا لفظ ہے اور اس کے باوجود ان کا عمل اس کے خلاف ہے تو یہ اس کی صریح دلیل ہے کہ آمین میں اصل سر ہی ہے نہ کہ جہر، اس لئے یہ حدیث حنفیہ کے مذہب کیلئے واضح دلیل ہے۔

(۷) ترمذی ہی میں وائل بن حجرؓ کی شعبہ کی طریق سے یہ حدیث بھی صحیح سند سے مذکور ہے۔

ان النبی ﷺ قرأ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقال آمین وخفض بھا صوتہ

یعنی نبی اکرم ﷺ نے غیر المغضوب علیھم ولا الضالین پڑھا اور جب آمین کہا تو آہستہ سے کہا۔

یہ حنفیہ کے مذہب کی صریح دلیل ہے، اور غیر مقلدین کا بعض محدثین کی تقلید میں یہ کہنا کہ اس میں حضرت شعبہ امیر المؤمنین فی الحدیث سے غلطی ہوگئی ہے، حضرت شعبہ کی جلالت قدر، عظمت شان، اور مقام بلند اور علم حدیث میں ان کے رسوخ اور امامت پر زبردست حملہ ہے۔

دوسری بڑی وجہ شعبہ کی حدیث کی ترجیح یہ ہے کہ شعبہ کی روایت قرآن کے حکم ''ادعوا ربکم تضرعاً وخفیۃً'' کے مطابق ہے ،اور جن روایات کی تائید خود قرآن سے ہوتی ہو اس کا راجح ہونا بالکل بدیہی امر ہے ،قارئین خود انصاف فرمائیں کہ شعبہ کی روایت قرآن کے حکم کے عین مطابق ہے ،سفیان ثوری نے اپنی روایت پر خود عمل نہیں کیا تو ایسی شکل میں شعبہ کی روایت کو ترجیح حاصل ہوگی یا سفیان والی روایت پر عمل کرنا راجح ہوگا؟

کاش غیر مقلدین تقلیدی ذہنیت سے ہٹ کر تحقیق سے کام لیتے اور عقل کو کام میں لاتے تو خود ان کا فیصلہ بھی یہی ہوتا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا مستمر عمل اور عمومی عادت شریفہ آمین کو سراً ہی کہنے کی تھی نہ کہ جہراً ،اگر آپ نے آمین کبھی جہراً کہی بھی تو یہ ایک وقتی اور عارضی امر تھا نہ کہ یہ آپ ﷺ کی مستقل عادت شریفہ تھی۔

(۸) ابو وائل کی روایت جس کو طبرانی نے صحیح سند سے نقل کیا ہے اس میں ہے

کان علی وعبداللہ لایجھران ببسم اللہ الرحمن الرحیم ولابالتعوذ لابالتامین .

یعنی حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نہ جہراً بسم اللہ کہتے تھے نہ اعوذ باللہ اور نہ یہ دونوں حضرات آمین کو جہراً کہتے تھے

(۹) ابو وائل ہی کی روایت ہے جس کو طبری نے تہذیب الآثار میں صحیح سند سے نقل کیا ہے۔

لم یکن عمر وعلی یجھران ببسم اللہ الرحمن الرحیم ولابآمین

یعنی حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نہ جہراً بسم اللہ کہتے تھے اور نہ آمین۔

(۱۰) محلی ابن حزم میں ہے۔

عن عبداللہ بن مسعود قال یخفی الامام ثلاثاً الاستعاذۃ وبسم اللہ الرحمن الرحیم وآمین

(ج ۳ ص ۱۸۴)

یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ امام تین چیزوں کو سراً کہے گا ،بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ،اعوذ باللہ اور آمین۔

(۱۱) حضرت عمرؓ کا ایک اثر کنز العمال ج ۴ ص ۲۴۹، میں ہے ،جس کے الفاظ یہ ہیں۔

اربع یخفیھن الامام التعوذ وبسم اللہ الرحمن الرحیم وآمین واللھم ربنالک الحمد

یعنی چار چیزیں سراً امام کہے گا ،اعوذباللہ ،بسم اللہ ،آمین اور **اللھم ربنا لک الحمد .**

(۱۲) مصنف عبدالرزاق ج ۲ ص ۸۷، میں ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے باب ما تخفی الامام یعنی اس کا بیان کہ امام نماز میں کن چیزوں کو اخفاء (بلا آواز) کہے گا۔

اس میں پہلی روایت حماد عن ابراہیم کی سند سے ہے اور دوسری روایت عن الثوری عن منصور عن ابراہیم کی سند سے ہے ،پہلی روایت کے الفاظ یہ ہیں

اربع یخفیھن الامام بسم اللہ الرحمن الرحیم و الاستعاذۃ وآمین واذاقال سمع اللہ لمن حمدہ قال

ربنا لک الحمد

یعنی چار چیزوں کو امام آہستہ سے کہے گا، بسم اللہ، اعوذ باللہ، آمین اور ربنا لک الحمد

اور دوسری روایت عن الثوری عن منصور عن ابراہیم ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

خمس یخفیھن الامام، سبحٰنک اللھم وبحمدک والتعوذ وبسم اللہ الرحمن الرحیم وآمین واللھم ربنا لک الحمد .

یعنی پانچ چیزوں کو امام آہستہ سے کہے گا ثناء، تعوذ، بسم اللہ، آمین اور ربنا لک الحمد

اس سے معلوم ہوا کہ ابرہیم نخعی جو جلیل القدر فقیہ و محدث و تابعی حضرت عمر فاروقؓ حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علوم کے حامل تھے، ان کے زمانہ میں جہراً آمین کہنے کا کوئی معمول ہی نہیں تھا

اب تک کی ان گزارشات کی روشنی میں جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ

(۱) چونکہ آمین دعا ہے اور دعا میں اصل یہ ہے کہ اخفاء ہو جیسا کہ حکم ربانی ہے ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ (تم اپنے رب کو عاجزی کے ساتھ اور چپکے سے پکارو) اس وجہ سے آمین کو بھی آہستہ کہنا افضل اور بہتر ہوگا۔

(۲) قرآن سے غیر مقلدین کے پاس جہراً آمین کہنے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۳) خلفائے راشدین سے جہراً آمین کہنا ثابت نہیں ہے۔

(۴) حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا ارشاد یہ تھا کہ آمین کو سراً کہا جائے گا۔

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مذہب تھا کہ آمین کو سراً کہا جائے۔

(۶) غیر مقلدین بخاری کی جس روایت سے استدلال کرتے ہیں اس سے آمین بالجہر ثابت نہیں ہوتا۔

(۷) امام ترمذی کی جس روایت سے غیر مقلدین آمین بالجہر پر استدلال کرتے ہیں وہ اس اعتبار سے معلول ہے کہ اس روایت کے راوی حضرت سفیان ثوری کا خود اس پر عمل نہیں تھا۔ اس وجہ سے وہ روایت آمین بالجہر کی دلیل نہیں بن سکتی۔

(۸) وائل بن حجر کی حضرت شعبہ کے طریق والی روایت سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ آمین کو سراً کہنا چاہئے۔

(۹) غیر مقلدین حضرات بقیہ جتنی روایات سے استدلال کرتے ہیں سب ضعیف ہیں

(۱۰) آنحضور اکرم ﷺ سے کبھی کبھی جہراً آمین کہنا بھی تعلیم کی غرض سے ثابت ہے۔

(۱۱) آنحضور اکرم ﷺ سے جہراً آمین کہنا بطور عادت مستمرہ کے ثابت نہیں ہے۔

(۱۲) آنحضور اکرم ﷺ کا خود فرمان تھا کہ دعا میں اخفاء کرو۔

(۱۳) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب امام آمین کہتا ہے تو فرشتے بھی آمین کہتے ہیں اور جس کا آمین کہنا فرستوں کے آمین کہنے کے موافق ہوتا ہے اس کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں اور آمین کہتے میں فرشتوں سے موافقت سراً کہنے میں ہوتی ہے نہ کہ جہراً کہنے میں

،ان امور کے پیش نظر سراً آمین کہنا ہی اولی اور افضل ہوگا ہاں آمین میں بوقت مصلحت وضرورت جہر کی بھی اجازت ہے اور جن روایتوں کو غیر مقلدین آمین کو جہراً کہنے کے لئے پیش کرتے ہیں اگر ان کو کسی درجہ میں صحیح بھی مان لیا جائے تو ان کا محمل یہی مواقع ہیں۔

محمد ابوبکر غازی پوری

خط اور اس کا جواب

صحیح ابن خزیمہ میں سینہ پر ہاتھ باندھنے والی حدیث

اور غیر مقلدین کی غلط بیانیاں

مکرمی حضرت مدیر زمزم دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

گزارش ہے کہ الحمدللہ زمزم پرچہ کے بہت فائدہ ہو رہا ہے اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

گجرات کے شہر احمد آباد میں تبلیغی جماعت کے بہت سے لوگ جہالت کی وجہ سے غیر مقلدین کے جال میں آکر اپنا ایمان برباد کر چکے ہیں اللہ ان کو ہدایت دے آج کل غیر مقلدین یہ شور مچا رہے ہیں کہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا جائز نہیں ہے حدیث کے خلاف ہے صحیح حدیث میں نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنا آیا ہے اور حوالہ میں صلوٰۃ الرسول کتاب سے صحیح ابن خزیمہ کتاب کا نام لیتے ہیں بلکہ اس کو لوگوں کو دکھاتے ہیں براہ کرم آپ اس حدیث کے بارے میں خلاصہ کریں اور ہماری رہنمائی فرمائیں اردو کمزور ہے معاف فرمائیں غلطی ہو تو ٹھیک کر لیں۔

موسیٰ رشید ڈیسائی

سوناواڑا گجرات

زمزم:

آپ کا خط ملا، اس سے پہلے بھی فون پر بعض لوگوں نے اسکی اطلاع دی تھی کہ احمد آباد میں غیر مقلدوں نے بڑا طوفان مچا رکھا ہے، غلط سلط بات کر کے عوام کو گمراہ کر رہے ہیں اور تبلیغی جماعت میں نکلنے والے جاہل لوگوں کو اپنے دام میں پھانس رہے ہیں، جب اللہ کسی کی گمراہی کا فیصلہ کر لیتا ہے تو آدمی غیر مقلد ہی نہیں قادیانی بن جاتا ہے ملحد بن جاتا ہے، ہزاروں لوگ عیسائی ہو گئے، یہ تو اللہ کا فیصلہ ہے اللہ جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہ کرے، اس سے غیر مقلدین کے حق پر ہونے کا فیصلہ نہیں ہوتا، اگر کوئی قادیانی بن جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قادیانیت حق ہے یا کوئی عیسائی ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ عیسائی مذہب حق ہے اور اسلام معاذ اللہ باطل مذہب ہے، اس سے گھبرانا نہیں چاہئے، یہ زمانہ ہی فتنوں کا ہے، جیسے بہت سے فتنے نے آج سر ابھار رہے ہیں اسی طرح غیر مقلدیت آج کا زبردست شیطانی فتنہ ہے۔ اگر کوئی غیر مقلد ہو جاتا ہے اور اپنا مذہب چھوڑتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غیر مقلدیت حق مذہب ہے، اور اس نے جس مذہب کو چھوڑا وہ باطل ہے۔

کسی مذہب کے حق ہونے اور باطل ہونے کا فیصلہ جاہلوں کے ادھر ادھر ہونے سے نہیں ہوتا، آپ یہ دیکھیں کہ غیر مقلدیت اختیار کرنے والا طبقہ عام طور پر جاہل نوجوانوں کا ہوتا ہے، جن کو دین کا علم کچھ نہیں ہوتا، ایسے لوگ اگر گمراہ ہوتے ہیں اور غیر مقلدین کے

دام میں آتے ہیں تو جاہل غیر مقلدین کی تعداد میں مزید چند افراد کا اضافہ ہوگیا تو اس سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، جماعت تبلیغ نے اپنا مقصد صرف فضائل کی دعوت بنایا ہے مسائل سے جماعت کے لوگ تعرض نہیں کرتے، آج کے دور میں اس نظریہ میں تبدیلی کی ضرورت ہے، ورنہ اسی طرح جماعت کے لوگ گمراہ فرقوں کا شکار ہوتے رہیں گے۔

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے، صلوٰۃ الرسول میں صادق سیالکوٹی نے صحیح ابن خزیمہ کی سینہ پر ہاتھ باندھنے والی جو حدیث ذکر کی ہے وہ بالکل ضعیف اور نا قابل اعتبار ہے۔ صادق صاحب کی صداقت یہ ہے کہ انہوں نے اس کا ضعیف ہونا بیان نہیں کیا اور اس ضعیف حدیث کی بنیاد پر غیر مقلدوں کو نماز میں سینہ پر ہاتھ بندھواتے ہیں ضعیف حدیث کو نقل کر کے اس کے ضعف کو چھپانا مذہب غیر مقلدین میں حرام ہے، صادق صاحب نے یہی حرام کام کیا ہے، صادق صاحب کی نقل کردہ حدیث کی حقیقت کو خود ایک غیر مقلد نے واضح کر دیا ہے، صلوٰۃ الرسول کا جو محقق پہلا ایڈیشن پاکستان سے چھپا ہے، اس میں اس کا محقق اس حدیث کے بارے میں لکھتا ہے۔ یہ سند ضعیف ہے ، کیونکہ مؤمل بن اسماعیل سئی الحفظ ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے تقریب (۲۹/۲) میں کہا ہے، ابوزرعہ نے کہا کہ یہ بہت غلطیاں کرتا ہے ، امام بخاری نے اسے منکر الحدیث کہا ہے، ذہبی نے کہا ہے کہ کہ حافظ عالم ہے مگر غلطیاں کرتا ہے میزان ج ۴ ص ۲۲۸ (صلوٰۃ الرسول محقق ایڈیشن طبع اول ص ۲۲۸)

معلوم ہوا کہ صحیح ابن خزیمہ والی حدیث کو خود غیر مقلدین علماء صحیح نہیں کہتے ہیں مگر صادق صاحب نے اس حدیث کو اس انداز سے نقل کیا ہے کہ گویا وہ بالکل صحیح حدیث ہے، غیر مقلدین اسی طرح عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔

صادق صاحب نے اس سلسلہ کی جتنی بھی حدیثیں نقل کی ہیں، ہر حدیث میں کوئی نہ کوئی ضعیف راوی ہے، جس کی وجہ سے ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ دور اول میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کا رواج نہیں رہا، اگر نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنا ہی سنت ہوتا تو امام ترمذیؒ کو اس کا علم ضرور ہوتا، مگر انہوں نے صرف اسی بارے میں دو مذہب نقل کیا ہے۔ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا اور ناف کے اوپر ہاتھ باندھنا سینہ پر ہاتھ باندھنے کا انہوں نے ذکر ہی نہیں کیا ہے، تفصیل میری کتاب ارمغان حق جلد اول میں ہے اس کو دیکھ لیں۔

اور یہ بات یاد رکھئے کہ احناف کا جو مذہب ہے اگر چہ اس کی حدیث ضعیف ہو، مگر صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت کا بقول امام ترمذی یہی مذہب تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ہی آنحضور اکرم ﷺ کی سنت تھی یعنی آپ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ کبھی آپ ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے اور کبھی ناف کے اوپر جیسا کہ یہی دو مذہب اس بارے میں امام ترمذی نے نقل کئے ہیں اور جو بات صحابہ کرامؓ میں جاری رہی ہو اس کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا کہ اس بارے میں جو حدیث ہے وہ ضعیف ہے، حدیث کا صحیح ہونا اور ضعیف ہونا یہ محدثین کی اپنی اصطلاح ہے، اگر ضعیف حدیث میں کوئی ایسی بات ہو جس پر صحابہ کرامؓ کا عمل تھا تو اس کے مسنون ہونے اور آنحضور اکرم ﷺ کی سنت ہونے کا یقین کرنا چاہئے اور اس کو محدثین صحیح سمجھتے ہیں۔

حافظ جلال الدین سیوطی کا بیان ہے۔

یحکم للحدیث بالصحة اذاتلقاه الناس بالقبول وان لم یکن له اسناد صحیح (تدریب الراوی

ص ۲۴)

یعنی اگر کسی حدیث کو عام طور پر لوگوں نے قبول کیا ہے تو اس پر صحیح ہونے کا حکم لگایا جائے گا اگر چہ اس کی سند صحیح نہ ہو۔

بلکہ بعض محدثین نے تو اس کی صراحت کی ہے کہ اگر امت نے ضعیف حدیث کو قبول کیا ہے تو اس حدیث پر عمل کیا جائے گا یہی صحیح مذہب ہے ، یہاں تک کہ اس کا درجہ متواتر کا ہو جاتا ہے۔اس سے قطعی خبر کو منسوخ بھی کیا جاسکتا ہے دیکھو(فتح المغیث للسخاوی ص ۲۰۔۲۱)

محدثین کی یہ باتیں آپ اپنی نگاہ میں رکھیں اور پھر امام ترمذی کا جو فرمان ہے اس پر نظر کریں کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین اور تبع تابعین کا عمل نماز میں ہاتھ باندھنے کے سلسلے میں صرف دو طرح کا تھا،اسلاف یا تو ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے تھے یا ناف کے اوپر۔سینہ پر کوئی ہاتھ نہیں باندھتا تھا،اور یہی وجہ ہے کہ غیر مقلدین کے امام ابن القیم نے اپنی کتاب بدائع الفوائد میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کو مکروہ لکھا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ سینہ پر ہاتھ باندھنا یہ غیر مقلدین کا شاذ مذہب ہے،اسلاف کا عام طور پر یہ عمل نہیں تھا۔

ائمہ اربعہ کو اللہ نے جو مقبولیت دی ہے اس کا کوئی کافر ہی انکار کرسکتا ہے انہیں ماننے والے ساری دنیا میں پھیلے ہیں،ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کا مذہب بھی سینہ پر ہاتھ باندھنے کا نہیں ہے،امام شافعی سے ایک کمزور قول سینہ پر ہاتھ باندھنے کا ہے مگر ان کا مشہور مذہب جس پر شوافع کا عمل ہے ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کا ہے۔

آپ سوچیے کہ اگر آنحضور اکرم ﷺ کی یہی سنت ہوتی کہ سینہ پر ہاتھ باندھا جائے تو ان ائمہ کرامؒ کو اس سنت کا پتہ کیوں نہیں چلا،اور انہوں نے اس کے خلاف کیوں اپنا مذہب بنایا۔

امام احمدؒ جو ظاہر حدیث پر عام طور پر عمل کرتے ہیں اور جن کو امام السنہ کہا جاتا ہے،ان کا مذہب بھی سینہ پر ہاتھ باندھنے کا نہیں ہے ۔امام مالکؒ کا بھی یہ مذہب نہیں ہے جو مدینہ پاک کے رہنے والے اور مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے والے تھے،امام شافعیؒ کا بھی یہ مذہب نہیں ہے جو مکہ مکرمہ میں تھے اور کعبہ شریف میں نماز ادا کرتے تھے،اس سے معلوم ہوا کہ دور اول یعنی دور صحابہ وتابعین میں نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کا کوئی رواج نہیں تھا،غیر مقلدوں نے جہاں بہت سی چیزیں ایجاد کی ہیں ان میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ وہ نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھتے ہیں اور جو ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ہے اس پر نکیر کرتے ہیں اور اس کے عمل کو خلاف سنت بتلاتے ہیں،سنت والے عمل کو خلاف سنت بتلانا بدترین قسم کی گمراہی اور جہالت ہے،غیر مقلدین اسی جہالت اور گمراہی میں گرفتار ہیں اور یہ ایسے بدنصیب ہیں کہ حق کا چراغ ان کے سامنے کتنا بھی روشن کرو اس کی روشنی ان کو نظر نہیں آتی ،بس آپ اور ہم ان کیلئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس بدنصیبی محرومی سے نکالے اور ان کو صراط مستقیم پر لگائے۔

واللہ اعلم بالصواب

محمد ابوبکر غازیپوری

تراویح کی تعداد کی بحث میں

غیر مقلدین کا فریب

رمضان کے مبارک مہینہ کے موقع پر عام طور پر غیر مقلدین تراویح کی تعداد کو لے کر شور وغوغا مچاتے ہیں، اس رمضان میں بھی انہوں نے بعض جگہ اس مسئلہ کو بہت شدت سے اچھالا، ان کا یہی وتیرہ ہر سال رہا کرتا ہے، اصل تراویح کی آٹھ رکعت ہے بیس رکعتیں جن پر عام طور پر پوری دنیا میں مسلمانوں کا عمل ہے یہ عمل ان کو بدعت اور غیر سنت نظر آتا ہے، مقلدین کی تراویح بدعت عمری ہے، ہم لوگ نبوی سنت پر عمل کرتے ہیں اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کر کے وہ جاہل عوام کو گمراہ کرتے ہیں اور ساری دنیا میں تراویح کی جو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں ان کو بدعت بتلاتے ہوئے انہیں شرم نہیں آتی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ غیر مقلدین کے مذہب میں تراویح نام کی کسی مستقل نماز کا شیعوں کے مذہب کی طرح کوئی وجود ہی نہیں ہے، جب حقیقت یہ ہے تو تراویح کی رکعتوں کی تعداد پر بحث کرنا محض غیر مقلدوں کا فریب ہے، غیر مقلدین کے نزدیک تہجد کی جو گیارہ مہینے نماز پڑھی جاتی ہے اسی تہجد کی نماز کو ان کے مذہب میں تراویح کہا جاتا ہے، یعنی ان کے نزدیک تراویح الگ سے کوئی مستقل نماز نہیں ہے جیسا کہ عام اہل سنت مسلمانوں کا مذہب ہے بلکہ تہجد کی نماز ہی کو یہ لوگ رمضان میں تراویح کے نام پر پڑھتے ہیں اور پھر تہجد کی نماز سے رمضان کے مقدس مہینے میں اپنے کو یہ فارغ کر لیتے ہیں اور آرام کی نیند سو کر دن بھر کی تکان اتارتے ہیں اور دوسرے روز کے روزہ کے لئے چاق وچوبند ہوتے ہیں، چنانچہ مولانا صادق صاحب سیالکوٹی اپنی کتاب صلوٰۃ الرسول میں لکھتے ہیں۔

اسی لئے نبی رحمت نے رات کی نماز تہجد کو رمضان شریف میں عشاء کے ساتھ پڑھ کر لوگوں کے لئے سہولت اور آسانی پیدا کر دی تاکہ وہ تراویح کے بعد (اسی تہجد کو تراویح کہا جا رہا ہے) پوری آرام کی نیند سو لیں اور پھر صبح صادق سے کچھ پہلے آٹھ کر (یعنی اب تہجد کے لئے نہیں اٹھنا ہے) سحری کھا کر روزہ کے لئے تازہ دم ہو جائیں۔

(صلوٰۃ الرسول ص ۳۷۸)

اور مولانا نذیر احمد اموی انوار مصابیح میں لکھتے ہیں

"تہجد فی رمضان اور تراویح دونوں ایک ہیں یعنی رمضان میں جو تہجد پڑھی جاتی ہے اسی کا نام تراویح ہے" (انوار مصابیح ص ۴۷)

اور یہی بات عام طور پر غیر مقلدین اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں، تو جب غیر مقلدین کا یہی مذہب ہے کہ تراویح الگ سے کوئی مستقل نماز نہیں ہے بلکہ عام دنوں کے تہجد ہی کی نماز کو ان کے یہاں تراویح کہا جاتا ہے، تو اب خوامخواہ ان لوگوں سے تراویح کی تعداد کے بارے میں بحث کرنا جن کے نزدیک تراویح مستقل تہجد کے سوا ایک نماز ہے بالکل ہی جاہلانہ اور احمقانہ بات ہے، اگر تمہارے نزدیک تہجد کا نام ہی تراویح ہے اور تہجد کی نماز آنحضور ﷺ سے آٹھ رکعت ثابت ہے، تو اس کا منکر ہی کون ہے سارے اہل سنت تہجد کی اس تعداد کے بھی قائل ہیں اسلئے غیر مقلدوں کے اس فریب سے مسلمانوں کو واقف ہونا چاہئے، کہ وہ تراویح کا نام لے کر مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں

ورنہ ان کے نزدیک شیعوں کے مذہب کی طرح تراویح نام کی مستقل کوئی نماز نہیں ہے جس کو خود آنحضور اکرم ﷺ نے مسنون کیا تھا، تہجد کی فرضیت تو نص قرآنی سے ثابت ہے، مگر مسلمان جس نماز کو تراویح کہتے ہیں اور جو صرف رمضان کے مہینہ میں ادا کرنے والی عبادت ہے ،اس کی مشروعیت سنت نبوی سے ہے جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے ''سننت لکم قیامہ''یعنی میں نے رمضان میں تراویح کو تمہارے لئے مسنون کیا ہے۔

پس تراویح کے باب میں غیر مقلدوں کا یہ کہنا کہ اس کی رکعتیں آٹھ ہیں اور اہل سنت سے اس بارے میں لڑنا جھگڑنا بالکل بے معنی ہے، جب تمہاری خود ساختہ نام کی تراویح اور اہل سنت کی مشروع اور مسنون تراویح دونوں دو الگ چیزیں ہیں تمہاری تراویح سال بھر والی تہجد ہے اور اہل سنت کی تراویح وہ ہے جو بیس رکعت یا اس سے زائد رکعتوں کے ساتھ وہ صرف رمضان کے زمانہ میں ادا کرتے ہیں، تو اگر دونوں نمازوں کا عدد الگ الگ ہو تو اس میں بحث کی کیا ضرورت ہے، اور غیر مقلدین کیوں چاہتے ہیں کہ اہل سنت بھی صرف آٹھ رکعتیں تراویح پڑھیں، اگر اہل سنت والجماعت بھی غیر مقلدوں ہی کہ طرح تہجد ہی کو تراویح بھی کہتے تو اس کی عدد کے بارے میں بحث ومباحثہ کی گنجائش تھی اور اس کا کچھ جواز تھا، مگر جب اہل سنت کے نزدیک تہجد کی نماز کو تراویح نہیں کہا جاتا بلکہ ان کے نزدیک تراویح مستقل عبادت ہے تو ان سے تہجد والا عدد پڑھنے کا مطالبہ کرنا زبردستی ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ کل کے دن کوئی غیر مقلد چار رکعتیں عشاء با جماعت ادا کر کے اس کا نام تراویح رکھ دے اور کہے یہی تراویح سنت ہے اور وہی نماز جو سال بھر اشراق کے نام سے سورج کے بلند ہوتے وقت مسلمان ادا کرتے ہیں اس کا نام رمضان کے زمانہ میں اگر وہ چار رکعت عشاء کے فرض کے بعد با جماعت ادا کی جائے تو تراویح ہے اور کتب احادیث میں جو اشراق کے سلسلہ کی احادیث ہیں ان کو بیان کر کے اپنی چار رکعت والی تراویح کی حقانیت ثابت کرے اور اہل سنت والجماعت والی تراویح کو بدعت کہے، اس کا جواب کوئی اہل سنت اس کے سوا اور کیا دے سکتا ہے کہ اے غیر مقلد بھائی تراویح کی رکعتوں کے بارے میں تمہارا اہل سنت سے لڑنا جھگڑنا فضول ہے جس نماز کو تم تراویح کہتے ہو وہ اہل سنت کے نزدیک تراویح کی نماز نہیں کہلاتی ہے ،اگر تم نے اشراق کی نماز کا نام تراویح رکھا ہے تو بلاشبہ اشراق کی نماز چار ہی ہے، تمہاری تراویح کی یہ چار رکعتیں بلاشبہ صحیح ہیں، تم پڑھو اور شوق سے اشراق کی نماز کا نام تراویح رکھو، اہل سنت کے نزدیک تراویح اشراق کے علاوہ ایک دوسری نماز ہے جس کو صرف رمضان کے زمانہ میں مسلمان ادا کرتے ہیں، اور ہم اس نماز کی تعداد کو بیس کہتے ہیں، بالکل اسی طرح ہم اہل سنت ان غیر مقلدوں سے کہتے ہیں کہ تمہارے مذہب میں جس نماز کو تراویح کہا جاتا ہے وہ ہمارے نزدیک تراویح نہیں ہے وہ تہجد ہے اور تہجد کی نماز کی رکعتوں کا عدد آٹھ بھی ہے، اور بلاشبہ آنحضور اکرم ﷺ نے وتر کے ساتھ تہجد گیارہ رکعت بھی پڑھی ہے، البتہ خدا کے لئے مخلوق خدا کو دھوکا نہ دیا کرو، جب تراویح کا عدد بیان کیا کرو تو وضاحت کردیا کرو کہ مذہب غیر مقلدین میں تہجد ہی کو تراویح کہا جاتا ہے، اگر تم اس کی وضاحت کرتے رہو اور عوام کو اس سے واقف کرادو تو عوام دھوکا میں نہیں پڑیں گے اور وہ گمراہی سے بچیں گے، اور تمہاری اس وضاحت کے بعد اہل سنت کے علماء تم سے تراویح کی رکعتوں کے بارے میں بحث سے گریز کریں گے اس لئے کہ اہل سنت کے نزدیک تہجد کی آٹھ رکعتیں بھی مسنون ہیں۔

البتہ غیر مقلدین کو یہ ضرور بتانا ہوگا کہ سلف میں سے کون وہ لوگ ہیں جن کا مذہب یہ تھا کہ رمضان میں جو تہجد کی نماز ہوتی ہے اسی

کوتراویح بھی کہا جاتا ہے، کیاائمہ اربعہ میں سے اس کا کوئی قائل ہے یا محدثین کا یہ مذہب رہا ہے، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابوداؤد، امام ابن ماجہ، ان صحاح ستہ کے مصنفین کا مذہب یہی تھا کہ سال بھر والی تہجد رمضان میں تراویح ہو جاتی ہے غیر مقلدین کے وجود سے پہلے دنیائے اسلام کی کسی مسجد میں اس پر عمل ہوا ہے، تیرہ چودہ سو برس کا زمانہ اسلام پر گزر گیا، غیر مقلدین والی تراویح کسی مسجد میں پڑھی گئی، اور کیا آج بھی اہل سنت کی مساجد میں آٹھ رکعت تراویح پڑھی جاتی ہے۔

غیر مقلدین نے بہت سے شرعی مسائل میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی ہے تراویح کے باب میں بھی انہوں نے یہی کیا کہ اہل سنت کے مذہب سے الگ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی اور پھر مسلمانوں کو چیلنج کرنے لگے کہ دیکھو ہماری تراویح تو سنت والی ہے اور تمہاری تراویح حضرت عمرؓ کی بدعت ہے۔ یعنی خود تو بدعت والا عمل اپنایا اور اس کو اپنا مذہب بنایا اور دنیا کے تمام ان مسلمانوں کو بدعتی کہنے لگے جو تراویح کو مستقل نماز مان کر بیس رکعت یا اس سے زائد پڑھتے ہیں، جی ہاں، دوسروں کو بدعتی اور مشرک بنانا ''غیر مقلدیت'' اسی کا نام ہے۔

بہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ عام مسلمانوں کو یہ بات جاننا چاہئے کہ غیر مقلدین کے یہاں شیعوں کے مذہب کی طرح تراویح نام کی عبادت کا مستقلاً نماز کی حیثیت سے کوئی وجود ہی نہیں ہے، اس لئے تراویح کے عدد کے بارے میں ان سے بحث کرنا بالکل بے معنی بات ہے، جب کوئی غیر مقلد تراویح کے عدد کا مسئلہ اٹھائے تو آپ کو اس سے پوچھنا چاہئے کہ پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمہارے مذہب میں تراویح نام کی مستقل کوئی نماز ہے، بس اسی سوال سے اس کی ہوا اکھڑ جائے گی۔

طلاق ثلاث کے وقوع پر
جمہور اہل سنت کے کچھ دلائل کا تذکرہ

مکرمی حضرت مولانا غازی پوری صاحب دام ظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ　　　مزاج مبارک

اطلاعاً عرض ہے کہ جناب کا مؤقر مجلّہ ''زمزم'' دوماہی پابندی سے مل رہا ہے جس سے میں اور میرے احباب کافی فائدہ اٹھا رہے ہیں، سوالات کے جوابات کے سلسلہ نے اس پرچہ کی قیمت اور اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے، آپ کے جوابات بڑے تحقیقی اور عام فہم اور اطمینان بخش ہوتے ہیں، میرے احباب میں سے بعض اہلحدیث بھی ہیں جو مزاجاً کچھ سنجیدہ ہیں وہ بھی زمزم کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کا ان کو انتظار رہتا ہے۔

ایک گزارش ہے کہ زمزم میں طلاق کے موضوع پر اب تک کوئی تحریر نہیں آئی ہے جب کہ یہ موضوع بڑا اہم ہے، برائے کرم اس بارے میں بھی آپ کچھ تحریر فرمادیں مہربانی ہوگی اور ہم سب کو فائدہ ہوگا۔

والسلام

محمد عادل بارہ بنکی یوپی

زمزم!

طلاق کے موضوع پر اب تک کوئی سوال نہیں آیا تھا، اور نہ اس کی کوئی ضرورت محسوس کی تھی، اس لئے کہ یہ موضوع میرے نزدیک مفروغ عنہ ہے، اس بارے میں بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، خصوصاً مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا رسالہ ''الاعلام المرفوعہ'' اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے، آپ حضرات اس رسالہ کا مطالعہ کریں تو طلاق کا مسئلہ آئینہ ہوجائے گا اور حق پسندوں کو کوئی خلجان باقی نہیں رہے گا، میں بھی جو کچھ لکھوں گا اسی رسالہ سے مستفاد ہوگا۔

(۱)　پہلی بات تو آپ یہ معلوم کریں کہ ایک مجلس کی ایک دفعہ دی ہوئی تین طلاق کے واقع ہونے پر اور اس طلاق کے بعد بی بی کو شوہر کے پاس بلا دوسرے نکاح کئے اور اس دوسرے شوہر سے بلا خلوت صحیحہ ہوئے نہ جانے پر جمہور امت متفق ہیں، یہ صرف احناف کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ امام ابوحنیفہؒ کے علاوہ دوسرے ائمہ کا بھی یہی مذہب ہے اور یہی مذہب جمہور محدثین کا بھی ہے، مثلاً امام اوزاعی، امام نخعی، امام ثوری۔ امام اسحاق، امام ابوثور، امام بخاری کا بھی یہی قول ہے، بلکہ جمہور صحابہ کرامؓ و تابعینؒ و جمہور ائمہ سلف و خلف اس کے قائل ہیں۔

امام نوویؒ مسلم شریف کی شرح میں فرماتے ہیں۔

وقداختلف العلماء في من قال لامرأته انت طالق ثلاثاً فقال الشافعي ومالک وابو حنيفة واحمد وجماهير العلماء من السلف والخلف يقع الثلاث

(ج ۱ص ۴۷۸ نووی)

یعنی اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی سے یہ کہا کہ تجھ کو تین طلاق ہے تو کتنی طلاق واقع ہوگی، تو امام شافعی، امام مالک، امام ابوحنیفہ اورامام احمد اور سلف وخلف کے جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ تین طلاق پڑ جائے گی۔

اور علامہ عینی بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں

ومذهب جماهير العلماء من التابعين ومن بعد هم منهم الاوزاعی والنخعی والثوری وابو حنيفه واصحابه ومالک والشافعي واصحابه واحمد واصحابه واسحاق وابوثور وابوعبيد وآخرون كثير ون على ان من طلق امرأته ثلاثاًوقعن لكنه ياثم

(ج ۹ ص ۵۳۷)

یعنی تابعین اوران کے بعد کے جمہور علماء مثلاً امام اوزاعی، امام نخعی، امام ثوری، امام ابوحنیفہ، اوران کے اصحاب امام مالک، امام شافعی۔اوران کے اصحاب امام احمد اوران کے اصحاب امام اسحاق امام ابوثور ابوعبید اوران کے علاوہ دوسرے اور بہت سے علماء کا یہ مذہب ہے کہ جس نے اپنی عورت کو تین طلاق دیں تو تینوں پڑ جائینگی لیکن طلاق دینے والا اس طرح طلاق دینے کی وجہ سے گناہ گار ہوگا۔

خود غیرمقلدوں کے امام ثانی ابن قیم بھی یہی کہتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی کتاب زاد المعاد میں لکھتے ہیں:

تین طلاق بیک زبان دینے سے تینوں طلاق واقع ہوجانے کے قائل ائمہ اربعہ اور جمہور تابعین اور بہت سے صحابہ کرامؓ ہیں

(ج ۵ ص ۲۴۷)

پس معلوم ہوا کہ جولوگ تین طلاق کے وقوع کے قائل نہیں ہیں ان کا مذہب شاذ اور جمہور علماء سلف وخلف کے خلاف ہے۔

اور جمہور اہلسنت کے اس بارے میں جو دلائل ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

(۱) بخاری شریف اور مسلم شریف میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیں تو اس عورت نے دوسرے آدمی سے نکاح کرلیا تو اس دوسرے شوہر نے بھی اس کو طلاق دیدی، تو اس بارے میں آنحضورﷺ سے مسئلہ معلوم کیا گیا کہ کیا وہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لئے حلال ہے تو آپﷺ نے فرمایا کہ نہیں تا آنکہ یہ دوسرا شوہر اس سے لطف اندوز نہ ہولے۔

اس عورت کو پہلے شوہر نے تین طلاق مجموعی یعنی ایک ہی مجلس میں دی تھیں چنانچہ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر اور علامہ عینی فرماتے ہیں

فانه ظاهر كونها مجموعة يعنى طلقهاثلاثاً

یعنی طلقھا ثلاثا جو حدیث میں وارد ہوا ہے تو اس کا ظاہر یہی ہے کہ اس آدمی نے ایک ساتھ تین طلاق دی تھی، اور اس کے ظاہری

مفہوم سے علماء نے استدلال کیا ہے...... ایک بات یہ یاد رکھئے کہ غیر مقلدین یہ کہتے ہیں کہ معلوم نہیں اس آدمی نے تین طلاق کیسے دی تھی الگ الگ دی تھی یا ایک ہی مجلس میں دی تھی، تو یہ محض ایک باطل خیال ہے اسی وجہ سے اس حدیث کی شرح میں کسی کا ادھر خیال نہیں گیا۔

اور شراح حدیث نے بتلایا کہ اس کا ظاہر مطلب یہی ہے کہ اکٹھی تین طلاق دی گئی تھی اور جو لوگ ظاہر نص سے استدلال کرتے ہیں ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ تم یہ ثابت کرو کہ یہ تین طلاق الگ الگ نہیں دی گئی تھی، ہاں یہ مطالبہ ان سے کیا جائے گا جو خلاف ظاہر یہ کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ وہ تین طلاق الگ مجلسوں میں دی گئی ہو، وہ اپنے اس "ہوسکتا" کو دلیل سے ثابت کریں۔ امام بخاریؒ نے اس حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے، باب من جوز الطلاق الثلاث، اور بعض نسخوں میں باب من اجاز الطلاق الثلاث ہے، پہلی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اس باب میں اس کا بیان ہے کہ تین اکٹھی کا دینا جائز ہے اور دوسری عبارت کا مطلب یہ ہے کہ تین طلاق اکٹھی نافذ العمل ہے۔

(۲) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا کہ اگر میں اپنی بیوی کو تین طلاق دیتا تو کیا میرے لئے اس سے رجوع کرنا جائز ہوتا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں وہ تجھ سے جدا ہو جاتی اور تیرا یہ عمل گناہ ہوتا۔

اس روایت کو متعدد محدثین نے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے، مثلاً یہ روایت سنن بیہقی میں ہے، اور دار قطنی میں ہے، اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔

یہ روایت بھی مسئلہ زیر بحث میں بالکل واضح ہے۔ اور اس میں صاف یہ بھی مذکور ہے کہ آنحضور ﷺ نے اس عمل کو گناہ قرار دیتے ہوئے طلاق کو نافذ قرار دیا، اس سے معلوم ہوا کہ کسی عمل کا گناہ ہونا اور بات ہے اور اس کے حکم کا مرتب ہونا اور بات ہے، یعنی کسی عمل کے گناہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عمل ہی باطل ہو، مثلاً اگر روزہ دار روزہ کی حالت میں گالم گلوچ کرے، غیبت کرے تو یہ گناہ تو ہے مگر اس سے اس کے روزہ کا بطلان لازم نہیں آتا۔

غیر مقلدین کہتے ہیں کہ چونکہ تین طلاق اکٹھی دینا گناہ کا کام ہے اس وجہ سے اس کا طلاق دینا باطل ہوگا۔ آنحضور ﷺ تو گناہ بتلاتے ہوئے تین طلاق دینے کو لازم قرار دیں اور غیر مقلدین حضور ﷺ کے فرمان کے خلاف یہ کہیں کہ طلاق لازم نہیں ہوگی۔

اور ان کی دوسری بات جو حد درجہ مضحکہ خیز ہے وہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں ایک طلاق پڑے گی۔

سوال یہ ہے کہ جب گناہ ہونے کی وجہ سے تین طلاق نہیں پڑسکتی تو ایک طلاق کیوں پڑے گی؟ غیر مقلدین عموماً اس طرح کی خلاف عقل اور مضحکہ خیز باتیں کرتے ہیں۔

دار قطنی وغیرہ کی یہ روایت بہت واضح ہے کہ تین طلاق پڑ جائے گی تو غیر مقلدین نے اس روایت کو رد کرنے کا ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا کہ دار قطنی کی روایت جس سند سے ہے اس میں ایک راوی عطا خراسانی ہیں اور وہ مجروح ہیں اس وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے اس لئے اس کا اعتبار نہیں۔

تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ آپ کے یہاں ضعیف روایت کا اعتبار نہ ہوتا ہوگا مگر جمہور محدثین ضعیف حدیث کا اعتبار کرتے

ہیں تو آپ آنحضور کے اس ارشاد پاک کو رد کر کے اپنی جگہ خوش رہئے مگر جن کا مذہب یہ ہے کہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث بھی قابل استدلال ہوتی ہے ان سے آپ مت جھگڑیئے ان کو بھی خوش رہنے کا موقع دیجئے (۱)

پھر یہ ضعیف حدیث تو بخاری و مسلم کی صحیح روایت کے عین مطابق ہے تو اس کا اعتبار کیوں نہ ہوگا، اگر کوئی حدیث ضعیف ہی ہو مگر اس کی تائید صحیح حدیث سے ہو رہی ہو تو اس کا اعتبار سارے محدثین کے یہاں ہوتا ہے، آپ کیسے اہلحدیث ہیں کہ محدثین کی چال سے الگ الٹی چال چلتے ہیں اور اپنا نام پھر بھی اہلحدیث ہی رکھیں گے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس کا ضعیف ہونا امام مالک کو معلوم نہیں ہوا، امام شافعی کو معلوم نہیں ہوا، امام احمد کو معلوم نہیں ہوا، امام ابوحنیفہ کو معلوم نہیں ہوا اور ان تمام سلف وخلف

(۱) غیر مقلدین ابن تیمیہ کے مداح اور ان کے قائل ہیں طلاق کے مسئلہ میں وہ ابن تیمیہ ہی کے خوشہ چیں ہیں وہ ابن تیمیہ بھی اپنی کتابوں میں اہم مسائل میں ضعیف حدیث سے استدلال کرتے ہیں ابن تیمیہ کا ایک رسالہ وصیت الکبریٰ کے نام سے ہے جس میں دین کی بنیادی باتوں کا ذکر ہے اس میں ابن تیمیہ نے یہ حدیث ذکر کی ہے من قرأ القرآن فاعربه فله بكل حرف حسنات یعنی جس نے قرآن کو اعراب کے ساتھ پڑھا تو اس کے لئے ہر ہر حرف کے بدلہ میں دس نیکیاں ہیں اس رسالہ کا محقق محمد بن الحمود لکھتا ہے ضعیف جداً یعنی بہت زیادہ ضعیف حدیث ہے بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر

کو معلوم نہیں ہوا جن کا مذہب یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق تین ہی ہوتی ہے۔

اور نہ ان حضرات کو یہ معلوم ہوا کہ تین طلاق دینا گناہ ہے، اور اس گناہ کی وجہ سے تین طلاق نہیں صرف ایک طلاق پڑے گی، یہ بات صرف غیر مقلدوں کو اور ابن قیم اور ان کے امام ابن تیمیہ ہی کو معلوم ہوئی۔

بہرحال چاہے غیر مقلدین اس کا انکار کریں مگر جمہور امت نے اس کا اعتبار کیا ہے

(۳) تیسری حدیث جس کو امام شافعی ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم دارقطنی وغیرہ نے حضرت رکانہ سے روایت کیا ہے، روایت کا ترجمہ یہ ہے۔

حضرت رکانہ نے اپنی بی بی کو لفظ بتہ سے طلاق دی اس کے بعد وہ حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی بابت سوال کیا تو حضورﷺ نے پوچھا اس سے تمہاری نیت کیا تھی؟ تو انہوں نے کہا کہ میں نے ایک طلاق کا ارادہ کیا تھا تو آپﷺ نے قسم دے کر پوچھا تو انہوں نے اللہ کا نام لے کر کہا کہ میرا ارادہ ایک ہی کا تھا تو آپﷺ نے کہا تو پھر ایک طلاق ہوگی جیسا کہ تیرا ارادہ تھا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حضرت رکانہ سے تین بار قسم لی تھی اس سے معلوم ہوا کہ ایک دفعہ کی تین طلاق واقع ہو جاتی ہے ورنہ آپ کو قسم لینے کی کیا ضرورت تھی، یہ حدیث بھی محدثین کی تصریح کے مطابق صحیح ہے۔

دیکھئے ابن تیمیہ نے جوحدیث ذکر کی ہے وہ صرف ضعیف ہی نہیں ہے بلکہ بہت زیادہ ضعیف ہے اس سند میں ایک راوی نہش نامی ہے جو متروک ہے امام بخاری کے استاذ ابن راہویہ اس کو جھوٹا قرار دیتے ہیں مگر ابن تیمیہ اس حدیث کو نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ اس کو دلیل بناتے ہیں۔

لفظ البتہ طلاق کنائی ہے اور طلاق کنائی میں جیسا متکلم کا ارادہ ہوتا ہے وہی مراد بھی ہوتی ہے۔ اگر اس نے ایک کا ارادہ کیا ہے تو ایک اور اگر تین کا ارادہ کیا ہے تو تین۔

امام ترمذیؒ اس حدیث کونقل کرکے فرماتے ہیں۔

وقد اختلف اهل العلم من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم وغیرهم فی طلاق البتة فروی عن عمر بن الخطاب انه جعل البتة واحدة وروی عن علی انه جعلها ثلاثاوقال بعض اهل العلم فیه نیة الرجل ان نوی واحدة فواحدة وان نوی ثلاثاًفثلاث وان نوی ثنتین لم تکن الا واحدة وهو قول الثوری واهل الکوفة وقال مالک بن انس فی البتة ان کان قد دخل بها فهی ثلا ث تطلیقا ت وقال الشافعی ان نوی واحدة فهو واحدة وان نوی ثنتین فثنتین وان نویٰ ثلاث فثلاث .

یعنی اہل علم اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے علاوہ کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ جس نے طلاق البتہ دی تو کتنی طلاق پڑے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ ایک طلاق ہوگی ،حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ تین طلاق پڑے گی اور بعض اہل علم نے فرمایا ہے کہ اگر طلاق دینے والے نے ایک کی نیت کی ہے تو ایک پڑے گی اور اگر تین کی نیت کی ہے تو تین واقع ہوگی اور دو کی نیت کی ہے تب بھی ایک ہی واقع ہوگی اور یہی مذہب امام ثوری اور تمام اہل کوفہ کا ہے اور امام مالک قول ہے کہ اگر عورت مدخول بہا ہے پس تین طلاق واقع ہوگی اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر ایک کی نیت کی ہے تو ایک ،دو کی نیت کی ہے تو دو ۔اگر تین کی نیت کی ہے تو تین طلاقیں واقع ہوں گی

حضرت رکانہ کی یہ حدیث صریح ہے اگر انہوں نے تین کی نیت کی ہوتی تو اکھٹی تین طلاق واقع ہو جاتی اور یہی مذہب جمہور اہل علم کا ہے کہ کسی نے اپنی بیوی کو اکھٹی یا الگ الگ تین دفعہ کہا تجھ کو طلاق ہے کہہ کر تین طلاقیں ایک مجلس میں دی تو تینوں واقع ہو جائیں گی اگر ایسا نہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت رکانہ کی نیت کے بارے میں حلفیہ بیان نہ لیتے۔اب اگر غیر مقلدین اس حدیث کا انکار کریں اور نہ مانیں تو وہ جانیں کہ اس مسئلہ میں جمہور اہل اسلام کے خلاف تو ہیں ہی۔اب بات بنانے کیلئے حدیث ضعیف ہے کمزور ہے ہم نہیں مانیں گے کی وہ رٹ لگائے رہتے ہیں چلو تسلیم کہ حدیث ضعیف ہے مگر کیا ہر ضعیف حدیث نا قابل استدلال ہوتی ہے خوب یاد رکھیئے کہ جس حدیث پر جمہور اہل اسلام کا عمل ہو یا دور اول میں یعنی صحابہ وتابعین کے دور میں اس کا اعتبار کیا گیا ہو اس کا سنداً ضعیف ہونا قطعاً قابل توجہ نہیں مثلاً دیکھئے کہ وضو میں بسم اللہ پڑھنے والی حدیث ضعیف ہے لیکن پوری امت وضو میں بسم اللہ پڑھنے کو مسنون قرار دیتی ہے اور غیر مقلدین تو وضو میں بسم اللہ پڑھنے کو فرض اور رکن بتلاتے ہیں اسی طرح اور بھی بہترے مسائل میں حدیث ضعیف ہے مگر عملاً قوی ہے اور

اس پر بلانکیر محدثین وفقہاء کا عمل ہے (۱)

(۴) دار قطنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ہے۔ قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا طلق الرجل امراته ثلاثا ثلاثا فلا تحل له حتی تنکح زوجا غیره ویذوق کل واحد منهما عسیلة آلا خر . یعنی جب شوہر اپنی بیوی کو تین طلاق دے تو وہ اس کے لیے حلال باقی نہیں رہتی ہے بلا دوسرے شوہر سے نکاح کئے اور اس کے ساتھ صحبت صحیحہ کئے ہوئے اپنے پہلے شوہر کے نکاح میں دوبارہ نہیں آسکتی۔

(۱) اس کی تفصیل کے لئے میرا رسالہ غیر مقلدین کا حدیث کے بارے میں معیارِ رد وقبول اور میری کتاب غیر مقلدین کے لئے لمحہ فکریہ دیکھو۔

یہ حدیث بھی اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے اور جمہور اہل اسلام کی دلیل ہے مگر چونکہ اس حدیث سے غیر مقلدین کا مذہب باطل قرار پاتا ہے اس وجہ سے غیر مقلدین کو یہ حدیث بھی ضعیف ہی نظر آتی ہے۔

(۵) پانچویں حدیث بھی دار قطنی کی ہے اس میں ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی عائشہ خثیمہ کو اس لفظ سے طلاق دی اذھبی فانت طالق ثلاثا۔

یعنی تو چلی جا تجھے تین طلاق ہے عائشہ چلی گئیں بعد میں حضرت حسن کو معلوم ہوا کہ عائشہ اس طلاق سے بہت رنجیدہ ہیں تو ان کی آنکھ سے آنسو نکل آیا اور فرمایا کہ اگر میں نے اپنے والد سے نہ سنا ہوتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تھا کہ جو شخص اپنی بیوی کو تین مبہم (یعنی بیک لفظ) یا تین طہروں میں تین طلاقیں دے تو جب تک وہ عورت دوسرے سے نکاح نہ کرلے پہلے کے لئے حلال نہیں ہوسکتی اگر میں نے نانا جان کی یہ بات نہ سنی ہوتی تو میں عائشہ سے رجعت کرلیتا حضرت حسن رضی اللہ تعالی عنہ تو یہ فرمائیں کہ اکھٹی تین طلاقیں دینے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق طلاق واقع ہوجاتی ہے لیکن غیر مقلدین یہ کہیں کہ واقع نہیں ہوتی جمہور امت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پاک کے رد کردینے کی جرأت نہ ہوئی مگر غیر مقلدین کو اس کی جرأت ہوئی اس وجہ سے کہ وہ اس میدان کے بڑے شہسوار ہیں اور احادیث رسول کا رد کرنا انکے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

(۶) دار قطنی میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص بدعی طریقہ پر طلاق دے گا چاہے ایک دے چاہے دو یا تین ہم اس کو لازم کردیں گے یعنی ان تمام صورتوں میں طلاق واقع ہوجائے گی۔

دیکھئے جس عمل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لازم اور نافذ کررہے ہیں غیر مقلدین اسکو حضور ﷺ کے حکم کے خلاف باطل قرار دے رہے ہیں اور نہیں مانیں گے نہیں مانیں گے کی رٹ لگائے رہتے ہیں۔

(۷) ساتویں حدیث دار قطنی اور مصنف عبد الرزاق وغیرہ میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دے ڈالیں اس کے لڑکو ں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر یہ واقعہ بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ اگر تمہارا باپ اللہ سے ڈرتا تو اس کے لیے اللہ کوئی راستہ نکالتا اب تو تمہاری ماں تمہارے باپ کے نکاح سے تین طلاقوں کی وجہ سے نکل گئی اور بقیہ کا گناہ اس کے سر پڑا۔ یہ

حدیث بھی مسئلہ زیر بحث میں واضح ہے کہ تین طلاق سے تینوں طلاقیں پڑ جاتی ہیں۔

(۸) آٹھویں حدیث اس بارے میں یہ ہے۔

عن عامر بن الشعبی قال قلت لفاطمة بنت قیس حدیثنی عن طلاقک قالت طلقنی زوجی ثلاثاً وھو خارج الی الیمن فاجاز ذالک رسول اللہ ﷺ

یعنی شعبی کہتے ہیں کہ میں نے فاطمہ بنت قیس سے کہا کہ مجھ سے اپنی طلاق کا قصہ بیان کیجئے انہوں نے کہا کہ میرے شوہر نے یمن کے سفر پر جب وہ تھے تو انہوں نے مجھ کو تین طلاقیں دیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کے نافذ ہونے کا فتویٰ دیا

یہ حدیث بھی اپنے مدلول کے لحاظ سے بالکل واضح ہے اور محدثین نے اس سے ایک مجلس میں تین طلاق کے واقع ہونے پر استدلال کیا ہے۔

ابن ماجہ میں یہ حدیث مذکور ہے اور انہوں نے اس حدیث پر جو باب قائم کیا ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے۔ باب من طلق ثلاثا فی مجلس واحد یعنی اس کا بیان کہ جس نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس حدیث میں اس کا بیان ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں (۱)

چونکہ یہ ساری احادیث غیر مقلدین کے مذہب کے خلاف ہیں اس وجہ سے ان کا سارا زور ان احادیث کے ضعیف ثابت کرنے پر خرچ ہوتا ہے خواہ اس کے لیے انصاف و دیانت کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

مثلاً دیکھئے کہ محدثین کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر ضعیف احادیث متعدد ہوں تو ان سب کے ملنے اور ایک دوسرے کی تائید سے وہ حدیث قابل احتجاج ہو جاتی ہے اور اس کا سند کے اعتبار سے یا متن کے اعتبار سے جو ضعف ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اس بات کو عام محدثین کے علاوہ خود غیر مقلدین کے اکابر اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں مثلاً وضو میں بسم اللہ والی حدیث کے بارے میں امام ترمذی فرماتے ہیں۔

لا اعلم فی ھذا الباب حدیثا لہ اسنا د جید

یعنی میرے علم میں اس سلسلہ کی کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں ہے جس کی سند عمدہ ہو۔ اور بزور فرماتے ہیں **کل ما روی ھذا لبا ب فلیس بقوی**

یعنی اس باب میں جو حدیث بھی روایت کی گئی ہے وہ قوی نہیں ہے (یعنی ضعیف ہے) اور حافظ منذری فرماتے ہیں

وفی الباب احا دیث کثیرة لا یسلم شئی منھا عن مقال

یعنی اس باب کی بہت سی روایتیں ہیں مگر کوئی بھی صحیح نہیں ہے امام احمد فرماتے

(۱) ان تمام احادیث کو مولانا اعظمی نے اپنے رسالہ الاعلام میں ذکر کیا ہے اور بتلایا ہے کہ ان میں بعض احادیث صحیح ہیں اور بعض احادیث حسن سے کم نہیں ہیں۔

ہیں کہ لیس فیہ ما یثبت یعنی اس بارے میں کوئی بھی حدیث ثابت نہیں ہے مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے ترمذی کی شرح میں اس سلسلہ کی جتنی روایات ان کو مل سکیں سب کو ذکر کیا اور سب کو ضعیف بتلایا ہے لیکن اس کے باجود ان کا فیصلہ یہ ہے فرماتے ہیں

قلت لا شک فی ان ھذا لحدیث نص علی ان التسمیة رکن للوضوء او شرط

یعنی اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ حدیث اس بارے میں نص اور صریح ہے کہ وضو میں بسم اللہ پڑھنا رکن ہے یا شرط ہے۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں

قلت احادیث ھذ الباب کثیرۃ لیشد بعضا بعضھا بمجموعھا یدل علی ان لھا اصلا۔

یعنی میں کہتا ہوں کہ اس باب کی بہت سی احادیث ہیں جس سے ایک دوسرے کو قوت حاصل ہوتی ہے ان کا مجموعہ بتلاتا ہے۔ کہ اس کی اصل ہے (تحفہ ج اص ۲۹)

امام منذری سے نقل کرتے ہیں۔

ولا شک ان الاحادیث التی وردت فیھا وان کان لا یسلم شئی منھا عن مقال فانھاتتعاضد بکثرۃ طرقھا وتکتسب قوۃ۔

یعنی اس میں کوئی شک نہیں کہ وضو میں بسم اللہ پڑھنے کے سلسلہ میں ایک حدیث بھی جرح سے خالی نہیں ہے، لیکن کثرت طرق کی وجہ سے اس میں قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

غیر مقلدین سے ہر شخص کو یہ پوچھنے کا حق حاصل ہے کہ جب بسم اللہ والی حدیث آپ کے عالم مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کے بقول اور محدث امام منذری کے بقول متعدد ہونے کی وجہ سے اور کثرت طرق کی وجہ سے قوی بن جاتی ہے اور اس سے استدلال کرنا صحیح ہو سکتا ہے اور اس سے وضو میں بسم اللہ کی رکنیت ثابت کی جاسکتی ہے تو طلاق ثلاثہ والی حدیثیں اگر بفرض محال ان سب کو ضعیف بھی مان لیا جائے تو وہ کیوں نہیں ایک دوسرے سے مل کر قوی ہوسکتیں ہیں اور ان سے کیوں نہیں استدلال کیا جاسکتا ہے جب کہ ان احادیث کی قوت اور بھی اس اعتبار سے بڑھ جاتی ہے کہ عام طور پر فقہاء اور محدثین اور ائمہ اربعہ کا یہی مذہب ہے چند شاذ لوگوں کو چھوڑ کر پوری امت اسی کی قائل ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

آپ نے اسی ایک مثال سے اندازہ لگالیا ہوگا کہ یہ غیر مقلدین اپنے راگ کے آگے کسی کی بھی سننے والے نہیں ہیں اور خود ان کے اکابر جو اصول مقرر کرتے ہیں جب کوئی بات ان کے مذہب کے خلاف ہوتی ہے تو اس کی بھی دھجیاں اڑا دیتے ہیں اور اس کی پرواہ نہیں کرتے ایسے انصاف پسند اہلحدیث ہیں یہ لوگ۔

خیر یہ تو چند احادیث کا ذکر تھا اور اب اس بارے میں صحابہ کرام کے کچھ آثار بھی ملاحظہ فرمائیں:

حضرت ابن عمر کا اثر بخاری و مسلم میں ہے۔

جب حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے اس آدمی کے بارے میں سوال کیا جاتا جو اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تو آپ فرماتے کہ اگر کوئی اپنی بیوی کو ایک مرتبہ دو مرتبہ طلاق دے تو اس کا تو مجھ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے لیکن اگر تم اس کو تین مرتبہ طلاق دو گے تو وہ بیوی تمہارے اوپر حرام ہو جائے گی تا آنکہ وہ تیرے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کر لے۔

بخاری شریف و مسلم کے علاوہ یہ روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی مذکور ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا اثر:

موطا امام مالک میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو آٹھ طلاقیں دی ہیں (تو اب اس بارے میں آپ کا فتویٰ کیا ہے) لوگ کہتے ہیں کہ میری بیوی مجھ سے جدا ہو گئی ہے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا لوگ جو کہتے ہیں وہ درست کہتے ہیں تیری بیوی تجھ سے جدا ہو گئی شریعت کا یہی حکم ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کا اثر

موطا امام مالک اور احادیث کی دوسری کتابوں میں بھی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے ڈالیں حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ تین طلاقوں سے اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی اور باقی طلاقوں کا گناہ اس پر ہو گا جن کے ذریعہ سے اس نے اللہ کی آیتوں کا ٹھٹھا کیا ہے (۱)

حضرت عبداللہ بن عمرو العاص کا اثر:

موطا و شرح معانی الآثار الطحاوی میں ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ کوئی اگر اپنی بیوی کو خلوت سے پہلے طلاقیں دیدے تو کیا حکم ہے تو انہوں نے فرمایا کہ عورت ایک طلاق سے بائن ہو جائے گی اور تین سے ایسی ہو جائے گی کہ جب تک دوسرا نکاح نہ کر یگی پہلے کے لیے حلال نہ ہو گی۔

(۱) یعنی تین طلاقیں تو حکم خداوندی کے مطابق ہیں اس کا حکم قرآن میں مذکور ہے باقی جو بلا وجہ اس نے جو ستانویں طلاقیں دی ہیں وہ آیات قرآنیہ کے ساتھ گویا مذاق کرنا ہوا اس کا گناہ اس کے سر پر ہو گا۔

حضرت فاروق اعظمؓ کا اثر:

شرح معانی الآثار میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جو شخص غیر مدخولہ عورت کو تین طلاقیں دیدے وہ اس کے لیے حلال نہیں ہو سکتی جب تک وہ دوسرا نکاح نہ کر لے۔

دار قطنی میں بھی ایک اثر فاروق اعظم کا ہے جس سے مدخولہ وغیرہ کا حکم یکساں ثابت ہوتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اثر:

طحاوی شریف میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ یہ فتویٰ دیتے تھے کہ تین طلاق دی جانے والی عورت جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرلے وہ پہلے کے لیے حلال نہ ہوگی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا اثر:

موطا اور طحاوی میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو خلوت سے پہلے تین طلاقیں دیدی تو حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک طلاق سے بائنہ ہوجائے گی اور تین طلا ق سے اپنے شوہر پر ایسی حرام ہوجائے گی کہ جب تک دوسرا نکاح نہ کرلے پہلے کے لیے حلال نہیں ہوسکتی (۱) یہ چند صحابہ کرام کے فتوے ہیں ان کے علاوہ اور بھی متعدد صحابہ کرام سے اسی قسم کے فتاویٰ منقول ہیں یہ تمام فتاویٰ ان احادیث کے مطابق ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اسطرح اگر بقول غیر مقلدین وہ ساری احادیث ضعیف بھی ہوں جیسا کہ غیر مقلدوں کا دعویٰ ہے تو یہ فتاویٰ ان احادیث کی تائید کرتے ہیں جن سے وہ احادیث صحت

(۱) مولانا اعظمیؒ کا رسالہ الاعلام المرفوعہ دیکھو۔

کے اعلیٰ درجہ کو پہنچ جاتی ہیں۔

طلاق کا مسئلہ شریعت کا اہم مسئلہ ہے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حکم نہ ہوتا کہ تین طلاق واقع ہوجاتی ہے اور بغیر دوسرے شوہر کے نکاح کے پہلے کے لیے حلال نہیں ہوسکتی ہے تو یہ صحابہ کرام اس طرح فتویٰ نہ دیتے اور بیوی کو پہلے شوہر کے لیے حرام نہ قرار دیتے۔

اب غیر مقلدین اگر احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے آثار کے برخلاف ایک مجلس کی تین طلاق کے ایک ہونے کا فتویٰ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تقلید میں دیں تو آپ یا ہم ان کے ساتھ زبردستی تو نہیں کرسکتے۔

غیر مقلدین کا بڑا استدل حضرت ابن عباس کی وہ روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لیکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور خلافت تک ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک ہی سمجھا جاتا تھا یہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سیاست شر یعت میں تبدیلی فرمادی اور تین طلاق کے تین ہونے کا فتویٰ نافذ کیا اور کسی کو دبدبہ فاروقی کی وجہ سے ان کے اس حکم کے خلاف لب ہلانے کی جرأت نہ ہوئی آپ دیکھ رہے ہیں کہ خود ابن عباس کا یہی فتویٰ بھی ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہوجاتی ہیں اگر بات وہی ہوئی جو غیر مقلدین کہتے ہیں تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنی روایت کے خلاف فتویٰ نہ دیتے اور یہ بات کہ حضرت عمر نے سیاستاً شریعت کا حکم بدل ڈالا تو یہ بات صرف غیر مقلدین کہنے کی جرأت رکھتے ہیں کوئی ایمان والا اس طرح کی بات نہیں کرسکتا

وقوع طلاق ثلاث پر صحابہ کرام کا اجماع:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے اگر کسی حدیث سے یہ بات ثابت بھی ہو کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی قرار دی جاتی تھیں تو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تو تین طلاقیں تین ہونے پر اجماع صحابہ ہوچکا تھا۔

اور تمام امت نے اس اجماع کو تسلیم کیا ہے اور حضرت عمرؓ کے بعد سے لے کر آج تک جمہور کا یہی مذہب رہا ہے طحاوی شریف میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کے مجمع میں اس کا اعلان کیا تو لم ینکرہ علیہ منھم منکر ولم یدفعہ دافع :

یعنی نہ صحابہ کرام میں سے کسی نے حضرت عمر کی بات کا انکار کیا اور نہ کسی نے ان کے ارشادات کو رد کیا اور فتح الباری میں ہے کہ:

فالراجع فی الموضعین تحریم المتعة وایقاع الثلاث للاجماع الذین انعقد فی عهد عمر علی ذالک ولم یحفظ ان احداً فی عهده خالفه فی واحدة منهما.

یعنی راجح بات متعہ حرام ہونے اور تین طلاق کے واقع ہونے میں یہی ہے کہ تین طلاقیں پڑ جائیں گی اور متعہ حرام ہے۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس پر صحابہ کرام کا اجماع منعقد ہو چکا ہے اور یہ بات کسی سے منقول نہیں ہے کہ ایک صحابی نے بھی ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک میں بھی ان کی مخالفت کی ہو۔

اور یہ بات یاد رکھئے کہ اگر حکم فاروقی کتاب وسنت کے خلاف ہوتا تو یہ محال تھا کہ صحابہ کرام ان کی بات کو آگے سر تسلیم خم کرتے صحابہ کرام کے بارے میں اس کا تصور بھی محال ہے یہ تو غیر مقلدین کی ہمت وجرأت ہے جو صحابہ کرام کے بارے میں اس طرح کا باطل خیال رکھتے ہیں اور اس طرح وہ صحابہ کرام کی عظمت کو مجروح کرنے کے درپے ہوتے ہیں:

غیر مقلدین کی جرأت وہمت پر داد دینی ہوتی ہے کہ وہ صحابہ کرام کے بارے میں جب گفتگو کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی عقل اور اپنے ایمان دونوں کنارے پر رکھ دیتے ہیں مثلا ایک صاحب جنھوں نے اعلام مرفوعہ کا جواب لکھا ہے وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فتوی کے بارے میں فرماتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود نے جو حکم دیا وہ خفگی اور تہدید کا حکم ہے

(الآثار المتبوعہ ص ۱۱۳)

یعنی ان غیر مقلد صاحب کے نزدیک حضرت عبداللہ بن مسعود نے غصہ میں خلاف حکم شریعت فتویٰ دیا تھا۔ ہے کسی ایمان والے کا ایسا ایمان جو اس بات کو گوارا کرے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ غصہ اور تہدید کی وجہ سے شریعت کے خلاف فتویٰ دیں گے۔

اور یہی صاحب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کو سیاسی حکم قرار دیتے ہیں فرماتے ہیں اور بڑے طنطنہ سے فرماتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے اس مسئلہ کو نافذ فرمایا.............. وہ شرعی نہیں بلکہ ایک سیاسی حکم ہے (ص ۱۱۵ ایضا)

ماشاء اللہ کیا تحقیق ہے یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سیاست کی خاطر حکم شریعت کو بدل ڈالا اور کمال یہ ہے کہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں پھر حضرت معاویہ کے دور میں اور ائمہ کرام اور فقہاء اسلام کے دور میں حضرت عمر ہی کے زمانہ کے حالات باقی رہے کسی کو غیر مقلدوں والی عقل نہ آئی کہ جو حکم حضرت عمرؓ نے سیاست کی بنا پر دیا تھا وہ اس کو اصل شریعت کی طرف لوٹائیں اور اپنے زمانہ میں تین طلاق کے ایک ہونے کا فتویٰ دیں شریعت کے اصل پاسبان تو یہ غیر مقلدین تیرہویں صدی میں پیدا ہوئے ہیں اور ان میں جو عمل بالشریعۃ کا جذبہ کارفرما ہے اس سے امت کے جمہور خالی تھے حتی کہ صحابہ کرام تک میں بھی یہ جذبہ معاذ اللہ نہ تھا۔

امید ہے کہ یہ مختصر سی تحریر آپ کے لیے اس مسئلہ میں حق معلوم کرنے کے لیے کافی ہوگی اگر موقع ملے تو الاعلام المرفوعہ جو اس موضوع پر بہت محقق رسالہ ہے ضرور دیکھ لیں اور حضرت اعظمیؒ کی کتاب الازھار المربوعہ بھی کہیں سے مل جائے تو اس کا مطالعہ مزید بصیرت کا باعث ہوگا۔ والسلام محمد ابوبکر غازیپوری

مناسک حج میں تقدیم وتاخیر اور
جامعہ سلفیہ بنارس کے مفتیوں کا فتویٰ:

مکرمی حضرت مولانا غازی پوری دامت براکاتہم:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

زمزم کا پانچواں شمارہ کچھ تاخیر سے پہنچا رفع یدین پر آپ کی گفتگو بڑی دلچسپ اور معلوماتی اور موثر ہے کتاب الحجہ پر دوسری قسط بھی پہلی قسط کی طرح بہت خوب ہے اس کتاب کا آپ نے تعارف کرا کر ہم طلبہ پر بڑا اکرم کیا بہت سے اہل علم بھی اس کتاب سے اور اس کے مشمولات سے ناواقف تھے جامعہ سلفیہ بنارس کا محدث پرچہ آپ کے پاس آتا ہوگا اس کے دسمبر کے شمارہ میں مناسک حج کے تقدیم وتاخیر کے بارے میں ایک فتویٰ شائع ہوا ہے اگر آپ اس فتویٰ کے بارے میں کچھ تحریر فرما دیں تو ہمارے لیے فائدہ کی چیز ہوگی جامعہ سلفیہ والا فتویٰ ہمارے مسلک کے خلاف ہے الحمد اللہ زمزم سے ہم لوگ بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

نور محمد انصاری بستی

زمزم:

برادرم! زمزم کے بارے میں آپ کے تاثرات معلوم کر کے خوشی ہوئی محمد محسن سلمہ کے خط کی کوئی ضرورت نہیں تھی زمزم کوشش کرتا ہے کہ مفید سوالات کے جوابات سے گریز نہ کیا جائے جی ہاں محدث پرچہ زمزم کے تبادلہ میں آتا ہے اور میں اس کے مضامین پر سرسری نگاہ ڈال کر رکھ دیتا ہوں کبھی کوئی چیز قابل توجہ نظر آئی تو اس کو بغور دیکھ لیتا ہوں دسمبر کے شمارہ میں حج کے مناسک کی تقدیم وتاخیر کے بارے میں جامعہ سلفیہ کے مفتیوں کے فتویٰ پر میری بھی نگاہ ٹھہری تھی۔

محدث میں جو فتاویٰ شائع ہوتے ہیں کبھی ان کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے اور کبھی تعجب ہوتا ہے کہ دین وشریعت کے معاملہ کو کیسا کھیل بنا لیا گیا ہے آج منصب افتاء پر وہ لوگ بیٹھے نظر آتے ہیں جو افتاء کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں جو تفقہ کی دولت سے محروم ہیں اور جن کی علمی صلاحیت اللہ اللہ خیر صلا سے زیادہ نہیں ہے من افتیٰ بغیر علم کا زمانہ ہے یہ مفتیان خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور اپنے فتووں سے جاہل عوام کو بھی گمراہ کرتے ہیں اللہ تعالی ہمارے دین وایمان کی حفاظت فرمائے بڑے فتنوں کا یہ دور ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں۔

جامعہ سلفیہ کا فتویٰ مفتیوں کی جہالت وبے علمی اور ان کے جہل مرکب کا شاہکار ہے مگر طنطنہ ان کا یہ ہے انداز ملاحظہ فرمایئے فتویٰ دینے سے پہلے ارشاد ہوتا ہے۔

جس مسئلہ میں ارشادات نبویہ کتب حدیث میں صراحت کے ساتھ منقول ہوں اس امر اور معاملہ میں حدیث نبوی ہی کو اپنانا چاہیے ائمہ کے مسالک اور اقوال الرجال کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے :

کس قدر کبر اور رعونت سے بھری ہے یہ تحریر ائمہ فقہ وحدیث کے بارے میں کیسا بغض بھرا ہے ''مفتی کے دل میں'' یہ بیچارہ مفتی اس زعم میں مبتلا ہے کہ وہ اور اس کی جماعت ائمہ اربعہ اور اسلاف سے زیادہ حدیث نبوی ﷺ پر عمل کرنیوالی ہے اور حدیث کا جو علم اس کو حاصل ہے اس سے ائمہ دین محروم تھے الجواب صحیح کہنے والے میاں بھی اسی زعم کے شکار ہیں جب کہ یہ دونوں مفتی جہالت کے انتہائی مقام پر ہیں۔

ان مفتیوں کی قابلیت کا عالم یہ ہے کہ سوال کرنے والا کچھ پوچھتا ہے اور جواب دینے والے مفتی صاحب کو کیا سوال ہے اس کا پتہ نہیں اور ادھر ادھر کی ہانک کر اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرر ہے ہیں پوچھنے والے کا سوال یہ ہے۔ متمتع اور قارن کے لئے رمی، ذبح، حلق کے درمیان ترتیب واجب ہے یا مسنون اس کا جواب صرف اتنا تھا کہ آپ کی تحقیق میں واجب ہے تو کہہ دیتے کہ واجب ہے اور اگر مسنون ہے تو کہہ دیتے کہ مسنون ہے اور اگر واجب مسنون کچھ بھی نہیں ہے تو کہہ دیتے کہ نہ واجب ہے اور نہ مسنون اور کتاب وسنت سے اس کا عدم وجوب یا مسنون نہ ہونے کے دلائل پیش کرتے مگر مفتی صاحب نے اصل سوال سے ہٹ کر بلا وجہ کی ہانک لگانی شروع کردی اور ائمہ کے خلاف اپنے خبث باطن کو ظاہر کیا۔

مفتی صاحب بتائیں کہ اصل مسئلہ کیا ہے مناسک میں ترتیب کے خلاف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تھا یا ترتیب کے موافق ،اگر ترتیب آپ کا عمل تھا تو کم ازکم اس ترتیب کو مسنون ماننے سے آپ کو کیوں انکار ہے؟ اگر کسی وجہ سے کسی کے لیے حج کے کسی مناسک کو مقدم ومؤخر کرنے کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اجازت ہو تو کیا اس سے حج کے اعمال میں ترتیب کی مسنونیت یا اس کے وجوب کی نفی ہوتی ہے۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر حج وعمرہ کے اعمال کی ترتیب میں فرق آجائے تب بھی حرج نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے پھر فرماتے ہیں۔

صحیح مسلم میں امام مسلم نے باب باندھا ہے۔ (۱)

باب جواز تقدیم الذبح علی الرمی والحلق علی الذبح وعلی الرمی وتقدیم الطّواف علیھا کلھا، اس باب کے ضمن میں کئی حدیثیں لائے ہیں لیکن ہم صرف ایک حدیث پر اکتفا کریں گے اور پھر مفتی صاحب نے یہ حدیث ذکر کی ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ وسلم قیل لہ فی الذبح والحلق والرمی والتقدیم والتاخیر فقال لا حرج .

حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قربانی حلق اور رمی میں تقدیم وتاخیر کے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی حرج نہیں ہے اس حدیث سے جامعہ سلفیہ کے مفتی صاحب یہ مسئلہ مستنبط کررہے ہیں کہ حج کے

اعمال میں ترتیب نہ واجب ہے اور نہ مسنون اور اگر کوئی حج کے مناسک کو مقدم ومؤخر کرے تو اس پر کسی طرح کا کوئی دم نہیں۔

اس قسم کا فتویٰ چالو قسم کے مفتی دیتے ہیں جن کی نگاہ میں بس ایک دو حدیث ہوتی ہے اور افتاء کے عمل اور اس کی اہمیت سے بے خبر ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ جس کو تفقہ کی دولت

(۱) مفتی صاحب اور الجواب صحیح والے میاں صاحب کی جہالت کو بتلانے کے لئے یہی ایک بات کافی ہے کہ فرمایا جارہا ہے کہ صحیح مسلم میں امام مسلم نے باب باندھا ہے جبکہ اہل علم میں یہ بات بہت معروف ومشہور ہے کہ مسلم شریف میں جو ابواب قائم کئے گئے ہیں وہ امام مسلم کے قلم سے نہیں ہیں بلکہ بعد میں کسی کا اضافہ ہے۔

سے بہرہ ور کرتا ہے اور جس کو شرعی مسائل میں گفتگو کرنے کی اہمیت اور ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے وہ متعلقہ مسئلہ کے سلسلہ کے ہر گوشے پر نگاہ ڈالتا ہے اور اسکی نگاہ صرف امام مسلم کی کتاب کی دو ایک حدیث پر نہیں ہوتی ہے بلکہ موضوع سے متعلق تمام ارشادات نبویہ اور ارشادات صحابہؓ ان کا عمل اور اسلاف کا فیصلہ اس کی نگاہ میں ہوتا ہے اور وہ ان تمام چیزوں میں غور کرکے جو آدمی کے لیے محتاط بات ہو سکتی ہے اور جس کو شرعی نصوص سے تقویت ملتی ہے اس کو وہ اختیار کرتا ہے۔

اس مسئلہ میں جامعہ سلفیہ کے مفتی نے اگر سرسری نگاہ سے کام نہ لیا ہوتا اور اس کی نظر میں وسعت اور عمق ہوتا تو اس مسئلہ سے متعلق اور بھی حدیثوں کو دیکھتا صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے آثار پر بھی اس کی نظر ہوتے وہ قرآن کی طرف بھی نگاہ کرتا ان تمام چیزوں کو نگاہ میں رکھ کر فتویٰ دینے کی جرأت کرتا اس کے بعد اگر وہ من جانب اللہ بھی موافق اور مسود ہوتا تو اس کے قلم سے صحیح فتویٰ نکلتا۔

افسوس کہ جامعہ سلفیہ کے مفتی نے سرسری طور پر مسلم شریف کی بعض احادیث کو دیکھ کر اور ابن باز کی تقلید میں وہ فتویٰ دیا جس کا کسی اہلحدیث نام کے مدعی سے توقع تو نہیں تھی اگر وہ کسی امام کا مسئلہ ہوتا تو اور بات تھی مگر جن کو دعویٰ ہوتا ہے کہ ہم لوگ حدیث پر عمل کرتے ہیں ان کو فی الواقع حدیث پر عمل کرنے کا ثبوت پیش کرنا چاہئے مفتی صاحب کو صرف وہ حدیث نظر آئی ہے جس میں لاحرج کوئی حرج نہیں کا ذکر ہے حالانکہ بہت سی احادیث ایسی بھی ہیں جن سے اس مسئلہ میں حرج کا بھی پتہ چلتا ہے بلکہ صاف صاف حرج کو بتلانے والی احادیث وآثار بھی ہیں

موطا امام مالک میں کعب بن عجرہ فرماتے ہیں کہ وہ حالت احرام میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ان کے سر میں جوئیں پیدا ہوگئیں جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سر کے بال اتار دینے کا حکم دیا اور فرمایا تین روز اس کی جگہ روزہ رکھو یا دو دو وقت کرکے چھ مسکین کو کھانا دو یا ایک بکری ذبح کرو ان تینوں کاموں میں سے جو بھی کروگے نسک کی ادائیگی میں تمہارے سر منڈانے سے جو نقصان پیدا ہو گیا اس کی تلافی ہو جائے گی۔

امام مالک نے انہیں کی دوسری سند سے یہ حدیث بھی ذکر کی ہے میں اس کے الفاظ کے ساتھ نقل کرتا ہوں۔

عن كعب بن عجرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لعلك آذاك هو امك فقلت نعم يا رسول الله فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم احلق رأسك وصم ثلاثة ايام او اطعم ستة مساكين او انسك بشاة

حضرت کعب بن عجرہ فرماتے ہیں کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید تم کو جوئیں پریشان کررہی ہیں میں عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنا سر منڈ الواور اس کی جگہ تین روز روزہ رکھو یا چھ مساکین کو کھانا کھلاؤ یا ایک بکرے کی قربانی کرو۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان احادیث پر جو باب باندھا ہے اس کا عنوان یہ ہے۔

فدية من حلق قبل ان ينحر یعنی جس نے قربانی کرنے سے پہلے سر منڈ الیا اس کا فدیہ کیا ہوگا (۱)

(۱) مسلم نے بھی حضرت کعبؓ کی اس حدیث کو اپنی صحیح میں متعدد سندوں سے ذکر کیا ہے۔

امام مالک ان احادیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

لا يصلح للمحرم ان ينتف من شعره شيًا ولا يحلقه ولا يقصره حتى يحل الا ان يصيبه اذىً فعليه فدية كما امره الله تعالى .

یعنی محرم کے لیے جائز نہیں کہ ہے ارکان پورا کرنے سے پہلے اپنے بال میں سے کچھ نوچے نہ سر کا حلق جائز ہے اور نہ قصر جائز ہے الا یہ کہ اسے جوں وغیرہ سے پریشانی تو ہو اس صورت میں سر منڈ اسکتا ہے لیکن اس کے عوض اس پر اللہ کے حکم کے مطابق فدیہ واجب ہوگا۔

موطا امام مالک کی ان احادیث اور حضرت امام مالک کے اس فرمان سے معلوم ہوا کہ اگر کسی نے قصداً اور عمداً جانور ذبح کرنے سے پہلے حلق کرالیا تو اس پر دم اور فدیہ واجب ہے امام مالک نے قرآن کی جس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے

ولا تحلقوا رؤوسكم حتى يبلغ الهدى محله فمن كان منكم مريضا او به اذىً من راسه ففدية من صيام او صدقة او نسك .

یعنی اے محرموں اگر تم میں کا کوئی بیمار ہے یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہے تو اس کو روزہ رکھنا ہے یا صدقہ دینا ہے یا ایک قربانی کرنی ہے۔

یہ آیت نص ہے کہ ارکان حج میں ترتیب واجب ہے اگر قصداً اس کے خلاف عمل ہوا تو فدیہ دینا ہوگا۔

جامعہ سلفیہ کے مفتی اور الجواب صحیح کہنے والے صاحب کو صرف لاحرج والی حدیث نظر آئی اس حرج والی حدیث سے یا تو یہ بیچارے واقف نہیں تھے یا جان بوجھ کر اس سے انہوں نے آنکھ بند کرلی۔

جامعہ سلفیہ کے مفتی صاحب نے مسلم میں حضرت ابن عباس کی روایت سے لاحرج ثابت کیا ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی

اللہ تعالی عنہ جو مسلم شریف کی اس روایت کے راوی ہیں ان کا مذہب کیا تھا اس سے جامعہ سلفیہ کے مفتی صاحب بے خبر رہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجاہد جو ابن عباس کے مخصوص شاگرد ہیں ان کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ اثر نقل کیا ہے۔

عن مجا ھد عن ابن عبا س انہ قال من قد م شیًا من حجہ او اخر ہ فلیھر ق لذا لک دما ۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس کا قول یہ تھا کہ کسی نے اگر اپنے حج کے کسی رکن کو مقدم یا موخر کیا تو اس کی جگہ اس کو ایک جانور ذبح کرنا ہوگا۔

حضرت سعید بن جبیر سے بھی حضرت عبداللہ بن عباس کی اسی طرح کی روایت ہے اگر لاحرج کا وہی مطلب ہوتا جو جامعہ سلفیہ کے مفتی صاحب موصوف کے ذہن میں ہے تو پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ کا جو خود اس لاحرج والی روایت کے راوی ہیں ۔اس کے خلاف قول کیوں ہوتا اور وہ ارکان میں تقدیم وتاخیر کی صورت میں دم کے واجب ہونے کا فتوی کیوں دیتے حضرت ابن عباس کا فتوی صاف بتلا رہا ہے کہ لاحرج والی حدیثوں میں کا حرج کا مطلب وہ نہیں ہے جو جامعہ سلفیہ کے مفتی صاحب سمجھ رہے ہیں بلکہ اس لاحرج کا مطلب کچھ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر انسان بھول کر یا جہالت کی وجہ سے ارکان حج میں تقدیم وتاخیر کردے تو اس کے لئے کوئی حرج نہیں ہے چنانچہ خود مسلم شریف ہی میں جو پہلی اور دوسری حدیث اور تیسری حدیث وہ اسی بات کو بتلانے والی ہے جن کو مفتی جامعہ سلفیہ نے نظر انداز کردیا اور اس باب کی بالکل آخری حضرت ابن عباس والی حدیث سے استدلال کیا ہے۔

مسلم شریف کی پہلی حدیث میں یہ ہے

فجاء الر جل فقال یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم اشعر فحلقت قبل ان انحر فقال اذ بح ولا حر ج ثم جاء رجل آخر فقال یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم اشعر فنحر ت قبل ان ارمی فقال ارم ولا حر ج .

یعنی ایک آدمی نے آکر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھے احساس نہیں ہوا (یعنی میں بھول گیا) اور میں نے قربانی کرنے سے پہلے ہی سر کو منڈالیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جاؤ قربانی کرو کوئی گناہ نہیں ہے پھر ایک دوسرا آدمی آیا اور اس نے کہا کہ مجھے احساس نہیں اور ہوا میں نے رمی کرنے سے پہلے قربانی کردی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جاؤ رمی کرلو کوئی حرج نہیں۔

اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ لاحرج والی حدیث کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو ارکان میں ترتیب کو بھول جائیں یا جن کو مسائل کا علم نہ ہو۔

مسلم شریف کی دوسری حدیث میں یہ بات ذرا اور صاف ہے اس میں ہے کہ

فیقول القائل منھم یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی لم اکن اشعر ان الرمی قبل النحر فنحرت قبل الرمی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فارم ولا حرج.

یعنی کہنے والے نے یہ کہااے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جانتا نہیں تھا کہ رمی قربانی سے پہلے ہے تو میں نے رمی سے پہلے قربا نی کردی تو آپ نے فرمایا اب رمی کرلو کوئی حرج نہیں ہے اسی حدیث کے آخر میں ہے اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں فما سمعته یسئل یو مئذٍ عن امر مما ینسی المرأ ویجهل من تقدیم بعض الا مور قبل بعض واشبا ھها الا قال رسول الله صلی الله علیه وسلم افعلوا ذالک ولاحر ج

یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ سے جہالت یا بھول کر ارکان میں تقدیم وتاخیر ہونے کے بارے میں جو بھی پوچھ رہا تھا ان سب کو آپ ﷺ کا یہی جواب تھا افعلوا ذا لک ولا حرج یعنی اب کرلو اس کوتاہی کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں ہوا۔

مسلم شریف کی ایک روایت میں اس طرح ہے (یہ روایت بخاری میں بھی ہے)

فقام، الیه رجل فقال ما کنت احسب یا رسول الله ان کذا و کذا قبل کذا و کذا ثم جاء آخر فقال یارسول الله ﷺ : احسب ان کذاقبل کذا و کذا .

یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک آدمی بڑھا اور اس نے کہا کہ یا رسول ﷺ میں نہیں جانتا تھا کہ فلاں کام فلاں کام سے پہلے ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا افعل ولا حر ج اب کرلو کوئی حرج نہیں ہے پھر ایک دوسرا بڑھا اور اس نے بھی اسی طرح کی بات کی تو آپ نے اسکو بھی یہی جواب دیا۔

ناظرین مسلم شریف ہی میں یہ تمام احادیث ہیں مگر جامعہ سلفیہ کے مفتی صاحب نے مسلم شریف کی ان تمام احادیث سے آنکھیں بند کرلی ہیں حالانکہ مسلم شریف کی ان احادیث سے اصل مسئلہ پر خوب اچھی طرح روشنی پڑھ رہی ہے کہ احادیث میں جولاحرج ہے اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو جہالت کی وجہ سے یا بھول کر ارکان میں تقدیم وتاخیر کریں یہ حکم عام نہیں ہے اور نہ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو قصدا اور جان بوجھ کر حج کے ارکان کو مقدم ومؤخر کریں اگر جان بوجھ کر ایسا کیا گیا تو صحیح بات یہ ہے کہ جہاں دم واجب ہونے کی شکل بنے گی وہاں دم واجب ہوگا جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

اور یہ بات کہ لاحرج کا تعلق جاہل اور بھول جانے والے افراد سے ہے اسکی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کرنے والے مشاہیر صحابہ کرام میں سے کوئی نہیں تھا بلکہ جاہل اور اعرابی یعنی دیہاتی لوگ تھے جنہیں حج کے ارکان اور اس کے مسائل سے پوری واقفیت نہیں تھی اور یہی وجہ ہے کہ حدیث کی کسی کتاب میں ان پوچھنے والوں کے نام کا ذکر نہیں ملتا البتہ طحاوی میں اسامہ بن شریک وغیرہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوچھنے والے دیہاتی لوگ تھے ابن حجر فرماتے ہیں

لم اقف علی اسمه بعد البحث الشدید ولا اسم احد ممن سأل فی هذه القصة.......... لکن فی حدیث اسامة بن شر یک عند الطحاوی وغیره کان الا عر اب یسا لو نه.

یعنی مجھے بہت تلاش کے بعد بھی اس قصہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے والوں میں سے کسی کا نام نہیں معلوم ہوسکا البتہ طحا وی میں اسامہ بن شریک کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ دیہاتی تھے۔

دیہاتی لوگوں کو عام طور پر مسئلے مسائل کا علم نہیں ہوتا اور پھر حج کے مسائل جن میں بڑے بڑے لوگ اور اچھے خاصے اہل علم پریشا ن رہتے ہیں ان دیہاتیوں کی گرفت سے اگر باہر ہوں تو کون سے تعجب کی بات ہے جبکہ خود پوچھنے والے صاف صاف اپنی عدم واقفیت کا اظہار کرر ہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان احادیث پر امام بخاری نے جو باب باندھا ہے اس کا عنوان یہ ہے باب اذا رمی بعد ما امسی او حلق قبل ان تذبح ناسیاً او جاھلا۔

یعنی یہ باب اس مسئلہ کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ آدمی اگر مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یا بھول کر زوال کے بعد رمی کرے یا قربانی کرنے سے پہلے حلق کرائے تو اس کا کیا حکم ہے۔

اور پھر امام بخاری نے اس باب کے تحت حضرت عبداللہ بن عباس کی وہی حدیث ذکر کی ہے اور انہیں الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے جس کو جامعہ سلفیہ کے مفتی نے مسلم شریف سے اپنے فتوی میں نقل کیا ہے دیکھئے بخاری شریف کی حدیث یہ ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنھما ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قیل لہ فی الذبح والحلق والرمی والتقدیم والتاخیر فقال لا حرج .

اس حدیث سے امام بخاری جیسا محدث تو یہ سمجھ رہا ہے کہ اس میں جو حکم ہے وہ بھول جانے والے اور مسائل سے ناواقف شخص کے بارے میں ہے مگر جامعہ سلفیہ کے مفتی صاحب اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے اور سب کے لئے ہے اس عقل وعلم کے ساتھ شوق دامنگیر ہے فتوی دینے کا اور کبر وتعلی کا حال یہ ہے کہ فرمایا جاتا ہے کہ ائمہ کے مسالک اور اقوال الرجال کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے۔

بہر حال بخاری ومسلم کی ان احادیث کی روشنی مین معلوم ہوا کہ ارکان میں تقدیم وتاخیر اگر بھول اور ناواقفیت کی بنا پر ہوئی تب تو دم واجب نہیں ہے لیکن اگر کسی نے قصداً اور عمداً ایسا کیا ہے تو ان احادیث کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر دم ہے چنانچہ یہی بات موفق ابن قدامہ نے المغنی میں ذکر کی ہے فرماتے ہیں۔

قال : الاثرم عن احمد ان کان ناسیا او جاھلا فلا شئی علیہ وان کان عالما فلا لقولہ فی الحدیث لم اشعر

یعنی اثرم نے حضرت امام احمد سے یہ نقل کیا ہے کہ اگر حاجی ارکان میں تقدیم وتاخیر بھول کر کر ڈالے یا ناواقفیت کی وجہ سے اس سے تقدیم وتاخیر ہوگئی ہے تب تو اس پر کچھ واجب نہ ہوگا لیکن اگر اس نے جان بوجھ کر ارکان کو مقدم یا موخر کیا ہے تو اس پر اس شکل میں فدیہ ساقط نہ ہوگا اسے دم دینا ہوگا اس لیے کہ حدیث میں لم اشعر کا جو لفظ ہے اس کا یہ تقاضا ہے اور یہی بات امام طحاوی نے معانی الآثار میں بیان کی ہے اور حدیث میں جو لاحرج کا کلمہ ہے اس کی پوری وضاحت کی ہے اور دلائل کی روشنی میں یہ بتلایا ہے کہ یہ عدم حرج والی بات سب کو عام نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق جاہل اور ناسی سے ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کو اللہ ٹھنڈی رکھے اور انوار سے بھر دے وہ دینی شرعی مسائل میں بڑی چھان بین کرتے تھے

اور کتاب وسنت کے تمام ذخائر کو سامنے رکھ کر جو احوط اور اوفق بالعقل والنص بات ہوتی تھی اس کو اختیار کرتے تھے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ حج کے ارکان کو ترتیب کے ساتھ ادا کرنا چاہیے، اگر کسی نے قصداً اور عمداً خلاف ترتیب ارکان کی ادائیگی کی مثلاً قربانی سے پہلے بال منڈالیا تو اس پر دم ہوگا، حضرت امام ابوحنیفہؒ نے زیر بحث مسئلہ کو مختلف زاویہ سے دیکھا اور اس سلسلہ میں تمام احادیث کو نگاہ میں رکھا اور پھر یہ فیصلہ کیا کہ لاحرج والی حدیث کا تعلق ہر آدمی سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق مخصوص افراد یعنی جاہل اور بھول جانے والے لوگوں سے ہے۔

امام طحاویؒ نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ذکر کی ہے جس سے اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں ہے۔

عباداللہ وضع اللہ عزوجل الحرج والضیق تعلموا مناسکم فانھا من دینکم

یعنی اے اللہ کے بندو اللہ نے تم سے حرج اور تنگی کو ختم کر دیا ہے، تم لوگ ارکان حج کو سیکھو اس لئے کہ اس کا تعلق دین سے ہے۔

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے جو لاحرج فرمایا ہے اس کی وجہ اس پوچھنے والے دیہاتیوں کا جاہل ہونا اور مناسک حج سے بے خبر ہونا تھا اس لئے آپ ﷺ نے ان کو بطور خاص مناسک حج سیکھنے کا حکم فرمایا۔

اب آپ قرآن میں دیکھئے اللہ کا کیا ارشاد ہے۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے

ولاتحلقوا رؤسکم حتی یبلغ الھد ی محلہ اس آیت پاک میں صاف حکم موجود ہے کہ قربانی سے پہلے سر کا منڈانا جائز نہیں ہے۔ آیت کریمہ کا ترجمہ ہے۔ اے حاجیوں تم اپنے سروں کو مت منڈاؤ جب تک جانور قربان گاہ کو نہ پہنچ جائیں (اور ان کی قربانی بھی ہو جائے) اس ارشاد خداوندی میں صاف صاف اس کا حکم ہے کہ قربانی سے پہلے سر کا منڈانا جائز نہیں ہے (عذر کی حالت کی بات الگ ہے) اس سے بھی ارکان میں ترتیب کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے احادیث کو بھی نگاہ میں رکھا اور قرآن کے فرمان کو بھی نگاہ میں رکھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے فتویٰ کو بھی نگاہ میں رکھا جو لاحرج والی حدیث کے راوی ہیں، اور انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ حج ان عبادتوں میں سے ہے جن پر دین کی بنیاد قائم ہے اور وہ پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ کے لئے واجب ہے، اس اہم عبادت میں اس پہلو کو اختیار کیا جائے جس میں احتیاط زیادہ ہو، کہ عمر بھر میں ایک دفعہ کی جانے والی یہ عبادت جس کے لئے انسان کہاں کہاں سے اور کتنی مشقت اٹھا کر مکہ مکرمہ حاضر ہوتا ہے اس میں کسی نقصان کا شبہ نہ رہے، یہ احتیاط والا پہلو ہی اختیار کرنا جب کہ اس کی تائید قرآن واحادیث سے بھی ہو رہی ہے، عقل کا بھی تقاضا ہے، ہماری خواہش تھی کہ جامعہ سلفیہ کے مفتی صاحب کا فتویٰ حقائق اور دلائل کی روشنی میں ہوتا اور ان کے اہلحدیث ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ وہ تمام احادیث کو سامنے رکھ کر فتویٰ دیتے مگر افسوس انہوں نے بالکل چالو قسم کا فتویٰ دیا اور ان کے عدم احتیاط کا عالم یہ ہے کہ وہ فتح الباری کے جلد ثالث کے جس صفحہ کا حوالہ دے رہے ہیں اس میں یہ بحث قطعاً نہیں ہے، معلوم نہیں کہ مفتی صاحب نے کس عالم میں اور کہاں سے حوالہ نقل کیا ہے میں نے اس مسئلہ میں ذرا ز نفسی سے کام لیا اس لئے کہ ابن باز کے فتویٰ سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا جارہا ہے، حالانکہ ابن باز

دین وشریعت کے بارے میں بہت بے باک اور بہت غیر محتاط آدمی تھے ،ان کا علم بھی بہت نا پختہ تھا مگر شوق تھا مجتہد بننے کا ،انہیں کا فتویٰ محدث پرچہ ہی میں (غالباً ستمبر کے شمارہ میں) چھپا تھا کہ فرض نماز میں بھی امام کو قرآن دیکھ کر پڑھنا جائز ہے، حالانکہ کسی حدیث میں فرض نماز کے لئے یہ مسئلہ نہیں ہے عبادات کے بارے میں اس قسم کی سہولت پسندی کی روش سے عبادات کی روح ختم ہوتی جارہی ہے اور ہمارے سہولت پسند اور آزاد فکر نو جوانوں کی بہت غلط رہنمائی کی جارہی ہے والحمدللہ اولاً وآخراً وصلی اللہ علی النبی الکریم ۔

ضمیمہ: ازنورالدین نوراللہ الاعظمی

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

مولانا غازی پوری مدظلہ کا بسط وتفصیل سے محققانہ جواب ناظرین نے ملاحظہ فرمالیا جامعہ سلفیہ کے موصوف مفتی صاحب نے اپنے فتویٰ کے آغاز میں جس طنطنہ کا اظہار کیا تھا مولانا کی تحریر سے اس کی حقیقت واضح ہوگئی ، یہ مدعیان عمل بالحدیث جہل مرکب کے شکار ہوتے ہیں ،اپنی تولہ بھر کی علمی صلاحیت کے باوجود گفتگو کا انداز ایسا اختیار کرتے ہیں گویا یہ علم وتحقیق کے کوہ ہمالیہ ہیں اور اجتہاد کی پوری صلاحیت سے لیس ہیں، یہ کتاب وسنت کے ماہر ہیں اور اسلاف ان کی علم وتحقیق کے سامنے بونے ہیں میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ غیر مقلدین مسائل شرعیہ کے بیان کرنے میں کبھی مخلص نہیں ہوتے ہیں۔اور عوام کو حدیث کا نام لے کر دھوکہ دیتے ہیں فریب کرتے ہیں گمراہ کرتے ہیں اسی مسئلہ میں دیکھئے جامعہ سلفیہ کے موصوف مفتی نے ناواقف عوام کو کتنے فریب میں ڈالا ہے، اس نے مسلم شریف کی آخری حدیث سے استدلال کیا ہے، حالانکہ مسلم شریف میں اس باب کے شروع ہی کی تین حدیثوں میں صاف صاف یہ موجود ہے کہ جن کو حضور ﷺ جواب دے رہے تھے یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے صاف صاف آپ ﷺ سے عرض کردیا تھا کہ ہم سے نادانستگی میں ارکان میں تقدیم وتاخیر ہوگئی ہے۔ان معذوروں کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ چلو کچھ حرج نہیں ہے۔

مسلم شریف کی ان احادیث کو چھوڑ کر آخر والی مجمل حدیث کو ذکر کر کے یہ ظاہر کرنا کہ حدیث صرف یہی ہے عوام کو فریب میں ڈالنا اور غلط مسئلہ بتلا کر ان کی عبادتوں کو خراب کرنے کی ناروا کوشش ہے۔

پھر مفتی صاحب موصوف جو ایک نمبر کے اہلحدیث ہیں اور الجواب الصحیح کہنے والے بزرگ جو بہت پہنچے ہوئے اہلحدیث ہیں ان دونوں نے معلوم نہیں کس مصلحت سے یہاں بخاری شریف کی مراجعت نہیں کی؟ آخر بخاری شریف جو اول نمبر کی حدیث کی کتاب ہے اس سے اعراض ان مفتیوں نے کیوں کیا؟ بخاری بخاری کا شور مچانے والوں نے آخر اس مسئلہ میں بخاری شریف کی احادیث سے کیوں غض بصر کیا، اس لئے کہ مزاج میں انصاف پسندی نہیں ہے، دھاندلی کا دھندا کرنا مزاج بنا ہوا ہے، بخاری شریف کی طرف رجوع کرتے تو مفتی صاحب موصوف نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے اس کی بھی حقیقت ظاہر ہوجاتی اور اصل مسئلہ پر بھی خوب روشنی پڑجاتی۔اس وجہ سے جامعہ سلفیہ بنارس کے مفتی صاحب اور ان کو الجواب الصحیح کہنے والے مؤید نے بخاری شریف کو اس موقع پر بالکل نظر انداز کردیا ،انہوں نے پہلے نمبر پر بخاری شریف کو ضرور دیکھا ہوگا، ان کے اہلحدیث ہونے اور منصب افتاء کے ذمہ دارانہ عہدہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اہلحدیث لوگ جو حدیث ہی کی روشنی میں فتویٰ دیتے ہیں وہ سب سے پہلے حدیث کی سب سے صحیح کتاب کی طرف رجوع کریں ،اس

لئے یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے کہ انہوں نے بخاری کو ضرور دیکھا ہوگا، مگر چونکہ مسلم شریف کی جس حدیث سے مفتی صاحب موصوف نے اس مسئلہ میں استدلال کیا ہے امام بخاری نے اس کی حقیقت ظاہر کردی ہے کہ اس کا تعلق عام لوگوں سے نہیں ہے بلکہ بھول جانے والے اور ناواقف عوام سے ہے اور مفتی صاحب کو اس صحیح بات کو چھپانا تھا اس وجہ سے انہوں نے بخاری کا دامن جھٹک دیا۔

ناظرین اس سے اندازہ لگائیں کہ غیر مقلدین حضرات جہاں بخاری بخاری کی رٹ لگاتے ہیں اس کی حیثیت صرف پروپیگنڈہ کی ہوتی ہے نہ یہ غیر مقلدین بخاری ساتھ مخلص ہیں نہ مسلم کے ساتھ، اخلاص اور دینداری سے محروم یہ جماعت ہے۔

اللہ ان ائمہ کرامؒ پر اپنی رحمتوں کی بے انتہا بارش فرمائے جنہوں نے ہمیں راہ رشد وہدایت دکھائی، اور جن کی کاوشوں اور کوششوں سے دین محفوظ ہے اور باطل اپنی ہزار کوششوں کے باوجود ائمہ ان کرام کے فیض وکرم کے طفیل امت مسلمہ کو راہ حق وصواب سے منحرف اور گمراہ نہیں کرسکتا۔

مولانا غازی پوری کی تحریر کا مقصد صرف یہ ہے کہ اہلحدیث کہلانے والے مفتیوں کو فتوی والے مسئلہ سے متعلق تمام احادیث کو پیش نظر رکھنا چاہئے اور ان سے جو صحیح بات معلوم ہو اس پر فتوی کا مدار رکھنا چاہئے۔ دوسرے ائمہ کا کیا مسلک ہے اس سے آپ کو مطلب نہ ہونا چاہئے، اس وجہ سے کہ بقول آپ کے جس مسئلہ میں ارشادات نبویہ کتب حدیث میں صراحت کے ساتھ منقول ہوں اس امر اور معاملہ میں حدیث نبوی ہی کو اپنانا چاہئے ائمہ کے مسالک اور اقوال الرجال کے پیچھے نہیں پڑنا چاہئے۔

آمین کے بارے میں
امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا مسلک

مکرمی مدیر زمزم جناب مولانا محمد ابوبکر صاحب غازی پوری دام مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

شافعی لوگ آمین زور سے کہتے ہیں، مگر مجھ سے ایک صاحب نے کہا کہ امام شافعی نے زور سے آمین کہنے والے قول سے رجوع کرلیا تھا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو براہ کرم مجھے اس کتاب کا حوالہ دیں جس میں امام شافعی کا رجوع ثابت ہو، نیز یہ بھی فرمائیں کہ امام مالکؒ کا اس بارے میں یعنی آمین کہنے کے بارے میں صحیح مسلک کیا ہے براہ کرم جلدی جواب سے نوازیں تو کرم ہوگا، زمزم پابندی سے مل رہا ہے

والسلام　　　　شمس الحق کرلا بمبئی

زمزم:

عام طور پر جیسا کہ آپ کو بھی علم ہوگا، شافعی حضرات نماز میں آمین زور سے کہتے ہیں، مگر یہ امام شافعیؒ کا مسلک نہیں ہے، امام شافعی شروع میں بلاشبہ مقتدی کے لئے زور سے آمین کہنے کے قائل تھے مگر بعد میں ان کی اس بارے میں تحقیق جب آگے بڑھی تو انہوں نے اس قول سے رجوع کرلیا تھا، اور نماز میں مقتدی کے لئے سراً آمین کہنے کا قول اختیار کرلیا تھا۔ اس بارے میں اظہار التحسین (مؤلفہ مولانا محمد حبیب اللہ ڈیروی جو پاکستانی عالم ہیں) میں پوری تحقیق ہے، میں اس کتاب سے چند حوالے نقل کرتا ہوں۔

امام شافعیؒ کی کتاب ''کتاب الام'' بہت مشہور ہے، اس میں لکھا ہے

قال الشافعیؒ فاذافرغ من قرأۃ ام القرآن قال آمین ورفع بها صوته ليقتدى به من كان خلفه واذاقال قالوها واسمعوا انفسهم ولااحب ان يجهروا بها

(ج ا ص ۹۵ طبع بولاق)

امام شافعیؒ نے کہا کہ جب امام سورۃ فاتحہ سے فارغ ہو تو آمین بلند آواز سے کہے تا کہ مقتدی بھی اس کی اقتداء میں آمین کہیں اور جب مقتدی آمین کہیں گے تو اپنے کو سنائیں گے مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ مقتدی زور سے آمین کہیں۔

امام ابوالقاسم عبدالکریم بن محمد الرافعی لکھتے ہیں

واما المأموم فقد نقل عن القديم انه يؤمن جهراً وعن الجديد انه لايجهر (فتح العزيز شرح الوجيد ص ۲۴۸ ج ۳)

یعنی امام شافعی کا مقتدی کے بارے میں قدیم قول یہ تھا کہ وہ آمین زور سے کہے گا اور جدید قول یہ ہے کہ وہ زور سے آمین نہیں کہے

گا۔

حافظ ابن کثیر شافعی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں

فان أمن الامام جهراً فالجديد انه لا يجهر المأموم. (ج ١ ص ٣١)

یعنی اگر امام زور سے آمین کہے تو مقتدی زور سے آمین نہ کہیں گے یہ امام شافعی کا جدید قول ہے

ان حوالوں سے معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ مقتدی کے لئے زور سے آمین کہنے کو پسند نہیں فرماتے تھے اور پہلے قول سے رجوع کر لیا تھا

۔

اب معلوم نہیں کہ امام شافعیؒ کے اس رجوع کے بعد بھی شوافع کی مساجد میں مقتدی زور سے آمین کس کی تقلید میں کہتے ہیں ،حالانکہ شافعیوں کی مشہور کتاب شرح مہذب میں صاف لکھا ہے۔

ليس للمفتي ولا للعامل المنتسب الى مذهب الشافعي في مسئلة القولين ان يعمل بماشاء منها بغير نظر بل عليه في القولين العمل بآخرهما ان علمه والا فبالذي رجحه الشافعي (ج ١ ص ٦٨)

شافعی مذہب کے مفتی اور اس پر عمل کرنے والے کے لئے جائز نہیں ہے کہ جس مسئلہ میں امام شافعیؒ کا دو قول ہو تو ان میں سے جس پر چاہے عمل کرے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ دونوں قولوں میں سے آخر والے پر عمل کرے ورنہ اس پر جس کو امام شافعی نے ترجیح دی ہے۔

امام شافعیؒ کا آخری قول بھی مقتدی کے لئے عدم جہر کا ہے اور اسی آخری قول کو امام صاحب نے ترجیح بھی دی ہے۔جیسا کہ پہلے کتاب الام والی عبارت میں ان کا قول ولا احب ان تجھر وابھا (مجھے پسند نہیں ہے کہ مقتدی آمین کے ساتھ جہر کریں) گزر چکا ہے۔

امام مالکؒ کا قول بھی امام ابوحنیفہؒ کے قول کی طرح ہے یعنی امام اور مقتدی آمین آہستہ کہیں گے۔ابن العربی مالکی ترمذی کی شرح عارضۃ الاحوذی میں فرماتے ہیں۔

ولا يجهر بها الامام ولا المأموم

یعنی آمین کو نہ امام زور سے کہے گا اور نہ مقتدی۔

بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امام مالکؒ کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ امام آمین بالکل نہیں کہے گا،آمین صرف مقتدی کہیں گے اور آہستہ کہیں گے،بہر حال امام مالکؒ امام یا مقتدی کے لئے جہراً آمین کے قائل نہیں ہیں ان کا مذہب سراً آمین کہنے کا ہے

محمد ابوبکر غازی پوری

ایک رکعت وتر کا مسئلہ

محترمی ومکرمی حضرت مولانا محمد ابوبکر غازی پوری دامت برکاتہم تحیۃ قلبیۃ وسلام علیکم وعلی من لدیکم

مزاج مبارک

زمزم پرچہ کے مطالعہ کی پابندی سے سعادت حاصل ہے۔آپ کے محقق قلم کی ہرتحریرنظرکشا ہوتی ہے اور جس مسئلہ پر آپ قلم اٹھا تے ہیں وہ آئینہ کی طرح صاف ہوجاتا ہے۔اللہ آپ کے سایہ کو دراز کرے اور زمزم کی عمر کو طویل ومدید کرے۔

اس سال بندہ کو عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی وللہ الحمد والشکر حرم مکہ کے اماموں کو میں نے ایک رکعت وتر پڑھتے دیکھا،میرے لئے یہ بالکل عجیب بات تھی بڑا عجیب سا لگ رہا تھا،مگر لوگوں سے جب بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ حرم شریف کے ائمہ خلاف سنت کام نہیں کریں گے،ایک رکعت وتر بھی سنت ہے،براہ کرم اس پر روشنی ڈالیں،اگر ایک رکعت وتر بھی سنت ہے تو اس کو واضح کریں۔

حبیب اللہ داؤد احمد آباد

زمزم:

زمزم کے بارے میں آپ کے تاثرات سے خوشی ہوئی،دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اخلاص کے ساتھ کام کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔اور قلم سے وہی بات نکلے جو حق ہو اور قلم گروہی عصبیت کا شکار نہ ہو۔

جی ہاں حرم شریف کے ائمہ ایک رکعت بھی وتر پڑھتے ہیں،تین بھی،اس طرح پڑھتے ہیں کہ قعدہ اولیٰ نہیں کرتے یعنی مسلسل تین رکعت پڑھتے ہیں اور تیسری رکعت کے آخر میں بیٹھتے ہیں اور التحیات اور درود شریف پڑھ کر سلام پھیرتے ہیں اور یہ ایک رکعت بھی اس طرح پڑھتے ہیں کہ بیس رکعت تراویح پوری کرلینے کے بعد دو رکعت پڑھتے ہیں اور سلام پھیرتے ہیں پھر ایک رکعت الگ سے پڑھتے ہیں احادیث میں پانچ،سات اور نو رکعت وتر کا بھی ذکر ہے،ائمہ حرم کبھی ۵،۷اور نو رکعت وتر نہیں پڑھتے جبکہ یہ روایتیں بھی صحیح ہیں ائمہ حرم نے ان روایتوں کو کیوں چھوڑ رکھا ہے اس کی وجہ ہمیں اب تک معلوم نہ ہوسکی۔

ائمہ حرم کا اس اعتبار سے ہمارے دلوں میں احترام ہے کہ ان کو حرم پاک سے نسبت حاصل ہے مگر ان کے ائمہ حرم ہونے کی وجہ سے ان کا کوئی عمل ہمارے لئے حجت نہیں ہوگا،ہمارے لئے حجت کتاب وسنت اور صحابہ کرامؓ کا اسوہ ہے۔

کتا ہمارے یہاں بھی ہوتا ہے اور ایک کتا مدینہ پاک کی گلیوں میں بھی گھومتا نظر آتا ہے،مدینہ منورہ کے کتا کا لعاب بھی اسی طرح نجس ہے جس طرح ہمارے یہاں کے کتے کا لعاب نجس ہے مگر چونکہ وہ مدینہ پاک کا کتا ہے اس وجہ سے جس نگاہ سے اسے دیکھیں گے اپنے یہاں کے کتے کو اس نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے،پیارے رسول ﷺ کے شہر کی گلیوں کا کتا بھی ہمارے لئے پیارا ہے۔اسلئے کہ اسکو ہمارے رسول پاک کے شہر پاک سے نسبت حاصل ہے،مگر اس نسبت کی وجہ سے اس کے لعاب کا حکم نہیں بدلے گا،اس کا لعاب بھی اسی طرح نجس ہے جس طرح اور کتوں کا لعاب نجس ہوتا ہے۔

پہاڑ ہمارے یہاں بھی پایا جاتا ہے، مگراس پر کبھی محبت کی نگاہ ہم نہیں ڈالتے مگر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے راستوں میں جب پہاڑ نظر آتے ہیں تو ہم ان پر عقیدت کی نگاہ ڈالتے ہیں اور محبت سے انہیں دیکھتے ہیں۔

جبل ثور اور جبل احد پر جب ہماری نگاہ پڑتی ہے تو ہمارے دل کی دنیا میں جذبات کا طوفان اٹھتا ہے اور شوق یہ ہوتا ہے کہ ان پہاڑوں کے ایک ایک پتھر کو اپنی نگاہوں کا حصہ بنالیں، یہ شوق فراواں کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اسلئے کہ ان پہاڑوں کو ان جگھوں سے نسبت حاصل ہے جہاں ہمارے رسول ﷺ چلتے تھے پھرے تھے رہے تھے مگر مدینہ ومکہ کے پہاڑ بھی بس پہاڑ ہی ہیں جیسے ہمارے یہاں کے پہاڑ ہیں۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ائمہ حرم کو ہم اپنے دلوں میں اس لئے جگہ دیتے ہیں کہ ان کو حرم پاک سے نسبت حاصل ہے، احترام ہم اس نسبت کا کرتے ہیں یہی ائمہ اگر کسی اور جگہ کے امام ہوتے تو ہم ان کو اس نگاہ سے نہ دیکھتے جس نگاہ سے انہیں اب دیکھتے ہیں۔

اس لئے ائمہ حرم کا احترام تو ہم ضرور کریں گے مگر دینی مسائل میں ہم ان کو حجت نہیں بنائیں گے ہمارے لئے حجت جیسا کہ میں نے عرض کیا کتاب وسنت اور صحابہ کرامؓ کے عمل ہونگے یا وہ اسلاف کرام اور ائمہ دین جنہوں نے کتاب وسنت ہی کی روشنی میں اپنی زندگی کے نظام کا خاکہ مرتب کیا ہے، اور جنکی زندگی لوگوں کو راہ مستقیم پر چلانے کے لئے کتاب وسنت اور آثار صحابہ کرامؓ واسوۂ صحابہؓ میں غور وخوض میں گزری، جن کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ دین کی جو فہم اور کتاب وسنت میں بصیرت کی جو سعادت انہیں حاصل تھی بعد کے ادوار کے لوگوں میں اس کا نام ونشان بھی نہیں رہا خواہ ان میں کا کوئی اپنے وقت کا کتنا بڑا بھی علامہ ہو

ایک رکعت وتر کا ذکر احادیث کی کتابوں میں ملتا ہے مگر حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ حکم پہلے تھا اب منسوخ ہے اور ان کی دلیل یہ حدیث ہے۔

عن ابی سعید ان رسول اللہ ﷺ نھی عن البیتراء ان یصلی الرجل واحدۃ یوتر بہ

یعنی حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیترا (دم بریدہ، دم کٹی) نماز سے منع فرمایا ہے، یعنی آدمی ایک رکعت نماز سے وتر پڑھے

احادیث اگر ایسی ہوں کہ ان میں سے بعض سے کسی چیز کا جواز معلوم ہوتا ہے اور بعض سے اس کی ممانعت معلوم ہوتی ہے تو فقہاء عام طور پر (اگر دونوں طرح کی احادیث صحیح ہیں) ممانعت والی روایت کو اباحت والی روایت پر ترجیح دیتے ہیں، اسی میں احتیاط بھی ہے۔

بخاری شریف اور مسلم اور احادیث کی دیگر کتابوں میں حضرت عائشہؓ کی مشہور حدیث جس میں ہے کہ "ثم یصلی ثلاثا" یعنی آنحضور اکرم ﷺ (تہجد کی چار چار رکعت پڑھ کر) تین رکعت وتر پڑھتے تھے۔

نسائی شریف اور موطا امام محمد میں حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث ہے

ان رسول اللہ ﷺ لایسلم فی رکعتی الوتر

کہ آنحضور اکرم ﷺ وتر کی پہلی دو رکعتوں میں جب بیٹھتے تو سلام نہیں پھیرتے تھے۔

امام حاکم نے اسی روایت کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے

کان رسول الله ﷺ لایسلم فی الرکعتین الاولیین من الوتر.

یعنی آنحضور ﷺ وتر کی پہلی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے۔

امام حاکم نے اسی روایت کو ایک اور سند سے نقل کیا ہے جس کے الفاظ اور بھی واضح ہیں۔

کان رسول الله ﷺ یوتر بثلاث لایسلم الافی آخرھن وھذاوتر امیر المؤمنین عمرؓ بن الخطاب وعنه اخذہ اھل المدینه

یعنی رسول اللہ ﷺ تین رکعت وتر پڑھتے تھے اور آخر میں سلام پھیرتے تھے حضرت عمر فاروقؓ بھی اسی طرح وتر پڑھتے تھے اور انہیں سے اہل مدینہ نے بھی یہ وتر لیا۔

ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ آنحضور ﷺ وتر کی پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھتے دوسری رکعت میں قل یاایھا الکافرون اور تیسری رکعت میں قل ھو اللہ احد پڑھا کرتے تھے۔

موطا امام محمد میں حضرت عمر کا یہ فرمان منقول ہے حضرت عمر فاروقؓ فرماتے تھے کہ مجھے سرخ سرخ اونٹ کے بدلے میں بھی پسند نہیں ہے کہ میں وتر کو تین رکعات کے ساتھ چھوڑوں۔

بعض روایتوں میں وتر کی نماز کو مغرب کی نماز کی طرح بتلایا گیا ہے، اس تشبیہ سے بھی متعین ہے کہ وتر کی نماز تین ہی رکعت ہے ،موطا امام محمد میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ اثر منقول ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ وتر کی نماز تین رکعت ہے مغرب کی نماز کی طرح۔اسی طرح ایک اثر موطا امام محمد میں حضرت عبداللہ بن عباس کا بھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ''الوتر کصلوٰۃ المغرب ''یعنی وتر کی نماز مغرب کی نماز کی طرح ہے۔

موطا امام محمد میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ فرمان بھی منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ''ما اجزأت رکعۃ واحدہ قط''یعنی ایک رکعت نماز کبھی کفایت نہیں کرے گی

حضرت عائشہؓ جو حضور اکرم ﷺ کی تہجد اور وتر کی نمازوں کی سب سے زیادہ واقف کار تھیں (اس لئے کہ آنحضور ﷺ یہ نمازیں گھر میں پڑھا کرتے تھے) وہ فرماتی ہیں ان رسول اللہ ﷺ لایسلم فی رکعتی الوتر یعنی آنحضور اکرم ﷺ وتر کی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرا کرتے تھے، اور میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ جب جواز اور ممانعت دونوں کو بتلانے والی احادیث میں تعارض ہوگا تو ممانعت والی احادیث کو علماء ترجیح دیتے ہیں مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت مکحول کا یہ اثر ہے فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے وتر کی تین رکعتیں پڑھیں اور ان رکعتوں میں سلام سے فصل نہیں کیا مصنف ابن ابی شیبہ میں اسی طرح کی بات حضرت علی سے بھی منقول ہے......مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت حسن سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ

اجمع المسلمون ان الوتر ثلاث لایسلم الافی آخرھن

یعنی مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ وتر کی نماز تین رکعتیں ہیں اور آخر میں سلام ہے۔ میں نے بہت اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ چند احادیث اور آثار پیش کئے ہیں ورنہ تو اس موضوع پر ایک دفتر تیار ہوسکتا ہے...... جو لوگ ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں وہ ثابت نہیں کر سکتے کہ آنحضور اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں کبھی وتر کو ایک رکعت پڑھا ہو، حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ امام مالک نے تین رکعت وتر کو اسلئے اختیار کیا تھا کہ آنحضور ﷺ سے ایک روایت وتر کا پڑھنا ثابت نہیں ہے، اور آنحضور ﷺ کی ہی سنت زیادہ حقدار ہے کہ اس کی اتباع کی جائے (۱)

(۱) مالکیہ کی مشہور کتاب الکافی میں ہے ولا لکن الذی اختصارہ مالک اولیٰ لانہ ما یحفظ احد عن النبی ﷺ أنہ اوتر بواحدۃ وسنۃ احق ان تمثل (ج ۱ ص ۲۵۹) یعنی امام مالک نے جو تین رکعت وتر کا قول اختیار کیا ہے وہی اولیٰ ہے اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ سے ایک رکعت وتر پڑھنا ثابت نہیں ہے آنحضور اکرم ﷺ کی سنت کا حق زیادہ ہے کہ اسے اختیار کیا جائے۔

آنحضور اکرم ﷺ کے متعدد اصحابؓ سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ انہوں نے وتر کی نماز کو مغرب کی نماز کے ساتھ تشبیہ دی ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس طرح مغرب کی نماز پڑھی جاتی ہے وتر کی نماز بھی اسی طرح ہے اور اسی کیفیت کے ساتھ ہے واللہ اعلم بالصواب .... محمد ابوبکر غازی پوری

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ ائمہ حرم کے عمل کو دینی و شرعی مسلک میں حجت نہیں بنایا جا سکتا اگر ان کا عمل کتاب وسنت سے مؤید نہیں ہے تو اس کو بلا تکلف رد کر دیا جائے گا۔ ان ائمہ حرم نے آج کل بہت سی بدعتیں ایجاد کر لی ہیں مثلاً وتر کی نماز میں بہت طویل دعائیں مانگنا چیخنا چلانا، گا گا کر دعائیں مانگنا، اس طرح کی آنحضور ﷺ سے دعا ہرگز ثابت نہیں ہے، مگر ائمہ حرم خوب کرتے ہیں اور کوئی ابن باز کبھی کھڑا نہیں ہوا کہ اس خلاف سنت عمل سے ان کو روکے۔

اسی طرح جمعہ کا خطبہ ان کا بہت طویل ہوتا ہے، نماز مختصر اور خطبہ طویل یہ آنحضور کی سنت نہیں ہے مگر ائمہ حرم یہ خلاف سنت خطبہ دیتے ہیں، ائمہ حرم میں

سے بعض لوگ وہ بھی ہیں جن کا عمل یہ ہے کہ وہ رکوع سے اٹھ کر گردن کے قریب ہاتھ باندھ لیتے ہیں یہ ابن باز کی تقلید ہے آنحضور ﷺ کی یہ سنت نہیں ہے نہ کسی صحابی کا یہ عمل تھا اور نہ ائمہ دین میں سے کوئی اس کا قائل ہے یہ ابن باز کی ایجاد ہے اور ان کی بدعت ہے۔ ائمہ حرم کا کوئی کام محض ان کے ائمہ حرم ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے حجت نہیں ہوگا۔

محمد ابوبکر غازی پوری

خط اور اس کا جواب

کیا بخاری میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کی روایت ہے؟

محترم حضرت مولانا محمد ابوبکر غازی پوری صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

گزارش خدمت یہ ہے کہ بخاری شریف میں کوئی روایت ہے جس میں نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کا حکم ہو۔ براہ کرم آگاہ کریں

والسلام

محمد یحیٰ نظام آباد اعظم گڑھ

زمزم:

میری نگاہ سے بخاری میں ایسی کوئی روایت نہیں گزری جس میں یہ وضاحت اور صراحت ہو کہ نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنا چاہئے ۔ بخاری شریف میں جو اس بارے میں روایت ہے وہ یہ ہے۔

عن ابی حازم عن سهل بن سعدو قال ، کان الناس یومرون ان یضع الرجل الید الیمنیٰ علی ذراعه الیسریٰ فی الصلوٰۃ

یعنی ابو حازم سہل بن سعد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے کہ لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ نماز میں آدمی داہنا ہاتھ اپنے بائیں ''ذراع'' پر رکھے۔

بخاری شریف میں نماز میں ہاتھ باندھنے کی یہی ایک روایت ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس میں یہ بھی تصریح نہیں ہے کہ حکم دینے والا کون تھا، لوگوں نے قیاس کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو حضورﷺ ہی حکم دیتے تھے اس لئے حضورﷺ ہی مراد ہونگے ، بہر حال اس میں نہ حکم دینے والے کی تصریح ہے اور نہ ہاتھ کہاں رکھا جائے اس کا کوئی ذکر ہے، بلکہ بخاری سے تو یہ بھی نہیں پتہ چلتا ہے کہ یہ حضورﷺ کی حدیث ہے بھی کہ نہیں ہے یعنی قطعیت کے ساتھ اس کو حضورﷺ کا ارشاد کہنا بھی مشکل ہے اس لئے کہ خود ابو حازم جو حضرت سہل بن سعد سے اس کو روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نہیں سمجھتا ہوں مگر یہ کہ حضرت سعد اس بات کو حضورﷺ کی طرف منسوب کرتے تھے یعنی ابو حازم کو اس بات کے محقق ہونے میں کہ یہ حضورﷺ کا ارشاد ہے یا نہیں یقین کامل نہیں ہے

،ورنہ وہ یہ نہ فرماتے امام بخاری نے ان کا قول جو نقل کیا ہے وہ یہ ہے۔

قال ابوحازم لااعلمہ الاینمی ذلک الی النبی ﷺ

اس کا ترجمہ اوپر گزر چکا ہے اور امام بخاری نے اس کے بعد جو بات کہی ہے اس سے تو اس روایت کا مرفوع ہونا اور بھی مشکوک ہو تا ہے، یہ روایت مرسل ہو جاتی ہے، امام بخاری فرماتے ہیں **قال اسماعیل ینمی ذلک ولم یقل ینمی**

یعنی اسماعیل اس روایت کو بجائے ینمی کے یُنمی بصیغہ مجہول روایت کرتے تھے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس بات کو حضور کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، یعنی منسوب کرنے والے کا پتہ بھی نہیں ہے کہ وہ کون ہے،اس لئے یہ روایت مرفوع بھی نہیں رہی مرسل ہوگئی ابن حجر فرماتے ہیں کہ اسماعیل کی روایت کی بنا پر **فیکون مرسلالان اباحازم لم یعین عن فمالہ**

یعنی اب یہ روایت مرسل ہو جائے گی اس لئے کہ ابو حازم نے یہ متعین نہیں کیا ہے کہ اس روایت کو حضور کی طرف منسوب کرنے والا کون ہے

یعنی اب یہ روایت احناف اور مالکیہ کے علاوہ عام طور پر محدثین کے نزدیک تن تنہا قابل احتجاج بھی نہیں رہے گی۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ بخاری کی جس روایت سے سینہ پر ہاتھ باندھنا بدنا ھنا چاہا ہے وہ ان کے اصول پر قابل حجت بھی نہیں قرار پائی ہے اس لئے کہ ان کا مذہب ہے کہ مرسل روایت قابل احتجاج نہیں ہوتی ہے۔

بہر حال اتنا تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ اس روایت میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کا کہیں ذکر نہیں ہے اب جو لوگ کہتے ہیں کہ بخاری سینہ پر ہاتھ باندھنے کی روایت ہے وہ لوگ کتنے سچے ہیں اس بارے میں زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے بعض غیر مقلدین نے بخاری کی اس حدیث سے سینہ پر ہاتھ باندھنے کو اس طرح ثابت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کو جیسا کہ بخاری کی حدیث میں ہے اس کا حکم دیا جاتا تھا کہ وہ اپنا داھنا ہاتھ بائیں ذراع پر رکھیں اور ذراع کہتے ہیں بیچ کی انگلی کے سرے سے لیکر کہنی تک کے حصہ کو اور اس طرح اگر ہاتھ باندھا جائے تو سینہ ہی پر ہاتھ پہنچیگا زیر ناف اس صورت میں نہیں جائے گا۔

مگر یہ طرز استدلال بالکل بچوں والا ہے عقل سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہے یہاں ذراع سے کہنی تک پورا حصہ مراد نہیں ہے بلکہ دوسری احادیث کی روشنی میں اس سے مراد کف کو کف پر رکھنا یا کلائی کو کلائی پر رکھنا ہے چنانچہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ داہنے ہاتھ کو بائیں ہتھیلی کی پشت پر رکھتے تھے اور بعض حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بائیں ہاتھ کے گٹے پر رکھتے تھے۔ذراع بول کر یہاں یہی مراد لیا گیا ہے جیسے یمین کہتے ہیں پورے دائیں ہاتھ کو یا ید کہتے ہیں پورے ہاتھ کو مگر پورا ہاتھ کوئی نہیں مراد لیتا بلکہ سب یہی کہتے ہیں کہ کل بول کر حدیث پاک میں جز یعنی ہاتھ کے شروع کا حصہ یعنی کلائی تک کا حصہ مراد لیا گیا ہے حافظ ابن حجر فرما تے ہیں۔

ابھم موضعہ من الذراع وفی حدیث وائل عندابی داؤد والنسائی ثم وضع یدہ الیمنی علی ظھر کفہ الیسریٰ والرسغ والساعد ج ۲ ص ۲۲۴

یعنی بخاری شریف کی حدیث میں زراع کی جگہ مبہم ہے کہ اس کے کون سے حصہ پر داہنا ہاتھ رکھا جاتا تھا، تو اس کی شرح ابو داؤد اور نسائی کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ کی کلائی اور ہتھیلی کی پشت پر رکھتے تھے۔

اور اگر کسی کو یہی اصرار ہو کہ نہیں صاحب حدیث پاک میں ذراع سے مراد پورے ہاتھ کی کہنی تک کا حصہ ہے تو پھر ہم اس سے سوال کریں گے کہ بعض احادیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد میں بیٹھتے تھے تو اپنا ذراع اپنے گھٹنے پر رکھتے تھے وہ حدیث یہ ہے۔

عن مالک بن نمیر الخزاعی عن ابیه قال رأیت النبی صلی الله علیه وسلم واضعا ذراعه الیمنی علی فخذه الیمنی رافعا اصبعه السبابة حناها شئیا (ابو داؤد)

یعنی مالک بن نمیر الخزاعی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے والد نے فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ اپنا داہنا ذراع اپنی ران پر رکھے ہوئے تھے اور اپنی سبابہ انگلی کو اٹھاتے ہوئے تھے اور آپ نے اسکو تھوڑا سا جھکا کر رکھا تھا دیکھئے اس حدیث میں صاف ہے کہ آپ ﷺ نے اپنا داھنا ذراع اپنی بائیں ران پر رکھا تھا مگر کوئی بھی یہ نہیں کہے گا کہ یہاں ذراع سے مراد پورا کہنی تک کا حصہ ہے پس جس طرح یہاں ذراع سے مراد صرف کف دست ہے اسی طرح سے بخاری والی روایت میں بھی ذراع سے مراد پورا کہنی تک کا حصہ نہیں بلکہ صرف کلائی تک کا حصہ ہے امید ہے کہ آپ کو اس بارے میں اب کوئی شبہ باقی نہ ہوگا اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بخاری میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کی روایت ہے اس کی حقیقت آپ نے جان لی ہوگی۔

غیر مقلدین حضرات کی باتیں عموماً ہوائی ہوتی ہیں اس کی تحقیق علماء سے کرنا ضروری ہے آپ حضرات اس کا خیال رکھا کریں۔

والسلام محمد ابوبکر غازی پوری

نوٹ: ارمغان حق جلد اول میں نماز میں ہاتھ کہاں باندھا جائے اس پر مضمون ہے ملاحظہ فرمائیں۔

مقتدی رکوع میں امام کو پائے
تو مقتدی کی وہ رکعت شمار ہوگی یا نہیں؟

محترم جناب مدیر زمزم صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

بندہ کی نظر سے ایک کتاب نماز محمدی گزری جو کسی ابو سالم محمد اسماعیل غیر مقلد عالم کی تصنیف ہے انہوں نے اس کتاب میں ایک مسئلہ یہ لکھا ہے کہ امام کے ساتھ رکوع میں ملنے پر رکعت شمار نہ کریں برائے کرم اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں۔

ذاکر حسین مؤناتھ بھنجن

زمزم:

آپ کا خط بڑا طویل تھا میں نے آپ کا سوال نقل کر دیا ہے جواب ملاحظہ فرمائیں۔

جب کسی مسئلہ میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہو تو وہ مسئلہ اجماعی ہوتا ہے اور اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اس کے خلاف زبان کھولنا بڑی جرأت کی بات ہے۔

آپ نے جس مسئلہ کا ذکر کیا ہے وہ چاروں ائمہ کے درمیان متفق علیہ مسئلہ ہے یعنی امام اعظم ابوحنیفہ امام مالک امام شافعی امام احمد بن حنبل سب اسی کے قائل ہیں کہ اگر تکبیر تحریمہ کہہ کر مقتدی نے امام کو حالت رکوع میں پالیا تو مقتدی کی وہ رکعت درست ہوگی اس کا اعادہ نہیں ہوگا اب اگر کوئی اس اجماعی مسئلہ کے خلاف آواز بلند کرے تو اس کی طرف اہل عقل توجہ کرنا گوارہ نہیں کریں گے غیر مقلدین حضرات کا عام شیوہ یہی ہے کہ وہ اجماعی مسئلہ میں زبان کھول کر اور اس کی مخالفت کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں ان حضرات کو اتنا بھی شعور نہیں ہوتا کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ائمہ اربعہ کا علم شریعت آج کے ہم جیسے ناخواندہ لوگوں سے بہت بڑھا ہوا تھا اور نماز جیسی اہم عبادت کے بارے میں ان کا علم ہمارے علم سے ہزار گنا بلکہ لاکھ گنا زیادہ تھا، انہیں خوب معلوم تھا کہ رکوع میں امام کو پالینے والے مقتدی کی وہ رکعت شمار ہوگی یا نہیں اب اگر یہ ائمہ فقہ وحدیث یہ کہیں کہ ایسے مقتدی کی وہ رکعت شمار ہوگی تو ان کے مقابلہ میں اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت وہی کر سکتا ہے جو دین وشریعت میں ان کے مقام ومرتبہ سے بالکل ناواقف ہو یا پھر وہ حد درجہ خود پسندی کا شکار ہو۔

ائمہ اربعہ کا یہ اتفاقی مسئلہ ان کی ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ متعدد احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے فقہ حنبلی کی مشہور کتاب المغنی لابن قدامہ میں یہ مسئلہ لکھا ہے ومن ادرک الامام فی الرکوع فقد ادرک الرکوع، اگر کوئی شخص امام کو حالت رکوع میں پائے تو اس نے رکوع کو پالیا یعنی اس کی یہ رکعت کامل ہوگی پھر اس مسئلہ کی تائید میں سنن ابوداؤد کی یہ حدیث نقل کی ہے لقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم من ادرک الرکوع فقد ادرک الرکعۃ یعنی آنحضور کا ارشاد تھا کہ جس نے امام کو حالت رکوع میں پالیا اس نے اس رکعت کو پالیا۔

المغنی ج ۱ ص ۵۰۴

اس حدیث پاک نے اس مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا ہے کہ امام کو جس نے حالت رکوع میں پالیا اس کی وہ رکعت مکمل ہوگئی۔

بخاری شریف میں حضرت ابوبکرہ کی روایت ہے کہ مسجد میں پہنچے تو حضورﷺ حالت رکوع میں تھے اور ابوبکرہ نے جلدی کی صف میں پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کرلیا اور پھر اس کا ذکر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے فرمایا

زادک اللہ حر صا ولا تعد

اللہ نماز کے سلسلہ میں تمہاری حرص اور بڑھائے مگر اب ایسا نہ کرنا آنحضورﷺ نے ان کو صف سے کٹ کر رکوع کرنے سے منع فرمایا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رکعت کو دہرانے کا حکم نہیں دیا اس سے معلوم ہوا کہ وہ رکعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں معتبر تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ بھی فرماتے کہ نماز کو دوبارہ پڑھ لو تمہاری ایک رکعت چھوٹ گئی ہے۔

یہ حدیث بھی اس مسئلہ کی نص ہے کہ حالت رکوع میں امام کو پانے والا پوری رکعت کا پانے والا ہوتا ہے۔

اب اگر اس صحیح حدیث کو بھی غیر مقلدین نہ مانیں تو ان کے ساتھ کون زبردستی کرے بخاری شریف کی یہ وہ حدیث ہے کہ جمہور اہل اسلام اور ائمہ اربعہ نے اس کو اس مسئلہ میں بطور حجت و دلیل پیش کیا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ بہت سے صحابہ کرام مثلاً حضرت ابوبکر حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت زید بن ثابت اور ان کے علاوہ دوسرے جلیل القدر صحابہ کرامؓ امام کے ساتھ اگر وہ شروع نماز میں شریک نہ ہوتے تو رکوع میں امام کے ساتھ شامل ہونے کی کوشش کرتے تاکہ رکعت نہ چھوٹے اور ان کی شرکت امام کے ساتھ پوری جماعت میں ہو،صحابہ کرام کا یہ عمل بتلا رہا ہے کہ امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہوجانے پر وہ رکعت شمار کی جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

من فا تہ الر کو ع فلا یعتد بالسجد ہ (مصنف عبدالر زاق)

یعنی اگر کسی سے رکوع چھوٹ جائے اور امام کو حالت سجدہ میں پائے تو اس کا یہ سجدہ شمار نہ ہوگا یعنی محض سجدہ کے پانے سے اس کی یہ رکعت شمار نہ ہوگی معلوم ہوا کہ رکوع میں اگر کسی نے امام کو پالیا تو اس کی وہ رکعت شمار ہوگی اور یہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے،مصنف عبدالرزاق ہی میں ہے۔

عن علی وابن مسعود قالا من لم ید رک الر کعۃ الا ولی فلا یعتد با السجدۃ

یعنی حضرت علی وابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس نے رکوع نہیں پایا اس کے سجدہ کا شمار نہ ہوگا۔

اور زید بن وہب کی یہ روایت بھی مصنف عبدالرزاق ہی میں ہے۔

عن زید بن وھب قال دخلت انا وابن مسعود والامام راکع فرکعنا فلما فرغ الامام قمت فاصلی فقال قد ادر کتہ .

یعنی زید بن وہب فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت عبداللہ بن مسعود نماز میں شامل ہوئے تو امام رکوع میں تھا ہم نے بھی رکوع میں شرکت کی پھر جب امام نماز پوری کر چکا تو میں نے کھڑے ہو کر اس رکعت کو پوری کرنا چاہا تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے منع کیا اور

فرمایا کہ تمہاری وہ رکعت پوری ہوچکی ہے اسے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث ہے

عن ابی ھریرہؓ مرفوعا من ادرک رکعة من الصلوۃ فقد ادرکھا قبل ان یقیم الامام صلبه .

حضرت ابوھریرہؓ آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قبل اس کے کہ امام رکوع سے کھڑا ہو اگر کسی نے امام کو رکوع میں پالیا تو اس نے رکعت کو پالیا۔

یہ حدیث بھی اس مسئلہ میں نص صریح ہے جس میں کسی طرح کی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ حدیث موطا امام محمد میں ہے۔

اذافاتتک الرکعة فاتتک السجدۃ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر تم سے رکوع فوت ہوگیا تو تمہارا سجدہ بھی فوت ہوا یعنی رکوع کے چھوٹنے سے پوری رکعت فوت ہوگئی اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی سے رکوع نہیں چھوٹا تو اس کی وہ رکعت پوری شمار ہوگی۔

غیر مقلدین شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی امامت فی الحدیث کے قائل ہیں اور ابن تیمیہ کی باتیں عام طور پر ان کے نزدیک ناقابل انکاری ہوتی ہیں حافظ ابن تیمیہ کا مسلک اس مسئلہ میں وہی ہے جو جمہور کا ہے بخاری شریف میں حضرت ابو بکرہ کی روایت میں جو یہ ہے کہ انہوں نے جماعت میں شامل ہونے سے پہلے ہی رکوع کرلیا جبکہ امام کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والی کی نماز نہیں ہوتی ہے تو حضرت ابو بکرہ کی وہ نماز کیسے صحیح ہوگی؟

اس کا جواب دیتے ہوئے حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

واما حدیث ابی بکرۃ فلیس فیه انه صلی متفردا خلف الصف قبل رفع الامام راسه من الرکوع فقد ادرک من الاصطفاف الماموربه مایکون به مدرکا للرکعة

(ج ۲۲ ص ۳۹۷ فتاویٰ)

یعنی حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے یہ نہیں ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے صف کے پیچھے امام کو رکوع سے سر اٹھانے سے پہلے تنہا نماز ادا کی تھی انہوں نے صف میں شامل ہو کر امام کے ساتھ رکوع کی اتنی مقدار پالی تھی کہ جس سے مصلی پوری رکعت کا پانیوالا قرار پاتا ہے۔

امام ابن تیمیہ کی یہ عبارت بھی بالکل واضح ہے کہ امام کو حالت رکوع میں پانے والا رکعت پانے والا ہوا کرتا ہے آگے ابن تیمیہ فرماتے ہیں

ولیس فیه انه امر باعادۃ الرکعة

یعنی اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرہ کو اس رکعت کو دوبارہ لوٹانے کا حکم فرمایا تھا یعنی

آنحضور اکرم ﷺ نے اس رکعت کا تام شمار کیا اگر وہ رکعت تام نہ ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکعت کو دوبارہ لوٹواتے۔

بہر حال اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو لوگ امام بخاری اور ابن حزم وغیرہ کی تقلید میں یہ کہتے ہیں کہ امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہونے والے کی رکعت شمار نہ ہوگی دلائل وحقائق کی روشنی میں اس کا کوئی وزن نہیں ہے حق وہی ہے جو جمہور اور ائمہ اربعہ کا مذہب ہے کہ ایسے مصلی کی وہ رکعت شمار ہوگی مشہور غیر مقلد عالم مولانا شمس الحق ابو داؤد کی شرح عون المعبود میں فرماتے ہیں۔

وذهب جمهور الائمة من السلف والخلف الى ان مدرک الرکوع مدرک للرکعة من غير اشتراط قرأة الفاتحه (ج ا ص ۳۳۵ از اعلا السنن)

یعنی جمہور ائمہ سلف وخلف کا یہی مذہب ہے کہ فاتحہ پڑھے بغیر رکوع کو پانیوالا پوری رکعت کا پانے والا شمار ہوتا ہے۔

اب آخر میں اس پر بھی غور فرمائیں کہ قرآن پاک میں باری تعالی کا ارشاد ہے کہ

وارکعوا مع الراکعین.

ایک جگہ حضرت مریم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے کہ وارکعی مع الراکعین دونوں آیتوں میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم ہے اور یہاں مصلیوں سے کہا جارہا ہے کہ رکوع کرنے والوں کیساتھ رکوع کرو یعنی جماعت کے ساتھ نماز ادا کرو قرآن پاک کے ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ رکوع کی حالت میں جو لوگ شریک ہوں گے وہ پوری نماز باجماعت کو پانے والے ہوں گے اور ان کی ہر ہر رکعت باجماعت ہوگی حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ وارکعی مع الراکعین کی تفسیر میں فرماتے ہیں چونکہ کم از کم رکوع میں امام کے ساتھ شریک ہونے والا اس رکعت کو پانے والا سمجھا جاتا ہے شائد اسی لیے نماز کو بعنوان رکوع تعبیر کیا گیا ہے کما فُهم من کلام ابن تیمیہ فی فتاوی۔

یعنی جیسا کہ فتاوی ابن تیمیہ کے کلام سے یہی بات مفہوم ہوئی ہے۔

آپ نے اندازہ لگایا کہ جمہور کے ہاتھ میں قرآن بھی ہے حدیث بھی ہے صحابہ کرام کا عمل بھی ہے ائمہ اربعہ کا اس مسئلہ میں اتفاق بھی ہے اب اس کے بعد اگر کوئی یہ کہے کہ جمہور کا مسئلہ غلط ہے اور امام بخاری اور ابن حزم جو کہتے ہیں وہی صحیح ہے تو ایسا شخص اس لائق نہیں ہے کہ اس کو منہ لگایا جائے۔

فقہی مسائل میں ائمہ فقہ ہی کی بات چلے گی امام بخاری اور ابن حزم کی نہیں سنی جائے گی امام بخاری بہت بڑے محدث تھے مگر وہ امام فقہ نہیں تھے اس لیے فقہ کے مسائل میں ائمہ فقہ پر اعتماد کیا جائے گا اور جمہور ائمہ فقہ کے خلاف کسی محدث کی بات کا اعتبار نہیں ہوگا، اور اگر کسی مسئلہ میں ائمہ اربعہ اتفاق کرلیں جیسا کہ اس مسئلہ میں ان کا اتفاق ہے اس کی مخالفت اہل سنت کا شیوہ نہیں اس کے خلاف ہر قول شاذ ہوگا۔

واللہ اعلم بالصواب

امام بخاری کی (ان کتابوں میں ذکر کردہ)
روایتوں سے رفع یدین کا مسئلہ واضح نہیں ہوتا

مکرمی حضرت مولانا غازی پوری صاحب زاد لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

زمزم کا مطالعہ پابندی سے کرتا ہوں اور اس کی سطر سطر پڑھتا ہوں، آپ کے تحقیقی مضامین پڑھ کر الحمدللہ بڑا اطمینان پیدا ہوتا ہے ، اور احناف اور فقہ حنفی کے بارے میں غیر مقلدین جو ہوائیاں اڑا اڑا کر عوام کو گمراہ کرتے ہیں، ان کا دجل وفریب واضح ہوتا ہے، زمزم کا ہر شمارہ سرمۂ چشم کا درجہ رکھتا ہے۔

مسئلہ رفع یدین میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے پڑھ چکا ہوں، اور واضح ہو چکا ہے کہ اس بارے میں احناف کا جو موقف ہے وہی ہر طرح عقل ونقل کے مطابق ہے، لیکن ایک خواہش دل میں ہے کہ بخاری میں جو اس سلسلہ کی روایتیں ہیں ان کو سامنے رکھ کر بھی آپ مسئلہ رفع یدین کے بارے میں ایک تحریر لکھ دیں تا کہ یہ مسئلہ اور بھی روشن اور مجلّیٰ ہو جائے۔

امید ہے کہ خاکسار کی خواہش درخور اعتناء انجناب ہوگی والسلام

جاوید انصاری گورکھپور

زمزم:

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جلیل القدر محدث تھے علم حدیث کی معرفت میں ان کا مقام بہت بلند تھا، ان کے معاصرین مین ان کا ہمسر بہت کم تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسائل شرعیہ میں امت نے ہمیشہ فقہاء پر اعتماد کیا ہے محدثین اس راہ کے آدمی نہیں تھے کہ وہ مسائل کا استخراج واستنباط کریں، ان کا کام صرف احادیث کو جمع کر دینا تھا، جو محتاط محدثین تھے وہ احادیث کے بارے میں زیادہ چھانٹ پھٹک کرتے تھے، امام بخاری کی صحیح بخاری میں امام بخاری کا یہی امتیاز نظر آتا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بخاری کی احادیث کو سامنے رکھ کر شرعی وفقہی مسائل میں از خود کسی کے لئے فیصلہ کرنا جائز ہوگا، اس بارے میں بخاری میں کیا ہے یہ نہیں دیکھا جا ئے گا بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ فلاں مسئلہ میں فقہاء کی کیا رائے ہے اور انہیں کی اتباع پیروی اور تقلید کی جائے گی۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ احادیث ایک ہی مسئلہ میں الگ الگ بھی مروی ہیں بلکہ ایک ہی کتاب میں ایک ہی مسئلہ کی بالکل متضاد اور مختلف قسم کی احادیث ہیں اس وجہ سے اگر صرف ان احادیث کو دیکھا جائے گا تو فقہی مسائل میں کوئی حکم معلوم کرنا بہت مشکل ہوگا اور یہ عین ممکن ہے کہ انسان احادیث اور محدثین سے بدگمان ہو کر ان کا منکر ہو جائے ، اور ایسا ہو چکا ہے، منکرین حدیث کا ایک طبقہ اسی طرح پیدا ہوا ہے اس کو احادیث میں تضاد نظر آیا تو اس نے احادیث اور محدثین کے بارے میں غلط نظریہ قائم کرلیا۔

مسئلہ رفع یدین کے بارے میں اگر آپ صرف بخاری شریف پر یا امام بخاری کی روایت کردہ احادیث پر نگاہ رکھیں گے اور انہیں

سے رفع یدین کی مشروعیت کی حقیقت جاننا چاہیں گے تو خدا نہ کرے آپ کا بھی یہی حال ہوسکتا ہے، اور اس کا امکان ہے کہ آپ احادیث رسول سے برگشتہ ہو جائیں اور امام بخاری سے بھی بدگمان ہو جائیں اسلئے شریعت میں جس کا جو مقام ہے اس کو اس کی جگہ پر رکھئے، محدثین کا مقام اپنی جگہ پر ہے اور فقہا کا اپنی جگہ پر فقہا کا کام محدثین سے مت لیجئے خواہ امام بخاری ہوں، خواہ امام مسلم یا کوئی اور محدث۔

آپ اسی مسئلہ رفع یدین میں دیکھئے کہ امام بخاری کی روایت کردہ حدیثیں کس قدر مختلف اور متضاد ہیں تو بھلا ایسی متضاد اور مختلف احادیث سے رفع یدین کا مسئلہ کیسے منقح ہوسکتا ہے۔

امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں رفع یدین کے سلسلہ کی مندرجہ ذیل روایتیں ذکر کی ہیں۔

(۱) عبداللہ بن مسلمہ امام مالک سے اور امام مالک ابن شہاب زہری سے اور وہ سالم بن عبداللہ سے اور سالم اپنے والد یعنی حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ اپنے دونوں شانوں تک اپنا دونوں ہاتھ اس وقت اٹھاتے جب نماز شروع کرتے اور اسی طرح اس وقت بھی اٹھاتے جب رکوع میں جاتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے اور اس وقت سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد کہتے اور رفع یدین سجدہ میں نہ کرتے۔

اس روایت میں صرف تین جگہوں پر رفع یدین کا ذکر ہے اور سجدہ میں نفی کا ذکر ہے۔

(۲) بخاری کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن مقاتل نے بیان کیا اور مقاتل نے کہا کہ ہمیں عبداللہ نے خبر دی، عبداللہ نے کہا کہ ہم سے یونس نے بیان کیا اور یونس زہری سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ مجھے سالم بن عبداللہ نے خبر دی اور انہوں نے عبداللہ بن عمر سے روایت کی کہ حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھ شانوں کے بالمقابل اٹھاتے اور آپ ایسا ہی کرتے، جب رکوع کے لئے تکبیر کہتے اور رفع یدین کرتے جب رکوع سے سر اٹھاتے اور سمع اللہ لمن حمدہ کہتے اور سجدہ میں رفع یدین نہ کرتے۔

(۳) ابو قلابہ کہتے ہیں کہ انہوں نے مالک بن حویرث کو دیکھا کہ جب وہ نماز پڑھتے تو تکبیر کہتے اور دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب رکوع کا ارادہ کرتے تو اپنے ہاتھ اٹھاتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع یدین کرتے اور انہوں نے بیان کیا آنحضور اکرم ﷺ نے ایسا کیا تھا۔

(۴) ابو الیمان کہتے ہیں کہ ہم کو شعیب نے خبر دی، وہ زہری سے روایت کرتے ہیں زہری نے کہا کہ ہم کو سالم بن عبداللہ نے خبر دی کہ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے نماز شروع کی تو تکبیر کے وقت دونوں ہاتھوں کو اٹھایا اور ان کو شانہ کے مقابل کیا اور جب رکوع کے لئے تکبیر کہی تو بھی ایسا ہی کیا اور جب سمع اللہ لمن حمدہ کہا تو بھی ایسا ہی کیا اور آپ نے ربنا لک الحمد کہا اور آپ رفع یدین نہیں کرتے تھے جب سجدہ کرتے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے۔

(۵) امام بخاری فرماتے ہیں کہ ہم سے عیاش نے بیان کیا، عیاش کہتے ہیں کہ ہم سے عبدالاعلیٰ نے بیان کیا، عبدالاعلیٰ کہتے ہیں کہ ہم سے عبیداللہ نے بیان کیا اور وہ نافع سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب نماز میں داخل ہوتے تو تکبیر کہتے اور رفع یدین

کرتے اور جب رکوع کرتے تب بھی رفع یدین کرتے اور جب سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تب بھی رفع یدین کرتے اور جب دو رکعت سے کھڑے ہوتے تب بھی رفع یدین کرتے اور ابن عمر نے اس کو نبی ﷺ کی طرف مرفوع کیا۔

امام بخاریؒ نے رفع یدین کے سلسلہ کی بخاری میں یہی پانچ حدیثیں ذکر کی ہیں، یہ حدیثیں عدد کے اعتبار سے تو پانچ ہیں مگر فی الاصل صرف تین ہیں، ایک وہ جو حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے اور ایک اور جو مالک بن الحویرث سے اور ایک وہ جو آخر والی ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عمر کا عمل نافع نقل کرر ہے ہیں۔ یہ روایت موقوف ہے۔

اب حضرت عبداللہ بن عمر کی مرفوع روایت کو دیکھئے حضرت ابن عمر اپنی پہلی دوسری اور تیسری روایت میں آنحضور ﷺ کا جو عمل نقل کرتے ہیں اس میں آپ صرف تین جگہ رفع یدین ذکر کرتے ہیں دو رکعت سے اٹھنے کے بعد رفع یدین کا ذکر نہیں کرتے، مالک بن حویرث والی روایت میں بھی آپ غور کریں اس میں بھی دو رکعت سے اٹھنے کے بعد رفع یدین کا ذکر نہیں ہے، مگر جب نافع حضرت ابن عمر کا اپنا فعل ذکر کرتے ہیں تو اس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر دو رکعت سے اٹھنے کے بعد بھی رفع یدین کرتے تھے۔ یعنی حضرت ابن عمرؓ کا یہ فعل یعنی دو رکعت سے اٹھ کر بھی رفع یدین کرنا خود ان کی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہے، نیز مالک بن حویرث کی بھی حدیث کے خلاف ہے، رہا نافع کا یہ کہنا کہ حضرت ابن عمر اس کو آنحضور ﷺ کی طرف مرفوع روایت کرتے تو وہ مرفوع اگر قابل اعتماد تھی تو امام بخاری نے اس کو کیوں ذکر نہیں کیا مرفوع کو چھوڑ کر موقوف روایت کا ذکر کرنا یہ خود بتلا رہا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک اس مرفوع روایت جس میں دو رکعت کے بعد بھی رفع یدین کا ذکر ہے اس کی حقیقت کیا ہے، امام شافعیؒ بھی رفع یدین کے قائل تھے مگر وہ اس چوتھی جگہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

غرض امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی جو روایتیں ذکر کی ہیں ان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ صحیح کیا ہے تین جگہ رفع یدین کرنا یا چار جگہ رفع یدین کرنا دونوں بات صحیح نہیں سکتی تین جگہ رفع یدین ہو گا یا چار جگہ، اب بخاری کی ان دونوں روایتوں میں سے آپ کون سی اختیار کریں گے، جو بھی اختیار کریں گے تو ایک کو چھوڑنا لازم آئے گا اگر دو رکعت سے کھڑے ہونے پر ہی رفع یدین کو آپ اختیار کریں گے تو بخاری میں مذکور چاروں مرفوع روایات کو چھوڑ لازم آئے گا کیا اسی کا نام بخاری کی احادیث پر عمل کرنا ہے؟ یا تین اور چار کا عدد الگ الگ نہیں ایک ہی ہے؟

حضرت عبداللہ بن عمر کی روایتوں میں صاف مذکور ہے کہ آنحضور اکرم ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے جب کہ مالک بن حویرثؓ کی روایت میں اس کا ذکر بلکہ اشارہ تک نہیں ہے اب معلوم نہیں کہ مالک بن حویرث کی حدیث صحیح ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ دونوں حدیثیں بخاری کی آپ کے سامنے ہیں امام بخاریؒ تو بخاری شریف میں حضرت ابن عمرؓ سے یہ تصریح نقل کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے، اور رفع یدین کے موضوع پر جو امام بخاری کی مستقل تصنیف ہے جس کو جزء رفع یدین کے نام سے جانا جاتا ہے اس میں خود ابن عمر سے یہ روایت بھی ذکر کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ دو سجدوں سے فارغ ہو کر کھڑے ہوتے تو بھی رفع یدین کرتے تھے، روایت کے الفاظ یہ ہیں واذا قام من السجدتین یعنی جب دونوں سجدوں سے کھڑے ہوتے تو اس وقت بھی نافع کے بیان

کے مطابق حضرت ابن عمرؓ رفع یدین کرتے تھے حضرت ابن عمرؓ کا یہ عمل خود ان کی روایت کردہ بخاری کی حدیثوں کے خلاف ہے۔

اس رسالہ میں امام بخاری نے سالم بن عبداللہ کی بھی حدیث نقل کی ہے جس میں صاف ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر سجدوں سے سر اٹھاتے وقت بھی رفع یدین کرتے تھے پوری روایت جزء رفع یدین کی یہ ہے۔

عن العلاء انه سمع سالم بن عبدالله ان اباه كان اذارفع راسه من السجود و اذاارادان يقوم رفع يديه

یعنی حضرت علاء فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے لڑکے سالم سے سنا کہ فرماتے تھے کہ ان کے والد حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب سجدہ سے سر اٹھاتے اور کھڑے ہونے کا ارادہ کرتے تو رفع یدین کرتے امام بخاری کی جزء رفع یدین کی یہ روایت صحیح بخاری کی اس روایت کے بالکل ضد ہے جس کو امام بخاری نے حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضور اکرم ﷺ سجدوں میں رفع یدین نہیں کرتے تھے یہ دونوں روایتیں امام بخاری ہی اپنی الگ الگ دو کتابوں میں ذکر کر رہے ہیں اور دونوں روایتیں صحیح ہیں اگر جزء رفع یدین والی روایت صحیح نہ ہوتی تو بخاری اس کو بتلاتے جیسا کہ ان کا اس رسالہ میں یہ دستور ہے کہ جو روایتیں کمزور ہیں ان کو امام بخاری نے بتلا دیا ہے، مگر سالم کی اس روایت کے بارے میں امام بخاری خاموش ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ امام بخاری کے نزدیک یہ روایت صحیح ہے

۔

ذرا آپ فرمائیں کہ حضرت ابن عمر کی ان روایتوں میں سے جو بالکل ایک دوسرے کے خلاف ہیں کس کو اختیار کیا جائے اور کیا وجہ ہے کہ امام بخاری کی روایت کردہ ان متضاد روایتوں میں سے ایک کو اختیار کیا جائے اور دوسری کو اختیار نہ کیا جائے جزء قرأت میں حضرت نافع سے بھی ایک روایت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ دونوں سجدوں سے اٹھتے وقت بھی رفع یدین کرتے تھے حدیث کے الفاظ یہ ہیں

نافع ان عبداللهؓ كان اذااستقبل الصلوٰة يرفع يديه و اذاركع واذاقام من السجدتين كبر ورفع يديه(ص ۳۱)

اس حدیث کا ایک غیر مقلد صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ نافع نے بتایا کہ عبداللہ جب نماز کی طرف متوجہ ہوتے تو رفع یدین کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے اور جب دو سجدوں سے اٹھتے تو رفع یدین کرتے، امام بخاریؒ کی روایت کردہ یہ حدیث بھی ابن عمر کی بخاری شریف میں ان روایتوں کے خلاف ہے جن میں یہ ہے کہ آنحضور اکرم ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے گویا خود حضرت ابن عمرؓ کا اپنا عمل اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہے۔

ایک طرف بخاری شریف کی روایت ہے کہ سجدوں میں رفع یدین نہیں ہے، یعنی صرف ابتداء صلوٰۃ کے وقت اور رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت۔ حضرت ابن عمرؓ نے آنحضور ﷺ کو رفع یدین کرتے دیکھا تھا اور دوسری طرف امام بخاری یہ تصریح کر رہے ہیں کہ بہت سے تابعین جب سجدہ کرتے تھے تب بھی رفع یدین کرتے تھے۔ جزء رفع یدین میں امام بخاری فرماتے ہیں۔

قال وكيع عن الربيع رأيت الحسن ومجاهد اوعطا وطاوساوقيس بن سعد والحسن بن مسلم

یرفعون ایدیھم اذارکعو واذاسجدوا (ص ۳۵)

غیر مقلد مترجم اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔ وکیع نے ربیع سے روایت کی ہے اس نے کہا کہ میں نے حسن، مجاہد، عطا، طاؤس، قیس بن سعد اور حسن بن مسلم کو دیکھا کہ وہ رفع یدین کرتے تھے جب رکوع کرتے اور جب سجدہ کرتے یہ تمام تابعین سجدہ کے وقت بھی رفع یدین کر تے تھے، جو بخاری شریف کی روایتوں کے خلاف ہے اور یہ خود امام بخاری ذکر کررہے ہیں کوئی دوسرا نہیں گویا ان تابعین کو بخاری والی روایت تسلیم نہیں یا یہ کہ ابن عمرؓ کا یہ کہنا کہ آنحضور ﷺ صرف تین جگہ رفع یدین کرتے تھے۔ ان تابعین کے نزدیک قابل اعتبار بات نہیں ہے۔

امام بخاریؒ نے جزء رفع یدین میں یحییٰ بن ابی اسحاق کی روایت ذکر کی ہے، اس میں ہے، میں نے حضرت انس بن مالک کو دیکھا کہ وہ دونوں سجدوں کے درمیان بھی رفع یدین کرتے تھے۔ حضرت انس کا یہ عمل ابن عمرؓ کی حدیث جو بخاری میں ہے کہ آنحضور ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے اس کے بالکل خلاف ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں جو بات ہے کہ آنحضور ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے، صحابہ کرامؓ کے نزدیک وہ صحیح نہیں تھی۔ اگر حضرت ﷺ کا یہی دائمی عمل ہوتا اور یہی سنت ہوتی تو حضرت انسؓ اس کے خلاف کیوں کرتے۔ صحابہ کرامؓ کا عمل خصوصاً عبادات کے سلسلہ کا خود ساختہ نہیں ہوتا تھا، صحابہ کرامؓ آنحضور ﷺ کو جو کرتے دیکھتے وہی کرتے اس لئے حضرت انسؓ کے اس عمل پر امام بخاری کا یہ تبصرہ کہ وہ حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اولیٰ کہ آنحضور ﷺ کی حدیث حضرت انسؓ کے عمل سے اولیٰ ہے یہ اس وقت صحیح ہوتا جب امام بخاری دلائل سے ثابت کردیتے کہ حضرت انسؓ کا یہ عمل اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث کی روشنی میں نہیں تھا، اگر حضرت انسؓ کا یہ عمل خلاف حدیث تھا تو امام بخاری نے اس کو ذکر ہی کیوں کیا۔

غرض اگر امام بخاری کی روایتوں کو دیکھا جائے تو ان کی ذکر کردہ بخاری شریف اور جزء رفع یدین کی روایتوں میں اتنا تضاد ہے کہ ان کی روشنی میں رفع یدین کے بارے میں کوئی واضح بات سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں جیسا کہ بخاری میں ہے سجدہ میں رفع یدین کی نفی ہے، امام بخاری نے مالک ابن الحویرث کو جو حدیث ذکر کی ہے اس میں اس جگہ رفع یدین کے اثبات یا نفی کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ مگر نسائی میں صحیح سند سے مالک بن الحویرث کی حدیث میں سجدہ کے وقت بھی رفع یدین کا ذکر ہے

عن مالک بن الحویرث انہ رای النبی صلی اللہ علیہ وسلم یرفع یدیہ فی صلوتہ اذارکع واذارفع راسہ من الرکوع واذاسجد واذارفع راسہ من سجودہ حتی یحاذی بھمافروع اذنیہ

مالک ابن الحویرث فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی ﷺ کو دونوں ہاتھ اٹھاتے نماز میں دیکھا، جب آپ رکوع کرتے یا رکوع سے سراٹھاتے یا جب آپ سجدہ کرتے یا جب آپ سجدہ سے سراٹھاتے تو آپ ﷺ اپنے دونوں ہاتھ کانوں کی لو کے برابر کرتے۔ اس روایت کی سند مسلم کی سند ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ وقد اخرج مسلم بھذا الاسناد طرفہ الاخیر۔ یعنی امام مسلم نے اس کا آخری حصہ (حتی یحاذی بھمافروع اذنیہ) اسی سند سے ذکر کیا ہے، معلوم ہوا کہ صحیح سند سے آنحضور ﷺ کا یہ عمل بھی ثابت ہے کہ آنحضور اکرم

ﷺ سجدہ میں جاتے اور سجدہ سے سر اٹھاتے وقت بھی رفع یدین کرتے تھے، حضرت انس بن مالک کا عمل بھی جس کا تذکرہ اوپر ہوا، اس کی شہادت دے رہا ہے۔ آنحضورؐ سے رفع یدین کا عمل سجدہ میں بھی ثابت ہے۔

حضرت امام بخاری کی بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جو روایتیں ہیں جن میں یہ ہے کہ آپ ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے، اس کو خود سلفیوں نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ علامہ محمد ناصر الدین البانی جو سلفیوں کے بہت بڑے محدث سمجھے جاتے ہیں۔ اپنی کتاب ''صفۃ صلوٰۃ النبی'' میں لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ سجدہ کرتے وقت بھی رفع یدین کرتے تھے اور حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ اس کو نسائی اور دار قطنی نے صحیح سند سے نقل کیا ہے۔ اور پھر لکھتے ہیں۔

قدروی هذاالرفع عن عشرة من الصحابةؓ وذهب الى مشروعيته جماعة من السلف منهم ابن عمرؓ وابن عباسؓ والحسن البصریؒ والطائوسؒ وابنه عبداللهؒ ونافع مولیٰ ابن عمرؓ وسالم ابنه والقاسم بن محمد وعبدالله بن دينار وعطاء وقال عبدالرحمن بن مهدی .وهذا من السنة وعمل به امام السنة احمد بن حنبل وهوقول عن مالک والشافعی (صفة صلوٰة النبی ص۱۰۷)

اس جگہ رفع یدین دس صحابہ کرام سے مروی ہے اور اس کی مشروعیت کی سلف کی ایک جماعت قائل ہے انہیں میں سے حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حسن بصری طاؤس اور ان کے لڑکے عبداللہ مولیٰ ابن عمر نافع ابن عمرؓ کے لڑکے سالم، قاسم بن محمد، عبداللہ بن دینار اور عطا ہیں عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے تھے کہ سجدہ میں جاتے وقت رفع یدین کرنا سنت ہے امام اہل السنہ امام احمد کا اسی پر عمل ہے اور یہی ایک قول امام مالک اور امام شافعی کا بھی ہے۔

اندازہ لگائیے کہ امام بخاری کی حضرت عبداللہ بن عمر کی وہ روایتیں جن میں صرف تین یا چار جگہ رفع یدین کا ذکر ہے اور ان میں یہ بھی صاف صاف مذکور ہے کہ آپ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے، ان کا شیخ البانی نے کتنے کھلے طور پر رد کر دیا ہے۔

شیخ ناصر الدین البانی فرماتے ہیں کہ جس طرح سجدہ کرتے وقت رفع یدین مسنون ہے اسی طرح سجدہ سے سر اٹھاتے وقت بھی رفع یدین مسنون ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

ويرفع راسه حتى يستوى قاعداً وكان يرفع يديه مع هذا التكبير .

یعنی آنحضور ﷺ سجدہ سے سر اٹھا کر کے برابر بیٹھ جاتے تھے اور اس تکبیر کے ساتھ بھی رفع یدین کرتے تھے۔

شیخ البانی فرماتے ہیں کہ ابوداؤد نے اس کو صحیح سند سے ذکر کیا ہے بلکہ شیخ البانی کا تو مذہب یہ ہے کہ ہر تکبیر کے وقت رفع یدین مسنون ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

صح الرفع عن انس وابن عمر ونافع وطائوس والحسن البصری وابن سيرين وايوب السختيانی كما فی مصنف ابن ابی شيبة(۱۰۶/۱)(باسانيد صحيحة منهم ص۱۱۷)

یعنی اس جگہ مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سندوں سے ان حضرات سے رفع یدین مروی ہے حضرت انس، حضرت ابن عمر، نافع، طاؤس، حسن

بصری، ابن سیرین، ایوب سختیانی۔

معلوم ہوا کہ سلفیوں نے بخاری کی روایتوں کو جن میں یہ ہے کہ رفع یدین صرف تین یا چار جگہ ہے تسلیم نہیں کیا ہے۔ خواہ وہ ابن عمر کی روایتیں ہوں، خواہ مالک بن الحویرث کی سب کو شیخ البانی نے رد کر دیا بلکہ شیخ البانی اور امام بخاری کا جزء رفع یدین میں جو انداز ہے وہ بتلا رہا ہے کہ خود ابن عمرؓ کا ان اپنی روایتوں پر عمل نہیں تھا جن میں یہ ہے کہ آنحضور اکرم ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے اس لئے کہ جیسا کہ امام بخاری نے بھی جزء رفع یدین میں اور البانی نے بھی صحیح سندوں سے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سجدوں میں بھی رفع یدین کرتے تھے، تو جب راوی کا خود عمل اپنی روایت پر نہیں ہے تو دوسروں سے اس پر عمل کرنے کا مطالبہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال امام بخاریؒ نے جو روایتیں بخاری میں ذکر کی ہیں ان کی سندیں بلاشبہ صحیح ہیں مگر ان پر عمل کرنا اس لئے مشکل ہے کہ خود امام بخاری نے رفع یدین کے بارے میں مختلف قسم کی روایتیں بخاری اور اپنے رسالہ جزء رفع یدین میں ذکر کر کے رفع یدین کے مسئلہ کو بڑا پیچیدہ بنا دیا ہے، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ امام بخاری صرف محدث تھے فقیہ نہیں تھے۔ محدث اپنا فرض انجام دیتا ہے اس کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس کے اس طرز عمل سے شرعی مسئلہ میں کتنا الجھاؤ پیدا ہو رہا ہے اس وجہ سے کہ اس کے علم میں یہ بات ہوتی ہے کہ اس الجھاؤ کو سلجھانے کے لئے اللہ نے ایک دوسری جماعت کو پیدا کیا ہے اور وہ جماعت فقہاء کرام کی ہے۔

ہم چونکہ حنفی ہیں اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں اس وجہ سے ہم صرف امام اعظم کی بات کرتے ہیں کہ انہوں نے اس مسئلہ کو کس طرح سے سلجھایا ہے کہ چونکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ سے رفع یدین کے سلسلہ میں مختلف اور متضاد قسم کی روایتیں ہیں اس وجہ سے انہوں نے دیکھا کہ کیا کوئی ایسا صحابی بھی ہے جو صرف ایک ہی بات بیان کرتا ہو اور اس کی احادیث میں تضاد نہ ہو، تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو جو کہ بدری صحابی ہیں اور مہاجرین اولین میں سے ہیں جن کی اتباع کا قرآن میں بطور خاص حکم ہے اور اس پر اجر عظیم کا وعدہ ہے۔ رفع یدین کے سلسلہ کی صرف ایک ہی بات بیان کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کی نماز میں صرف ایک دفعہ یعنی ابتداء صلوٰۃ کے وقت رفع یدین ہوا کرتا تھا اور یہ بھی دیکھا کہ جن لوگوں نے رفع یدین کی احادیث ذکر کی ہیں ان میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مقام سب سے بلند ہے، امام ابو حنیفہؒ نے یہ بھی دیکھا کہ ابتداء صلوٰۃ کے وقت رفع یدین کرنا تمام امت کا اتفاقی مسئلہ ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

واسلم العبارات قول ابن المنذر لم یختلفوا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یرفع یدیہ اذاافتتح الصلوٰۃ (فتح الباری ج۲ ص ۲۱۹)

یعنی سب سے صحیح بات ابن المنذر کی ہے کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ آنحضور اکرم ﷺ جب نماز شروع کرتے تھے تو رفع یدین کرتے تھے

اور امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ

اجمعت الامۃ علی استحباب رفع الیدین عندتکبیرۃ الاحرام (فتح الباری ص ۲۱۸ ج ۲)

امت کا اجماع ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین مستحب ہے۔

غرض امام ابو حنیفہؒ نے جب دیکھا کہ تکبیر تحریمہ ہی کے وقت رفع یدین کرنے پر بلا اختلاف امت کا عمل ہے، تو انہوں نے تمام مختلف روایتوں کو چھوڑ کر اس اتفاقی رفع یدین کو جس کی تائید حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث سے بھی ہو رہی ہے اختیار کیا تا کہ امت اس مسئلہ میں کسی انتشار ذہنی کا شکار نہ ہو اور بقیہ حدیثوں کو اس پر محمول کیا کہ یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب حضور صلی اللہ وعلیہ وسلم کا اسکنوفی الصلوٰۃ نماز میں سکون اختیار کرو کا حکم جاری نہیں ہوا تھا والله اعلم بالصواب

اب آخر میں ایک بات اور قارئین کے لیے عرض ہے کہ خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف میں اپنی صحیح سند سے وہ روایت ذکر کی ہے جس میں صرف ایک جگہ یعنی شروع نماز میں رفع یدین کا ذکر ہے اور وہ روایت یہ ہے۔

عن محمد بن عمرو بن عطاء انه كان جالسا مع نفر من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم فذكرنا صلوٰة النبی صلی الله علیه وسلم فقال ابو حمید الساعدی انا كنت احفظكم لصلوٰة رسول الله صلی الله علیه وسلم رأیته اذا كبر جعل یدیه حذاء منكبیه واذا ركع امكن یدیه من ركبتیه ثم هصر ظهره فاذا رفع رأسه استوىٰ حتی یعود كل فقار مكانه فاذا سجد وضع یدیه غیر مفترش ولا قابضهما الخ

محمد بن عمرو عطاء سے روایت ہے کہ وہ صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھے تھے اس مجلس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا تذکرہ ہوا تو ابو حمید ساعدی نے کہا کہ میں تم سب سے زیادہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو یاد رکھنے والا ہوں میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب آپ نے نماز شروع کرنے کے لیے تکبیر کہی تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں کے سامنے کیا اور جب آپ نے رکوع کیا تو پورے طور پر اپنے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھا، پھر اپنی پیٹھ کو سیدھا کیا پھر آپ نے جب رکوع سے سر اٹھایا تو سیدھے کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ جوڑوں کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ پر ہو گئیں پھر جب آپ نے سجدہ کیا تو اپنا دونوں ہاتھ اس طرح رکھا کہ نہ وہ پھیلے ہوئے تھے نہ سمٹے ہوئے تھے الی آخر الحدیث۔

ناظرین غور فرمائیں اس حدیث میں جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح سند سے صحیح بخاری میں نقل کیا ہے، ابو حمید ساعدی نے صرف ایک جگہ نماز شروع کرتے وقت رفع یدین کا ذکر کیا ہے امام بخاری نے اس حدیث کو رفع یدین کے باب میں ذکر کرنے کے بجائے باب سنة الجلوس والتشهد میں ذکر کیا ہے۔

ابو حمید الساعدی کی یہ روایت بتلا رہی ہے کہ نماز میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول صرف ایک جگہ رفع یدین کرنا تھا۔

غرض بخاری شریف میں رفع یدین والی روایتوں کو دیکھا جائے تو اس میں بڑا تضاد ہے کہیں تین جگہ ذکر ہے کہیں چار جگہ کا ذکر ہے کہیں ایک جگہ کا ذکر ہے اور اگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ جز رفع یدین کو بھی سامنے رکھا جائے تو روایتوں کا یہ تضاد اور اختلاف اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کی اہمیت کتنی زیادہ ہے جس میں صرف ایک بات کہی جارہی ہے کہ رفع یدین صرف شروع نماز میں ایک جگہ ہے صرف شروع نماز میں جن صحابہ کرامؓ سے رفع یدین منقول ہے ان کی تعداد تقریبا پچاس ہے جن میں عشرہ مبشرہ بھی ہیں۔

نواب صدیق حسن خان صاحب امام غیر مقلدین کا یہ اعتراف وارشاد ملاحظہ فرمائیں نواب صاحب فرماتے ہیں:

اما عندا لتکبیر فقد روی ذالک عندالنبی صلی اللہ علیہ وسلم نحو خمسین رجلا من الصحابة منهم الصحابةمنهم العشرة المبشرةبالجنة .

یعنی رفع یدین شروع نماز میں تکبیر کے وقت تو اس کو صحابہ کرام میں سے تقریبا پچاس صحابہ کرامؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے، ان میں وہ دس صحابہ یہ بھی ہیں جنکو جنت کی بشارت سنائی گئی تھی۔

صرف ابتداءنماز میں رفع یدین کرنا اجتماعی مسئلہ ہے اور جگہ رفع یدین کرنے میں لوگوں کا اختلاف ہے اس سے بھی احناف کے قول کی قوت واضح ہے۔ نواب صاحب شرح مسلم سے امام نووی کا قول نقل کرتے ہیں۔

انها اجمعت الا مة علی ذالک عند تکبیر ة الا حرام و انما اختلفوا فيما عدا ذالک .

یعنی تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرنے پر امت کا اتفاق ہے اور دوسری جگہوں میں رفع یدین کرنے میں لوگوں کا اختلاف ہے

۔

نماز جنازہ میں سوۃ فاتحہ پڑھنے کا مسئلہ:

اندور سے زمزم کے ایک قاری نے مجھ سے فون پر نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں سوال کیا کہ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے انہوں نے بتلایا کہ غیر مقلدین جنازہ کی نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنے کو مسنون بتلاتے ہیں میں نے فون پر مختصر جواب جو ہو سکتا تھا دے دیا تھا پھر جب میں نے غیر مقلدین علماء کی کتابوں کیطرف رجوع کیا تو پتہ چلا کہ غیر مقلدین کے مذہب میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا مسنون ہی نہیں بلکہ واجب اور ضروری ہے بلا اس کے نماز جنازہ ہوتی ہی نہیں پھر غیر مقلدین علماء میں سے بعض کے نزدیک نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ زور سے پڑھی جائے گی اور بعض کے نزدیک آہستہ۔

آج کی اس فرصت میں اس مسئلہ پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالنی مقصود ہے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے سلسلہ میں سب سے مضبوط دلیل بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباس کا اپنا عمل بخاری شریف میں ہے۔

(۱) عن طلحة بن عبدالله بن عوف قال صليت خلف ابن عباس رضى الله عنهما على جنازة فقرا بفاتحه الكتاب قال لتعلمو انها سنة .

حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف فرماتے ہیں کہ میں نے ایک جنازہ کی نماز حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے پڑھی تو آپ نے سورہ فاتحہ پڑھی پھر فرمایا کہ میں نے سورہ فاتحہ اسلیے پڑھی ہے کہ تم جان لو کہ یہ سنت ہے، لطف یہ ہے کہ یہی روایت سنن نسائی میں بھی ہے مگر وہاں اس کے الفاظ یہ ہیں

(۲) عن طلحة بن عبدالله بن عوف قال ، صليت خلف ابن عباس على جنازة فقرا بفاتحه الكتاب وسورة وجهر حتى اسمعنا فلما فرغ اخذت بيده فسألته فقال سنة وحق .

حضرت طلحہ بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے ایک جنازہ کی نماز پڑھی تو آپ نے سورہ فاتحہ پڑھی اور ایک سورۃ بھی اور بلند آواز سے پڑھی یہاں تک کہ ہم کو سنایا پھر جب آپ نماز پڑھا چکے تو میں نے ان کے ہاتھ کو پکڑا اور پھر اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ سنت اور حق ہے۔

نسائی شریف میں یہی روایت ان الفاظ میں ہے

عن طلحه بن عبدالله قال صليت خلف ابن عباس على جنازة سمعته يقرأ بفاتحة الكتاب فلماانصرف اخذت بيده فسألته فقلت له تقرأ ؟ قال نعم انه حق وسنة.

حضرت طلحہ بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی تو میں نے سنا کہ وہ سورہ فاتحہ پڑھ رہے ہیں جب آپ نے سلام پھیرا تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ آپ جنازہ میں قرأت کرتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ یہ حق اور سنت ہے۔

نسائی شریف میں حضرت ابوامامہ کی بھی اس سلسلہ کی ایک روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں۔

(۴) عن ابی امامة قال :السنة فی الصلوٰة علی الجنازة ان یقرأ فی التکبیرة الاولی بام القرآن مخا فته ثم یکبر ثلا ثا و التسلیم عندالآخر ة .

حضرت ابوامامہ فرماتے ہیں کہ جنازہ کی نماز میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر میں سورۃ فاتحہ آہستہ سے پڑھی جائے پھر تین تکبیریں کہی جائیں اور آخر میں سلام پھیرا جائے۔ ترمذی شریف میں اسی سلسلہ کی آنحضور ﷺ کی طرف منسوب ایک روایت یہ ہے۔

(۵) عن ابن عباس ان النبی صلی الله علیه وسلم قرأ علی الجنازة بفاتحة الکتاب .

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھی۔

مگر یہ روایت نا قابل اعتبار ہے خود امام ترمذی نے اس کا فیصلہ فرمادیا ہے فرماتے ہیں۔

حدیث ابن عباس حدیث لیس اسنا ده بذالک القوی

یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث قوی نہیں ہے۔

اور کیوں قوی نہیں ہے؟ تو ترمذی فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی ابرہیم بن عثمان ہے وہ منکر حدیث ہے حافظ ابن حجر اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ متروک الحدیث کہ اس کی حدیث کو لوگوں نے چھوڑ دیا ہے

(تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۱۴۲)

(۶) ابن ماجہ میں حضرت ام شریک سے ایک حدیث ان الفاظ سے مروی ہے۔

ام شریک الا نصاریة قالت :امر نا رسول الله انا نقرأ علی الجنازة بفا تحه الکتاب .

حضرت ام شریک انصاریہ رضی اللہ عنھما فرماتی ہیں کہ ہمیں رسول اکرم ﷺ نے حکم دیا ہے کہ ہم جنازہ پر سورہ فاتحہ پڑھیں۔

لیکن یہ روایت بھی قوی نہیں مولانا مبارکپوری تحفہ الاحوذی میں حافظ ابن حجر سے نقل کرکے فرماتے ہیں فی اسنادہ ضعف یسیر یعنی اس کی سند میں کچھ ضعف ہے۔

یہ وہ روایتیں جن کی بنیاد پر غیر مقلدوں نے نماز جنازہ میں بطور تلاوت سورہ فاتحہ پڑھنے جو واجب قرار دیا ہے اور جمہور اہل اسلام کی مخالفت کی ہے قبل اس کے کہ ہم نسائی اور بخاری کی روایت اور دیگر روایتوں پر تحقیقی نظر ڈالیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ بتلا دیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اس بارے میں جو رواتیں ہیں سب کی سب ضعیف اور نا قبل اعتبار ہیں سنیئے اس بارے میں غیر مقلدوں کے بڑوں میں سے حافظ ابن قیم حافظ ابن تیمیہ کے شاگرد کا فیصلہ ابن قیم زادالمعاد میں فرماتے ہیں۔

ویذ کر عن النبی صلی الله علیه وسلم انه امر ان یقر ا علی الجنازة بفاتحة الکتاب و لا یصح اسنا ده .

یعنی آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ پر سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا تھا (جن

روایتوں میں یہ ہے) ان کی سند صحیح نہیں ہے ابن قیم کا یہ بیان سو فی صد صحیح ہے کوئی شخص صحیح سند سے یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ آنحضور ﷺ نے صحابہ کرام کو نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا تھا اس سلسلہ میں جو کچھ صحیح طور پر ثابت ہے وہ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوامامہ کا اپنا عمل اور قول ہے صحابہ کرام میں سے ان دو کے علاوہ کسی اور سے صحیح سند سے یہ ثابت نہیں ہے کہ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کو اس نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بتلایا ہو آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں خلفائے راشدین کا جو مقام ہے اس سے کون ناواقف ہے مگر کسی ایک بھی خلیفہ راشد سے یہ ثابت نہیں ہے کہ اس نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھا ہو یا اس کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بتلایا ہو بلکہ جیسا کہ آئندہ چل کر معلوم ہوگا کہ بعض خلفائے راشدین سے بطور صراحت ثابت ہے کہ وہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔

پورے ذخیرہ احادیث میں صرف حضرت ابن عباس اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہما ہی سے صحیح سند سے یہ مروی ہے کہ سورہ فاتحہ کا پڑھنا سنت ہے اس لیے ہم اپنی گفتگو کا مرکز انہیں دونوں صحابہ کی دونوں حدیثوں کو بناتے ہیں اور ان حضرات کی حدیث سے فی الاصل کیا ثابت ہوتا ہے وہاں تک پہنچنے کی ہم کوشش کریں گے۔

بخاری شریف میں امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عوف سے جو کچھ نقل کیا ہے اسے آپ ایک بار اور پڑھ لیں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

صلیت خلف ابن عباس رضی الله عنهما علی جنازة فقر أ بفا تحه الکتاب قال لتعلمو انها سنة .

حضرت عبداللہ بن عوف فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی تو آپ نے سورۃ فاتحہ پڑھی اور فرمایا کہ تا کہ تم لوگ جان لو کہ یہ سنت ہے۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایسے جلیل القدر محدث ہیں کہ ان کے بارے میں زیادہ لب کشائی کرنے کی میں اپنے اندر جرأت نہیں کر پاتا، تاہم اس حقیقت کا اظہار صورت کو واقعہ بیان کرنے اور اظہار حق اور مسئلہ کی شرعی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کبھی حدیث کا ایسا اختصار کرتے ہیں کہ حدیث کا مفہوم کچھ سے کچھ جاتا ہے اور مسئلہ کی اصل حقیقت واضح نہیں ہو پاتی حدیث کا مفہوم کچھ ہوتا ہے اور امام بخاری کے اختصار سے اس کا مفہوم بالکل دوسرا ہو جاتا ہے (۱)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حدیث میں ضعف و اختصار کی ایک بہت ہی عجیب و غریب مثال مزید ملاحظہ فرمایئے مسلم شریف میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حضرت عطار کی روایت سے قرأت خلف الامام کے سلسلہ کی یہ حدیث ہے

سألت زید بن ثا بت عن القرة مع الا ما م فقال لا قراۃ مع الاما م فی شئی وزعم انه قرأ علی رسول الله صلی الله علیه وسلم ، والنجم اذا هوی فلم یسجد یعنی حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے امام کے ساتھ مقتدی کو قرأت کرنے کے بارے میں پوچھا تو حضرت زید نے فرمایا امام کے ساتھ کچھ پڑھنا نہیں ہے اور حضرت

زید نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سورہ والنجم کی تلاوت کی تو اس میں انہوں نے سجدہ نہیں کیا۔ حضرت زید کی روایت اس بات میں صریح تھی کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنا درست نہیں ہے، چونکہ یہ بات امام بخاری کے مذہب کے خلاف تھی اس وجہ سے جب انہوں اس حدیث کو مسلم ہی والی سند سے اپنی کتاب بخاری شریف میں ذکر کیا تو انہوں نے قرأت خلف الامام والی بات کو حدیث سے بالکل اڑا دیا امام بخاری نے اس حدیث کو سجدہ تلاوت کے بیان میں ذکر کیا ہے اور ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے،

عن عطاء بن یسار انه اخبره انه سأل زید بن ثابت رضی الله عنه فزعم انه قرأعلی النبی ﷺ والنجم فلم یسجدفیها؛ دیکھئے امام بخاری نے حضرت عطاء نے حضرت زید بن ثابت سے جس مسئلہ قرأت خلف الامام کے بارے میں سوال کیا تھا اس کو بالکل حذف کر دیا اور جو بات حضرت عطا نے پوچھی نہیں تھی اس کو ذکر کیا امام بخاری کی حدیث میں قطع برید سے حدیث کی عبارت بھی غلط سلط ہوگئی مسلم میں جو پوری روایت ہے اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں اور امام بخاری نے حدیث کی جو عبارت ذکر کی ہے اس کا ترجمہ ملاحظہ فرما کر آپ خود اندازہ لگالیں کہ حدیث کا کیا یہی مفہوم تھا ترجمہ یہ ہے ابن قسیط عطاء بن یسار سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عطاء نے ان کو بتلایا کہ انہوں نے زید

بقیہ اگلے صفحے پر

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو حدیث ذکر کی ہے وہی حدیث نسائی میں پوری مذکور ہے مضمون کے شروع میں تیسری حدیث دیکھئے طلحہ بن عبداللہ بن عوف فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس کے پیچھے ایک جنازہ کی نماز پڑھی تو میں نے سنا کہ وہ سورہ فاتحہ پڑھ رہے ہیں تو جب انہوں نے سلام پھیرا تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور پوچھا کہ آپ جنازہ میں قرأت کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہاں یہ حق ہے اور سنت ہے۔

آپ غور فرمائیں کہ اس پوری اور مکمل حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس کا جنازہ میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا ایک اجنبی اور غیر معروف عمل تھا جنازہ میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا صحابہ کرام کا معمول نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ طلحہ بن عبداللہ کو حضرت ابن عباس کا یہ عمل باعث تعجب معلوم ہوا اور ان کو اس بارے میں سوال کرنا پڑا، اگر صحابہ کرام میں یہ سنت رائج ہوتی تو حضرت طلحہ کو اس پر تعجب کیوں ہوتا اور حضرت عبداللہ بن عباس سے سوال کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی نیز یہ معلوم ہوا کہ خود حضرت طلحہ بن عبداللہ نے وہاں کے عام رواج کے مطابق جنازہ کی نماز میں سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی تھی اگر انہوں نے

بن ثابت سے پوچھا تھا پس زید بن ثابت نے کہا کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سورہ والنجم کی تلاوت کی تھی تو آپ نے سجدہ نہیں کیا

حضرت عطاء نے جس بات کو پوچھا تھا اس کو امام بخاری نے حذف کر کے حدیث کا مفہوم ہی کچھ سے کچھ کر دیا۔

حافظ ابن حجر جو امام بخاری کے بڑے مداح ہیں وہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے حضرت زید بن ثابت کے اس حصہ کو جس سے

ان کو غرض نہیں تھی حذف کر دیا اور اس وجہ سے بھی حذف کر دیا کہ امام بخاری حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے قرأت خلف الامام کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں فتح الباری ص ۵۵۵ ج ۲

سورۃ فاتحہ کو پڑھا ہوتا تو وہ اس بارے میں حضرت ابن عباس سے سوال کیوں کرتے اور انہیں حضرت ابن عباس کے سورہ فاتحہ پڑھنے پر تعجب کیوں ہوتا ؟

غرض حضرت طلحہ والی حدیث یہ خود ببانگ دہل بتلا رہی ہے کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی جاتی تھی ، اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کوئی دائمی عمل ہوتا اور سورہ فاتحہ پڑھنا بطور قرأت مشروع ہوتا تو ناممکن تھا کہ صحابہ کرام سے یہ سنت پوشیدہ رہتی اور حضرت ابن عباس کو یہ بتلانے کی ضرورت پڑتی کہ یہ سنت ہے جب کہ جنازہ کا معاملہ کبھی کبھار کا معاملہ نہیں ہے وہ تو عموما پیش آنے والا معاملہ ہے اور جنازہ کا سنت طریقہ ہے اور کیا کیا نہیں ہر عام وخاص کو معلوم ہوتا ہے خصوصا صحابہ کرام کا زمانہ ایسا نہیں تھا کہ عموما پیش آنے والا جنازہ کا صحیح اور مسنون طریقہ بھی انہیں معلوم نہ ہو بہر حال حضرت ابن عباس کا جنازہ میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا خود اجنبی فعل تھا ، اور صحابہؓ میں یہ فعل غیر معمول بہ اور غیر معروف تھا ، اور یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ کو یہ کہنا پڑا کہ لیس ذالک بمعمول بہ انما ھوالدعا ادرکت اھل بلادنا علیٰ ھذا (المدونہ ج ۱ ص ۱۷۴)

یعنی نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کے پڑھنے پر عمل نہیں ہے ۔ جنازہ میں تو صرف میت کے لئے دعا ہے میں نے اہل مدینہ کو اسی پر پایا ہے ۔

غرض اگر امام بخاری کی مختصر حدیث کو نہیں بلکہ نسائی میں جس طرح یہ پوری حدیث ہے اس کو سامنے رکھا جائے تو خود اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عہد صحابہؓ میں سورہ فاتحہ کو بطور قرأت کے نماز جنازہ میں پڑھنا متعارف عمل نہیں تھا ، اور نہ اس پر عام صحابہؓ کرام کا عمل تھا اور صحابہ کرام کے درمیان جو چیز غیر متعارف ہو اس کو آنحضورﷺ کی سنت نہیں قرار دیا جا سکتا ورنہ صحابہ کرام پر الزام عائد ہوگا کہ انہوں نے آنحضورﷺ کی سنت سے لاپرواہی برتی ۔ میں زمزم میں بار بار یہ بتلا چکا ہوں کہ آنحضورﷺ کی متعارف سنت وہی عمل ہوگا جسے عام صحابہؓ کرام نے اپنی زندگی کا دائمی یا اکثری معمول بنایا ہو ، اور وہ عمل آنحضور اکرمﷺ کا دائمی یا اکثری معمول بہ رہا ہو ، گاہے گاہے عمل کو سنت مستمرہ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ۔

اب سوال یہ ہے کہ جب اس مسئلہ کی صورت حال یہی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یا خلفائے راشدین یا عام صحابہ کرام سے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا بطور قرأت کے ثبوت نہیں ہے تو پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یا حضرت ابو امامہ نے یہ کیوں فرمایا کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا سنت ہے ؟

تو گزارش ہے کہ حضرت ابن عباس یا حضرت ابو امامہ نے سورہ فاتحہ پڑھنے کو بطور قرأت سنت نہیں فرمایا ہے بلکہ ان حضرات کا مقصود یہ تھا کہ جس طرح نماز جنازہ میں تکبیر اولیٰ کے بعد ثنا اپنے مخصوص متعارف الفاظ کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اسی طرح یہ بھی سنت ہے کہ سورۃ فاتحہ کو بھی نماز جنازہ میں بطور ثنا پڑھا جائے ، آنحضور اکرمﷺ سے سورۃ فاتحہ کا بطور ثنا پڑھنا ثابت ہے مگر چونکہ یہ طریقہ صحابہ کرامؓ کا عام طور پر معمول بہ نہیں تھا ، اسلئے حضرت ابن عباس نے ایک دفعہ نماز جنازہ میں زور سے ثنا کی جگہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر بتلا دیا کہ نماز جنازہ

کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ کی حمد وثنا سورۃ فاتحہ سے کی جائے۔ حضرت ابوامامہ کی حدیث کا بھی یہی مطلب ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس یا حضرت ابوامامہ کی حدیث میں ثنا کا الگ سے کہیں ذکر نہیں ہے، اگر سورۃ فاتحہ کا نماز جنازہ میں پڑھنا بطور تلاوت ہوتا جیسا کہ عام نمازوں میں ہوتا ہے تو پھر الگ سے ثنا پڑھنے کا ذکر بھی تکبیر اولیٰ کے بعد ہونا چاہئے تھا، مگر کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ کو حضرت ابن عباسؓ نے ثنا کی جگہ پڑھا تھا، اور چونکہ یہ مسلمانوں کے عام معمول کے خلاف تھا اس وجہ سے حضرت طلحہؓ کو اس پر تعجب ہوا اور انہوں نے اس پر اعتراض کیا، تب حضرت ابن عباسؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ بھی آنحضور ﷺ کا ایک طریقہ تھا۔

سورۃ فاتحہ کا نماز جنازہ میں پڑھنا بطور تلاوت نہیں تھا بلکہ ثنا کی جگہ تھا اس کی وضاحت حضرت ابوامامہ والی روایت میں ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

حضرت ابوامامہ فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر میں سورۃ فاتحہ آہستہ سے پڑھی جائے پھر تین تکبیر کہی جائے اور آخر میں سلام پھیرا جائے۔ اس حدیث میں غور فرمائیں کہ پہلی تکبیر کے بعد صرف سورۃ فاتحہ کا ذکر ہے جو ثنا کی جگہ ہے، پھر جو تین تکبیریں ہیں ان میں دوسری میں درود شریف پڑھی جاتی ہے تیسری تکبیر میں میت کے لئے دعا پڑھی جاتی ہے، اور چوتھی تکبیر کہنے کے بعد سلام پھیر کر نماز ختم کردی جاتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوامامہؓ کی حدیث کا یہی مطلب ہے، اس مطلب کو اختیار کرنے پر کسی قسم کا کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا نہ جمہور مسلمین کی مخالفت کا الزام عائد ہوتا ہے۔ تمام مسلمانوں کے نزدیک سورۃ فاتحہ کو اگر ثنا کی جگہ پڑھا جائے تو جائز ہے۔ اور یقیناً یہ طریقہ بھی آنحضور ﷺ سے ثابت ہے ورنہ حضرت ابن عباسؓ یا حضرت ابوامامہؓ جیسے اجلاء صحابہ اس کو آنحضور ﷺ کی سنت نہ بتلاتے۔ اور جو میں نے یہ کہا کہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا بطور تلاوت نہیں بلکہ بطور ثنا پڑھنا بعض صحابہ کرامؓ کا معمول تھا، اس کی تائید مزید حضرت حافظ ابن عبدالبر کے اس بیان سے ہوتی ہے جس کو انہوں نے اپنی مشہور کتاب الکافی میں ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

وليس فى الصلوٰة على الجنازة قرأة عندمالک و اصحابه و جماعة من اهل المدينة وقال جماعة من كبراء اهل المدينة يقرأ بعد التكبيرة الاولىٰ بام القرآن وبعد الثانية يصلي على النبى ﷺ ثم يدعو للميت بعد الثالثة .

یعنی نماز جنازہ میں قرآن کا پڑھنا امام مالکؒ اور ان کے اصحاب اور اہل مدینہ کی ایک جماعت کے نزدیک نہیں ہے، اور اہل مدینہ کے بڑوں کی ایک جماعت کا یہ کہنا ہے کہ تکبیر اولیٰ کے بعد سورۃ فاتحہ پڑھا جائے گا، اور دوسری تکبیر کے بعد درود شریف اور تیسری کے بعد میت کے لئے دعا کی جائے گی۔

دیکھئے حافظ ابن عبدالبر کے اس بیان سے بھی معلوم ہوا کہ اہل مدینہ سے جن لوگوں کے نزدیک سورۃ فاتحہ کا پڑھنا مشروع ہے اس کی جگہ ثنا کی جگہ ہے نہ کہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا بطور تلاوت مسنون ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کے نزدیک سورۃ فاتحہ کو بطور دعا پڑھا جائے گا۔ وہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔

ومن السنة قرأة فاتحة الكتاب لانها خير الادعية و اجمعها (ج ۲ ص ۳٦)

یعنی نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا مسنون ہے اس وجہ سے کہ وہ بہترین اور جامع ترین دعا ہے۔

یعنی شاہ صاحب بھی بطور تلاوت نہیں بلکہ سورۃ فاتحہ کو نماز جنازہ میں بطور دعا پڑھنے کو مسنون قرار دیتے ہیں، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز جنازہ میں کوئی متعین دعا نہیں ہے کہ اسی کو پڑھا جائے گا دوسری دعا کو نہیں پڑھا جاسکتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں۔

لم یوقت لنا رسول الله ﷺ قولاً ولا قرأة واختر من الدعاء ما اطيبه

یعنی آنحضورﷺ نے ہمارے لئے نماز جنازہ میں کوئی متعین دعا اور متعین قرآن کا پڑھنا مخصوص نہیں کیا ہے، اچھی سے اچھی جو دعا ہے اس کو پڑھو۔

اس سے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ کو بطور دعا بھی پڑھا جاسکتا ہے اس لئے کہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ یہ بہترین اور جامع ترین دعا ہے جس کو اللہ نے اپنے بندوں کو سکھلایا ہے۔

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر مقلدین کا یہ دعویٰ کرنا کہ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا بطور تلاوت مسنون ہے، حقائق کی روشنی میں صحیح نہیں ہے، اور بخاری شریف اور نسائی شریف کی اس بارے میں جن روایتوں کو انہوں نے اپنا متدل قرار دیا ہے ان کا قطعاً وہ مطلب نہیں ہے جو انہوں نے سمجھا ہے اور حق اور صحیح بات یہی ہے کہ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کو بطور تلاوت کرنا آنحضورﷺ سے یا خلفائے راشدین سے یا کبار صحابہؓ اور جمہور مسلمین سے ثابت نہیں ہے، ہاں سورۃ فاتحہ کو ثنا کی جگہ پر بطور حمد و ثنا یا قرأت بطور دعا پڑھا جاسکتا ہے اس کا کوئی منکر نہیں ہے اور یہی احناف کا بھی مسلک ہے (۱)

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا جو یہ مسلک ہے کہ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ بطور تلاوت پڑھنا مسنون نہیں ہے تو اس کے دلائل کیا ہیں تو پہلے یہ معلوم کر لیجئے کہ نماز جنازہ عام نمازوں کی طرح سے کوئی نماز نہیں ہے کہ اس میں سورۃ فاتحہ پڑھنا مسنون یا واجب ہو، حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ کا مقصود میت کے لئے دعا کرنا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ومقصود الصلوٰة على الجنازة هو الدعاء للميت لان اجتماع امة من المؤمنين شافعين للميت له تاثير بليغ فی نزول الرحمة عليه (زادالمعاد ج ۲ ص ۳)

حاشیہ اگلے صفحے پر

یعنی میت پر نماز اس لئے مشروع ہوئی ہے کہ اہل ایمان کی ایک جماعت کا میت کی شفاعت کے لئے جمع ہونا اللہ کی اس پر رحمت کے نازل ہونے کے لئے بڑا مؤثر ذریعہ ہے۔

غرض نماز جنازہ میت کی شفاعت کی دعا اور اس کی بخشش کی دعا کے لئے ہے، جب کہ نماز پنجگانہ کا مقصود اللہ سے مناجات اور اس کے دربار میں پانچ وقت کی حاضری اپنی عبدیت کا اظہار ہے اور یہی وجہ ہے کہ نماز پنجگانہ تو ہر عاقل بالغ مرد اور عورت پر فرض ہے اور

مردوں کے لئے نماز باجماعت مسجد میں پڑھنے کی تاکید ہے جب کہ نماز جنازہ سب پر پڑھنا فرض نہیں ہے،
یہ نماز فرض کفایہ ہے کچھ لوگ نے پڑھ لیا تو سب کے ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے، اور چونکہ دونوں نمازیں الگ الگ اور ان کا مقصود بھی الگ الگ ہے اس وجہ سے ان کے احکام بھی الگ الگ ہیں اور ان کا طریقہ بھی الگ الگ ہے نماز جنازہ کس طرح سے پڑھی جائے گی تو اس بارے میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث ملاحظہ ہو جس کو امام مالک نے اپنی کتاب
موطا میں ذکر کیا ہے۔

(ا) حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت پر عمل میں ایک اشکال یہ بھی ہے کہ ان کی روایات میں الگ الگ بات ہے، بخاری کی روایت میں صرف سورۃ فاتحہ کا ذکر ہے کسی اور سورۃ کا ذکر نہیں ہے نیز اس میں جہر کا لفظ بھی نہیں ہے، نسائی شریف کی انہیں کی روایت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ ایک مزید سورۃ کا بھی ذکر ہے اور اس میں جہر و اسمعنا کا لفظ بھی ہے کہ زور سے پڑھا اور ہم کو سنایا، نسائی شریف کی دوسری روایت میں صرف سورۃ فاتحہ کا ذکر ہے اس میں جہر و اسمعنا کا لفظ بھی نہیں ہے، یہ سب روایتیں حضرت عبداللہ بن عوف ہی کے طریق سے ہیں، اب واللہ اعلم اس میں کونسی روایت صحیح ہے اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ محدثین کی اصطلاح میں اس طرح کی روایت مضطرب کہلاتی ہے جو قابل حجت و استدلال نہیں ہوتی

(نورالدین نوراللہ الاعظمی)

حضرت سعید اپنے والد حضرت ابو سعید سے ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ نماز جنازہ کیسے پڑھتے ہیں تو حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ بخدا میں تم کو اس کا طریقہ بتلاؤں گا میں گھر والوں کے ساتھ جنازہ میں شریک ہوتا ہوں جب جنازہ نماز کے لیے رکھا جاتا ہے تو میں تکبیر کہتا ہوں اور اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہوں پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتا ہوں پھر میں یہ دعا پڑھتا ہوں اللھم انی عبدک وابن عبدک الخ

اس روایت میں جو بالکل صحیح روایت ہے اور نماز جنازہ کا حضرت ابوھریرہ نے طریقہ بتلایا ہے ناظرین دیکھ لیں اور اس میں کہیں سورہ فاتحہ پڑھنے کا ذکر نہیں ہے۔

موطا ہی میں حضرت عبداللہ بن عمر کے بارے میں ان کے شاگرد حضرت نافع فرماتے ہیں۔

ان عبدالله کا ن لا یقر أ فی الصلو ۃ علی الجنا زۃ .

یعنی نماز جنازہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ قرآن کی تلاوت نہیں کرتے تھے۔

بدائع الصنائع میں ہے،

روی عن عبدالرحمن وابن عمر انھما قالا لیس فیھما قرأۃ شئی من القرآن ج ا ص ۲۱۲.

یعنی عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ نماز جنازہ میں قرآن سے کچھ پڑھنا نہیں ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علی سے یہ روایت ہے۔

عن علی انہ کا ن اذا صلی علی میت یبدا بحمداللہ ویصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم یقول اللھم اغفر لا حیا ئنا و امو تنا والف بین قلو بنا و اصلح ذات بیننا و اجعل قلو بنا علی قلو ب خیارنا ص ۲۹۵

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ جب نماز جنازہ پڑھتے تو پہلے اللہ کی حمد وثنا کرتے تھے پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتے اور پھر یہ دعا پڑھتے۔ اللھم اغفر لا حیا ئنا و امواتنا الخ .

مدونتہ میں ہے، حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر حضرت عبید بن فضالہ، حضرت ابوھریرہ، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت واثلہ بن اسقع، حضرت قاسم، حضرت سالم بن عبداللہ، حضرت ابن مسیّب، حضرت ربیعہ، حضرت عطاء، اور حضرت یحیٰ بن سعید رضی اللہ عنہم ورحمہم اللہ یہ تمام اجلاء وکبارِ صحابہ وتابعین لم یکون یقرأون فی الصلو ۃ علی المیت نماز جنازہ میں قرآن نہیں پڑھا کرتے تھے۔ (ص۱۷۴ج۱)

حضرت امام شعبی جن کی ملاقات پانچ صحابی سے ثابت ہے ان کے بارے میں مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ وہ نماز جنازہ کے بارے میں فرماتے تھے۔

پہلی تکبیر میں اللہ کی حمد وثنا کی جائے گی اور دوسری میں درود شریف اور تیسری میں تکبیر میں میت کے لیے دعا کی جائیگی اور چوتھی میں تکبیر سلام کے لیے ہوگی،

حضرت ابراہیم نخعی، حضرت حماد، حضرت عطاء، حضرت طاوس، حضرت بکر بن عبداللہ، حضرت ابو لعالیہ، وغیرہ جلیل القدر تابعین میں سے کوئی ایک بھی نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا قائل نہیں تھا جس کی پوری تفصیل مصنف ابن ابی شیبہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس تفصیل سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین کے زمانہ میں نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ یا قرآن کا کچھ حصہ پڑھنے کا عمومی رواج نہیں تھا اور نہ قرآن کا پڑھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعارف سنت تھی ورنہ غیر ممکن تھا کہ یہ سنت حضرت عمرؓ حضرت علیؓ جیسے اجلاء صحابہ اور خلفائے راشدین میں سے مخفی رہتی اور حضرت ابن عمر جیسا سنت کا شیدائی یہ کہتا کہ نماز جنازہ میں قرآن کی قرأت وتلاوت نہیں ہے۔

انہیں دلائل کی روشنی اور انہیں اکابر صحابہ وکبار تابعین کی تقلید اور اتباع میں حضرات مالکیہ اور حضرات احناف کا عمل یہ ہے کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ یا قرآن کا کوئی حصہ بطور تلاوت مشروع ومسنون طریقہ نہیں ہے، ہاں سورہ فاتحہ یا قرآن کا کوئی اور حصہ بطور ثنا یا دعا کے پڑھا جاسکتا ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوامامہ کی روایت کا تقاضا ہے۔ البتہ زور سے نماز میں نہ دعا پڑھنی ثابت ہے اور نہ سورہ فاتحہ یہ غیر مقلدین کا بالکل شاذ عمل ہے اور شیعوں کی اقتداء اور ان کی تقلید ہے تمام اہل سنت نماز جنازہ میں جو کچھ پڑھتے ہیں آہستہ پڑھتے ہیں اور اس کا ثبوت صحیح حدیث سے ہے نماز جنازہ زور سے پڑھنا یہ شیعوں کا مذہب ہے حضرت عبداللہ بن عباس نے نماز جنا

زہ میں سورہ فاتحہ جوایک دفعہ زور سے پڑھا تھااس کی وجہ انہوں نے خود حدیث میں بتلادی تھی کہ تعلموا انھا سنۃ ،تا کہ تم لوگ جان لو کہ سورہ فاتحہ کا بطور حمد وثنا کا پڑھنا بھی نماز جنازہ کا ایک طریقہ ہے نہ یہ کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ یا دعا یا کوئی اور چیز کا زور سے پڑھنا مسنون ہے بطور تعلیم خود آنحضور ﷺ بعض ان چیزوں کا جن کا سراً پڑھنا مسنون ہے کبھی ان کا جہراً پڑھنا بھی ثابت ہے اب اگر ان احادیث کے پیش نظر کوئی ان کو سرا کی جگہ جہراً ہی پڑھنا شروع کردے تو حدود شرع سے تجاوز کرنے والا ہوگا۔

محمد ابوبکر غازی پوری

عورتوں کو مسجد میں نماز کے لیے
حاضر ہونے کا مسئلہ

ادھر کچھ روز سے غیر مقلدوں میں عورتوں کو مسجد میں حاضر ہونے کے مسئلہ کو بڑے زور وشور سے ابھارا جا رہا ہے گویا اسی ایک مسئلہ پر اسلام اور اسلامی احکام کے بقاء کا مدار ہے اور اسلام کی دعوت وتبلیغ کا کام پورا نہیں ہوسکتا جب تک کہ عورتوں کو مسجد میں لا کر نماز پڑھوا دی جا ئے۔ سوال یہ ہے کہ جو مسئلہ غیر اہم تھا اس کو اتنی اہمیت کے ساتھ اچھالا کیوں جا رہا ہے؟ کیا قرون اولی یعنی صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کے زمانہ میں عورتوں کو مسجد میں پنج وقتہ حاضری کے لیے اتنا زور دیا جاتا تھا؟ اس زمانہ میں سے پہلے کبھی اس مسئلہ کو اتنی شدت کے ساتھ ابھا را گیا تھا جتنی شدت کے ساتھ غیر مقلدین اس مسئلہ کو آج ابھار رہے ہیں۔

اسلاف امت میں سے کسی ایک کے بارے میں غیر مقلدین یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انہوں نے عورتوں کو مسجد میں حاضر ہونے پر تعریفی کلمات کہے ہوں، یا اس عمل کی انہوں نے ہمت افزائی کی ہو، یا عورتوں کو مسجد میں نہ آنے پر ناگواری کا اظہار کیا ہو یا عورتوں کو مسجد میں آنے کی دعوت وتبلیغ کی ہو یا اس بارے میں کوئی رسالہ یا کتاب لکھی ہو؟

اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے تو پھر ناظرین یہ سوچنے میں برحق ہیں کہ آخر آج کے غیر مقلدوں میں یہ ابال کیوں آیا، اور انہوں نے عورتوں کو مسجد میں پنج وقتہ حاضری کے مسئلہ کو حق وباطل کا مدار کیوں بنایا اور اتنے زور شور کے ساتھ اس پندرہویں صدی کی ابتداء میں اس کی دعوت وتبلیغ کیوں کرنے لگے، حتی کہ جو چیز صرف مباح تھی انہوں نے اپنے عمل اور اپنے قول سے اس کو واجب کے درجہ تک پہونچا دیا اور دین وشریعت میں خطرناک تحریف کا کارنامہ انجام دیا۔

ناظرین کی حیرانی اپنی جگہ پر برحق ہے ہمیں بھی یہ حیرانی تھی، مگر جب ہم نے غیر مقلدین کے مذہب وعقیدہ اور ان کے افکار وخیا لات کا گہرائی سے جائزہ لیا تو ہماری یہ حیرانی ختم ہوگئی۔

اصل میں بات یہ ہے کہ شیعوں اور غیر مقلدوں کے مابین عقائد ومسائل میں بڑی حد تک اشتراک ہے، اور ان دونوں اہل سنت والجماعت سے خارج فرقوں کو عمومی طور پر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین سے چڑ ہے، چنانچہ ان دونوں فرقوں نے اپنا یہ عقیدہ بنایا کہ نہ صحابہ کرام کا فعل حجت ہے اور نہ ان کا قول حجت ہے حتی کہ صحابہ کرام اگر کسی مسئلہ پر اجماع بھی کر لیں تو یہ دونوں فرقے صحابہ کرام کا اجماع اور ان کے اجماعی فیصلہ کو بھی ٹھکرا دیتے ہیں جیسے طلاق اور تراویح اور جمعہ کی اذان ثالث کا مسئلہ ہے اور تینوں مسئلوں میں ساری امت نے صحابہ کرامؓ کے اجماعی فیصلہ کو قبول کر لیا مگر غیر مقلدین اور شیعوں نے اس کا انکار کیا، اب نہ شیعوں کے نزدیک تین طلاق تین ہیں اور نہ غیر مقلدین کے نزدیک اور نہ شیعہ، تراویح اور تراویح کی بیس رکعت کے قائل ہیں نہ غیر مقلدین تراویح اور تراویح کی بیس رکعت کے قائل نہ شیعوں نے جمعہ کی اذان ثالث جواب پہلی اذان کہلاتی ہے کو قبول کیا اور نہ غیر مقلدین نے اسے قبول کیا، یہ تو شیعوں اور غیر

مقلدوں کا عام صحابہ کرامؓ کے بارے میں رویہ ہے مگر یہ دونوں فرقے بالخصوص حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے زیادہ چڑے ہوئے ہیں شیعوں کا حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہ سے چڑھا ہوا ہونا تو سب کو معلوم ہے مگر یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ غیر مقلدین بھی حضرت عائشہ اور حضرت عمرؓ سے کبیدہ خاطر رہتے ہیں اور ان کے قلوب ان دونوں گرامی قدر شخصیتوں سے منشرح نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ غیر مقلدین کو ان دونوں صحابہ کرام کے بارے میں بدزبانی وبدکلامی تک سے باک نہیں ہوتا۔

طلاق اور تراویح کے بارے میں غیر مقلدین کی تحریرات جن کو پڑھنے کا اتفاق ہوا ہوگا اس نے محسوس کیا ہوگا کہ حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ کس درجہ گستاخ ہیں اور اس خلیفہ راشد فاروق بین الحق والباطل کے بارے میں ان کی زبان سے کتنے بیہودہ کلمات نکلتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں بھی غیر مقلدین جرأت بیجا کا بلا تکلف اظہار کرتے ہیں ان کے بڑے میاں نے فتاوی نذیریہ میں حضرت عائشہ کے فہم پر عدم اعتماد کا برملا اظہار کیا ہے اور اسی فتاویٰ نذیریہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین الهدا ویتبع غیر سبیل المو منین ،

کا مصداق ٹھہرایا گیا ہے چونکہ مسجد میں عورتوں کا جانا لوگوں کے بدلتے ہوئے اخلاق واحوال کو دیکھ کر نہ حضرت عائشہؓ کو پسند تھا اور نہ حضرت عمرؓ کو اس وجہ سے ان کی مخالفت میں عورتوں کو مساجد میں لیجانے کی زورازوری اور شوراشوری کا ہنگامہ ان غیر مقلدوں نے کھڑا کر رکھا ہے ان غیر مقلدوں کے مکروفریب کی بات یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس مسئلہ میں اصل حقیقت سے آگاہ نہیں کرتے بلکہ کتاب وسنت کا نام لے لے کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

بہرحال آیئے ہم دیکھیں کہ عورتوں کو مسجد میں جانے یا نہ جانے کے مسئلہ کی اصل نوعیت کیا ہے اس مسئلہ کو ہم امام بخاری اور حافظ ابن حجر کی تحقیقات کی روشنی میں طے کرنے کی کوشش کریں گے۔

قبل اس کے کہ اس مسئلہ میں امام بخاری اور حافظ ابن حجر کی تحقیقات پیش کریں چند ابتدائی باتیں ناظرین کے ملاحظہ میں لانا چاہتے ہیں جس سے انشا اللہ مسئلہ زیر بحث کی نوعیت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

پہلے تو ہم اس پر غور کرلیں کہ کیا عورتوں کی مسجد میں حاضری شریعت کا مطلوب ومقصود ہے؟ جب ہم اس بارے میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں اس کا جواب نفی میں ملتا ہے اس لیے کہ کتاب وسنت میں عورتوں کے بارے میں جو سب سے زیادہ تاکید کے ساتھ حکم ملتا ہے وہ یہ ہے کہ عورتوں کو زیادہ سے زیادہ ستر پوشی کے ساتھ اور پردہ میں رہنا چاہیے قرآن میں خود ازواج مطہرات کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وقر ن فی بیو تکن یعنی تم اپنے گھروں میں جم کر کے رہو، نیز ازواج مطہرات اور تمام مسلمان عورتوں کو پردہ کا حکم دیا گیا ہے قرآن کا ارشاد ہے،

یا ایها النبی قل لا زوا جک وبنا تک ونساء المو منین ید نین علیهن من جلا بیبهن

یعنی اے نبی ﷺ کہہ دیجیے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں کو نیچے لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں اور ایک جگہ ارشاد ہے۔

وقل للمؤمنا ت يغضضن من ابصا ر هن

اور آپ فر مادیں ایمان والیوں سے کہ وہ نیچی رکھیں اپنی نگاہیں۔

غرض قرآن کے ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے سلسلہ میں اصل یہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ستر اور پردہ میں رہیں اور تاحد امکان مردوں سے ان کا خلا ملا نہ ہو، اور یہی وجہ ہے کہ بلا وجہ بلا عذر شرعی مردوں کا عورتوں کو دیکھنا یا عورتوں کا مردوں کو دیکھنا حرام ہے۔

اور چونکہ مردوں کے اجتماعات میں عورتوں کی شرکت سے بہت زیادہ مفاسد کا اندیشہ ہوتا ہے اس وجہ سے اگر کوئی دینی شدید ضرورت نہ ہو تو ان اجتماعات میں عورتوں کی شرکت کو ناپسند سمجھا گیا ہے بلکہ ان کی شرکت اگر اندیشہ فتنہ ہو تو حرام ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کا خلا ملا یا ان کے اجتماع کی جگہوں میں عورتوں کا پایا جانا شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے اسی وجہ سے نماز جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کے لیے بھی مسجد میں ان کی حاضری کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی گئی، اور اسے شریعت نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح سے مردوں کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تاکیدی احکام تھے کہ وہ مسجد میں حاضر ہو کر جماعت سے نماز پڑھا کریں اس طرح کے تاکیدی احکام عورتوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہیں مردوں کے بارے میں آپ کا یہ ارشاد عام پڑھے لکھوں کو بھی معلوم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت میں نہ حاضر ہونے والوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ اگر مجھے بچوں اور عورتوں کا خیال نہ ہوتا تو میں انکے گھروں میں آگ لگا دیتا یہ دھمکی مردوں کے لیے تھی عورتوں کے لیے نہ تھی اور نہ کسی حدیث میں عورتوں کو تاکید کے ساتھ مسجد میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا ہے یہ ضرور ہے کہ ان کو منع بھی نہیں کیا گیا ہے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا یہی تھا کہ عورتیں گھروں میں نماز پڑھا کریں یہی ان کے لیے زیادہ افضل اور اولی ہے اس بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

والا تمنعو انسا ئکم المسا جد وبیوتھن خیر لھن ابو داؤد فتح البا ری جلد ۲ ص ۳۵۰)

اپنی عورتوں کو مسجد میں آنے سے مت روکو اور ان کے گھر ان کے مسجد میں آنے سے بہتر ہیں اس حدیث کو ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔

مسند احمد بن حنبل اور طبرانی کی روایت ہے کہ ام حمید ساعدیہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائیں اور آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم انی احب الصلو ۃ معک ،

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری تمنا ہوتی ہے کہ میں آپ کے ساتھ نماز پڑھو آپ ﷺ نے فرمایا قد علمت ؛

ہاں مجھے پتہ ہے اس کے بعد آپ نے جو ام حمید ساعدیہ سے فرمایا وہی سننے کی بات ہے آپ نے ان سے فرمایا۔

وصلاتک فی بیتک خیر لک من صلا تک فی حجرتک وصلا تک فی حجرتک خیر من صلو تک فی دارک وصلو ٹک فی دارک خیر من صلو ٹک فی مسجد قو مک وصلو ۃ فی

مسجد قومک خیر من صلوٰتک فی مسجد الجماعة (فتح الباری ج ۲ ص ۳۵۰)

تمہارا کوٹھڑی میں نماز پڑھنا گھر کے کمرہ میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور کمرہ میں نماز پڑھنا گھر کے کھلے حصہ میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور گھر کے کھلے حصے میں نماز پڑھنا محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔

ناظرین اس حدیث میں غور کریں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہی عہد مبارک میں عورتوں کے لیے مسجد میں حاضر ہوکر مردوں کے ساتھ نماز پڑھنے کو پسند فرمایا تھا یا آپ کا منشا یہ تھا کہ عورتیں اپنے گھروں میں نماز پڑھیں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو نقل کر کے فرماتے ہیں۔

ووجب کون صلاتها فی الاخفاء افضل تحقق الامن فیه من الفتنة فتح الباری ج ۲ ص ۳۵۰)

یعنی عورتوں کا چھپی جگہوں پر نماز پڑھنا اس لیے افضل ہے کہ اس میں فتنہ کا خوف نہیں رہتا۔

نیز فرماتے ہیں۔

ویتا کد ذالک بعد وجود ما احدث النساء من التبرج والزینة ومن ثم قالت عائشة ما قالت.

(ایضاً)

اور جب عورتوں میں بننا سنورنا اور بے پردگی پیدا ہوگئی ہے تو اب یہ حکم اور بھی تاکیدی ہوگیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں حضرت عائشہ کی وہ بات ہے جو انہوں نے کہی ہے۔

اور حضرت عائشہ نے جو بات کہی جس کی طرف حافظ ابن حجر نے اشارہ کیا ہے وہ آئندہ آرہی ہے۔

بہر حال یہ بات واضح ہے کہ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عورتوں کا مسجد میں آکر نماز پڑھنا افضل اور اولی نہیں تھا اگر ان کا مسجد میں آکر نماز پڑھنا اللہ کے رسولؐ کی نگاہ میں بہتر اور افضل ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح مردوں کو مسجد میں حاضر ہونے اور شریک جماعت ہونے کی تاکید فرماتے تھے اور ان کی عدم حاضری پر ناراضگی اور ناگواری کا اظہار فرماتے تھے اسی طرح عورتوں کی مسجد میں حاضری اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا آپ تاکیدی حکم فرماتے مگر آپ ﷺ تو عورتوں کے بارے میں صاف صاف فرما رہے ہیں بیوتھن خیرلھن کہ عورتوں کا گھر ہی میں نماز پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔

غیر مقلدین جو آج بڑے جوش وخروش کے ساتھ عورتوں کو مسجد میں آنے کی اور مردوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے کی تبلیغ کر رہے ہیں وہ ایک حدیث بھی نہیں پیش کرسکتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مسجد میں آنے کی حوصلہ افزائی کی ہو اور نہ اس بارے میں صحابہ کرام میں سے کسی صحابی کا کوئی ارشاد نقل کرسکتے ہیں، اور نہ وہ ائمہ اربعہ یا کسی محدث کا اس بارے میں کوئی تاکیدی حکم دکھلا سکتے ہیں مگر وہ آج اس مسئلہ پر اپنی پوری توانائی اسطرح صرف کررہے ہیں کہ اگر آج عورتوں نے مردوں کے ساتھ مل کر مسجد میں نماز پڑھنا شروع نہیں کیا تو دین کی اساس ڈھہ جائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کا مسجد میں آ کر نماز پڑھنا پسند نہیں تھا تو آپ نے اپنے زمانہ میں ان کو صراحۃ امر فرما کر روک کیوں نہیں دیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ دین کے سیکھنے اور سیکھلانے کا زمانہ تھا آپ کے ارشادات سے بھی لوگ روشنی حاصل کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی آپ کے عہد مبارک میں عورتیں مسجد میں نماز پڑہتیں تو آپ کے عمل نماز سے وہ بہت کچھ سیکھتی بھی تھیں اور آپ کے عمل کو دیکھ کر نماز کی جو کیفیت ان کے ذہن و دماغ میں گھر بنا لیتی تھی زبانی تعلیم وتعلم سے وہ کیفیت اتنی مضبوطی سے ان کے دلوں میں گھر نہیں کر سکتی تھی اس وجہ سے آپ نے اپنے زمانہ میں عورتوں کو مسجد میں آنے سے صراحۃ منع نہیں فرمایا تھا کہ وہ اس خیر سے محروم نہ رہیں دوسری وجہ وہی ہے جس کا اظہار ام حمید سعدیہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، یعنی یا رسول اللہ انی احب الصلوۃ معک ، اے اللہ کے رسول میری خواہش ہوتی ہے کہ میں آپ کے ساتھ نماز پڑھوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عموماً آپ ہی نماز میں امامت کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھنے کی خواہش ہر مسلمان کے دل میں ابھرتی تھی خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مردوں کی طرح اس زمانہ کی عورتوں کا بھی یہی جذبہ تھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز پڑھیں اور اسکی برکات سے وہ بھی متمتع ہوں اور عورتوں کے اس جذبہ اخلاص ومحبت کا آپ کو علم بھی تھا جیسا کہ آپ نے ام حمید ساعدیہ کے مذکورہ بات کے جواب میں فرمایا قد علمت یعنی مجھے تمہارے اس جذبہ کا علم ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمت مجسم تھے عورتوں کو اگر حکماً مسجد میں آنے سے روک دیتے تو عورتوں کے اس جذبہ کو بڑی ٹھیس پہنچتی اس لیے آپ نے ان کو حکماً مسجد میں آنے روکا نہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بھی سراپا خیر وبرکت اور اصلاح وتقوی کا انتہائی معیاری زمانہ تھا اس لیے ان فتنوں کا بھی ایسا اندیشہ نہیں تھا جو بعد میں پیدا ہوئے یا ہونے والے تھے۔

مگر چونکہ بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ نبوت آنے والے فتنوں کو بھی دیکھ رہی تھی اس وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لیے گھر میں نماز پڑھنے ہی کو بہتر بتلایا اور ان کے لیے مسجد کی حاضری کو واجب قرار نہیں دیا۔

اب اگر کسی کے ذہن میں یہ شبہ ہو کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ نبوت عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے جو فتنے ابھرنے والے تھے ان کو دیکھ رہی تھی یا عورتوں اور مردوں میں آپ کے بعد کے زمانہ میں جو اخلاقی بگاڑ ہونے والا تھا آپ کی نگاہ بصیرت اس کا مشاہدہ کر رہی تھی یا عورتوں میں جو بے پردگی بناؤ سنگار تبرج اور زینت پایا جانے والا تھا اس کا آپ کو ادراک تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں اگر مذکورہ مصلحتوں کے پیش نظر عورتوں کو مسجد میں آنے سے نہیں روکا تو بعد کے لیے صراحۃ آپ یہ حکم فرما دیتے کہ ہمارے عہد میں تو عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت ہے مگر ہمارے بعد عورتوں کا مسجد میں نماز کے لیے جانا ممنوع ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ہی زمانہ مبارک کی عورتوں کے لیے یہ فرمانا کہ ان کا گھروں میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے یا آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ کوٹھڑی کی نماز عورتوں کے لیے کمرہ کی نماز سے اور کمرہ کی نماز کھلے گھر کی نماز اور کھلے گھر کی نماز محلے کی مسجد کی نماز سے اور محلے کی مسجد کی نماز جامع مسجد کی نماز سے بہتر ہے۔ یہ اس بات کی طرف واضح اشارہ تھا کہ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے افراد پر اعتماد تھا کہ جب متوقع فتنوں کا زمانہ آئے گا تو امت بذات خود ہمارے ان ارشادات کی روشنی میں مسجد میں عورتوں کے جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کرلے گی نیز اس امت کے اولی الامر اور علماء جو ورثۃ الانبیاء اور ان کے علوم کے حامل ہوتے ہیں وہ خود اللہ کے ان ارشادات کی روشنی میں جو عورتوں کے لیے مناسب ہوگا اس کا وہ حکم فرمائیں گے۔

چنانچہ جب فقہاء امت نے دیکھا کہ اب زمانہ میں بگاڑ پیدا ہوگیا ہے اور اخلاق وتقوی کا مسلمان مرد اور عورتوں میں وہ معیار باقی نہیں رہ گیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام کے عہد مبارک میں تھا تو انہوں نے عورتوں کو مسجد میں جانے سے حکماروک دیا اس لیے کہ مسجد میں حاضری کے فوائد سے زیادہ اب وہ نقصانات کا اندازہ کررہے تھے جو عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے پیدا ہورہا تھا۔

اور فقہاء امت اور مفتیان دین نے یہ فیصلہ آنحضور کرام صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی روشنی میں اور آپ کا منشاء و مراد کو سمجھ کر ہی کیا

اگر کسی کی دعوت وتبلیغ کی کوششوں سے وہی زمانہ نبوت اور عہد خیر و برکت لوٹ آئے اور عورتوں اور مردوں میں صلاح وتقوی عام ہوجائے اور عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے کسی طرح فتنہ کا کوئی اندیشہ نہ ہو عصمت و آبرو کی حفاظت پوری طرح سے ہو تو آج بھی کوئی منع نہیں کرے گا کہ عورتیں مسجد میں حاضر نہ ہوں مسجد میں حاضری کی رخصت جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی وہ رخصت آج بھی رہے گی۔ گویا عورتوں کا مسجد میں نہ آنے کا مسئلہ ممنوع لذتہ نہیں بلکہ ممنوع لغیرہ ہے۔

مگر غیر مقلدین اس مسئلہ کی حقیقت کو سمجھے بغیر اور منشاء نبوی سے عدم واقفیت کے باوصف اس مسئلہ کو اس طرح اچھال رہے ہیں کہ اگر عورتیں مسجد میں نہ آئیں اور مردوں کے ساتھ نماز نہ پڑھیں تو دین خطرہ میں پڑ جائے گا۔

خیر آیئے اب ایک نظر اس مسئلہ سے متعلق کچھ اور احادیث پر ڈال لیں جن سے خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی مسئلہ زیر بحث کے متعلق نقطہ نظر واضح ہوگا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں یہ باب قائم کیا ہے۔

باب خروج النساء الی المساجد باللیل والغلس ،

یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ عورتوں کو مسجدوں میں رات کے وقت اور صبح کے اندھیرے میں حاضر ہونا چاہئے۔

ناظرین غور فرمائیں کہ امام بخاری نے یہ مسئلہ صاف کردیا کہ عورتوں کو دن کے اجالے میں مسجد میں حاضر نہ ہونا چاہیے، یعنی ظہر عصر، مغرب، میں خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورتوں کا مسجد میں حاضر ہونا اور ان نمازوں میں مردوں کے ساتھ شریک ہونا پسندیدہ عمل نہیں ہے امام بخاری کے نزدیک اگر عورتیں مسجد میں جایا بھی کریں تو ایسے اوقات میں جب اندھیرا ہوتا ہے کہ مردوں کی نگاہوں سے وہ محفوظ رہیں وجہ وہی ہے کہ اندھیرے میں فتنہ کا اتنا اندیشہ نہیں ہے جتنا اندیشہ اجالے میں ہوسکتا ہے۔

اس باب کے تحت امام بخاری نے ایک حدیث یہ ذکر کی ہے،

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا استاذنکم باللیل الی المساجد فا

ذنوا لھن .

یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم سے تمہاری بیویاں رات میں مسجد جانے کی اجازت چاہیں تو ان کو اجازت دیدو۔

صحیح بخاری کی اس حدیث میں آپ غور فرمائیں گے تو درج ذیل باتیں آپ کو معلوم ہوں گی۔

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مسجد میں جانے کا کبھی تاکیدی حکم نہیں فرمایا۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کے شوہر سے رضا لے کر مسجد میں جانے کی رخصت عنایت فرمائی ہے۔

(۳) جو عورتیں شوہر کی رضا حاصل کئے بغیر مسجد میں جائیں گی وہ شریعت کے حکم کی مخالف کریں گی۔

(۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف رات میں (اس میں وہ وقت بھی شامل ہے جو رات کے حکم میں ہو مثلاً فجر کا اول وقت جو اندھیرے کا ہو) عورتوں کو مسجد میں حاضر ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔

(۵) جو عورتیں دن کی نمازوں میں مساجد میں جائیں گی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف کام کریں گی۔

(۶) جو عورتیں دن میں مساجد میں جانے کے لیے اپنے شوہروں سے اجازت طلب کریں تو شوہر ان کو اگر اجازت نہ دیں تو ان پر کوئی الزام نہیں۔

(۷) شوہروں کو پورا حق ہے کہ وہ دن میں عورتوں کو مسجد میں جانے سے حکماً منع کر دیں۔

صحیح بخاری کی مذکورہ بالا حدیث میں غور کرنے سے یہ امور دو اور دو چار کی طرح واضح ہیں، اور انہیں امور سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی نماز گھر میں مسجد کی نماز سے زیادہ بہتر ہے، ورنہ ان کے مسجد میں حاضر ہونے کو مردوں کی اجازت اور رات اور اندھیرے کی قید پر موقوف نہ کیا جاتا۔

اس حدیث کی شرح میں جو حافظ ابن حجر فرما رہے ہیں اس کو بھی آپ سن لیں فرماتے ہیں۔

وکا ن اختصا ص اللیل بذالک لکو نہ استر

(ج ۲ ص ۳۴۷ فتح)

یعنی حدیث میں رات کی قید اسلیے لگائی گئی ہے کہ رات کا وقت عورتوں کے لیے زیادہ ساتر ہوتا ہے۔

اور اس کے بعد فرماتے ہیں۔

ولا یخفی ان محل ذالک اذا امنت المفسدة منھن وعلیھن .(ایضاً)

یعنی رات میں بھی اس وقت عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت ہے جب ان کی جانب سے یا ان پر دوسروں کی جانب سے کسی طرح کا مفسدہ اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو،

یعنی بات بالکل واضح ہے کہ رات میں بھی عورتوں کا مسجد میں جانا اسی وقت جائز ہوگا جن ان پر یا ان کی جانب سے کسی اور پر

مفسدہ کا اندیشہ نہ ہوا گر عورتوں اور مردوں میں سے کسی ایک کے بھی کسی فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہوا تو عورتوں کا مسجد میں رات میں بھی جانا قطعا ممنوع ہوگا۔

اور اسی سلسلہ کی حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ کی یہ حدیث بھی ذکر کی ہے۔

عن عائشہ رضی اللہ عنہا قالت لو ادرک رسول اللہ ما احدث الناس لمنعھن کما منعت نساء بنی اسرائیل

یعنی حضرت عائشہ فرماتی تھیں کہ اگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان احوال کو دیکھتے جو لوگوں کے آج ہو گئے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو مسجد میں آنے سے اس طرح منع کر دیتے جس طرح سے بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا۔

ناظرین بخاری رحمتہ اللہ کی اس حدیث میں غور فرمائیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جنہیں اس بات کی اطلاع تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ خیر و برکت میں عورتوں کو مسجد میں آنے کی رخصت عنایت فرما رکھی تھی، مگر جب انہوں نے اپنے زمانہ کے تغیر ات کو دیکھا تو صاف صاف فرما دیا کہ اگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آج کے حالات کو دیکھتے تو عورتوں کو مسجد میں آنے سے منع فرما دیتے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عورتوں کا مساجد میں آنا خود حضرت عائشہ کے زمانہ میں جب کہ وہ ابھی خیر القرون اور صحابہ کرام کے وجود ہی کا زمانہ تھا لوگوں کی نگاہوں میں کھٹک گیا تھا، اور حضرت عائشہ جو مزاج نبوت کو خوب پہچاننے والی تھیں اور خود عالمہ اور فقیہہ تھیں ان کو عورتوں کا مسجد میں آنا نا گوار تھا اب اس زمانہ میں جب کہ یہ زمانہ ہی شر و فساد کا ہے اور اخلاقی گراوٹ انتہا کو پہنچ گئی ہے مردوں اور عورتوں میں اصلاح و تقوی عنقاء ہیں قدم قدم پر فتنہ کا اندیشہ ہے بھلا اس بگڑے ہوئے زمانہ اور بگڑے ہوئے ماحول میں عورتوں کو مساجد میں ا ٓنے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے اور جو عورتوں کو مساجد میں لانے پر مصر ہیں وہ سوائے اس کے شر و فساد کی راہ کھولنے کی تگ و دو کر رہے ہیں ان کی ان کوششوں کا مقصود کیا ہے اگر حضرت عائشہ کے زمانہ ہی میں یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ اب عورتوں کا مسجدوں میں آنا منا سب نہیں ہے تو آج کس بل بوتے پر ان کو مسجد میں آنے پر زور دیا جا رہا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ حضرت عائشہ نے عورتوں کو مسجد میں آنے کو حرام نہیں قرار دیا ہے اور وہ ایک مباح امر کو حرام قرار بھی کیسے دے سکتی تھیں جب کہ ابھی ان فتنوں نے جو آج پیدا ہو چکے ہیں اپنا سر بھی نہیں نکالا تھا، اگر حضرت عائشہؓ یا آپ کے زمانہ کے دوسرے صحابہ کرام موجودہ دور کے احوال کو دیکھ لیتے تو یقیناً وہ بھی عورتوں کو ساتھ مسجد میں آنے سے روک دیتے۔

حضرت عائشہ کی بخاری کی وہی روایت ہے جس کے بارے میں غیر مقلدوں کے بڑے میاں فرماتے ہیں کہ یہ حضرت عائشہ اپنی فہم سے فرماتی ہیں اور صحابہ کی فہم حجت نہیں ہے یقیناً غیر مقلدین اور شیعوں کا صحابہ کرام کے بارے میں یہی عقیدہ ہے مگر ہم اہل سنت والجما عت کے نزدیک صحابہ کرام اگر شریعت اور فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی روشنی میں کوئی بات فرمائیں اور اگر چہ وہ اپنی فہم ہی سے فرمائیں تو ان کی بات لائق توجہ بنتی ہے اسلئے کہ صحابہ کرام اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے جن کی تعریف میں قرآن بھی رطب اللسان ہے ہمارے نزدیک اس گروہ مقدس کی بات بھی سننے کو ملے گی وہ یقیناً قابل توجہ ہوگی اور ان کی رائے بہر حال ہماری رائے

سے بہتر اور افضل ہوگی۔

خیر اب آیئے ذرا یہ بھی دیکھیے کہ آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو عورتیں مسجد میں جاتی تھیں ان کے مسجد میں جانے کی کیفیت کیا ہوتی تھی اور ان کا جانا اور آنا کس طرح ہوتا تھا بخاری کی روایت ہے۔

عن عائشہ قالت ان کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیصلی الصبح فینصرف النساء متلفعات بمر وطھن ما یعرفن من الغلس .

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھ کر جب فارغ ہوتے تو عورتیں چادر میں اپنے کو بالکل چھپا کر نماز سے واپس ہوتی تھیں، اندھیرے کی وجہ سے ان کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ عورتیں فجر کی نماز میں بھی حاضر ہوتی تھیں تو بالکل چادر سے لپیٹی ہوئی اور اندھیرا، اتنا ہوتا تھا کہ انہیں کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ (۱)

اور خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب اپنی اپنی جگہوں پر نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے رہتے تا آنکہ عورتیں چلی جاتیں، بخاری ہی کی حدیث ہے حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ:

ان النساء فی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کن اذ سلمن من المکتو بۃ قمن وثبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومن صلی من الرجا ل ما شاء اللہ فاذاقا م رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قام الرجا ل

عورتیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب فرض نماز سے سلام پھیر لیتیں تو اٹھ کر چلی جاتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے پھر جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جانے کے لیے کھڑے ہوتے تو مرد بھی

(۱) ناظرین یہیں سے اس حکمت کو بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز اندھیرے میں کیوں پڑھتے تھے، چونکہ آپ کے زمانے میں فجر کی نماز میں عورتیں بھی شریک ہوجایا کرتیں تھیں اس وجہ سے ان کی ستر پوشی اسی میں تھی کہ نماز فجر اندھیرے میں ادا کیجائے، ورنہ نماز فجر کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد موجود ہے کہ اجالے میں نماز پڑھو اس لیے کہ اس میں اجر زیادہ ہے اس وقت نمازی بڑی تعداد میں شریک ہوسکتے ہیں اور جماعت جتنی بڑی ہوگی اس کا اجر بھی اتنا زیادہ ہوگا

واپس ہوتے۔

ناظرین غور فرمائیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں حاضر ہونے والی عورتوں کی وجہ سے کتنی احتیاط فرماتے کیا آج کے

اس دور میں اس احتیاط کا کسی درجہ میں بھی تصور ہوسکتا ہے۔

اسی سے ملتی جلتی مگر اس سے اور واضح بخاری کی ایک دوسری روایت ہے وہ بھی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

حضرت ام سلمہ فرماتیں ہیں۔

كا ن رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا سلم قام النسا ء حين يقضى تسليمه ويمكث هو فى مقا مه يسيرا قبل ان يقوم قال نرى و الله اعلم ان ذلک كا ن لكى ينصرف النسا ء قبل ان يد ركهن احد من الر جا ل .

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے سلام پھیرتے تو آپ کے سلام پھیرتے ہی عورتیں اٹھ کر چلی جاتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ پر تھوڑی دیر ٹھہرے رہتے اس روایت کے روای امام زہری فرماتے ہیں (ا) کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا اس لیے کرتے تھے قبل اس کے حاضرین میں سے کوئی انکو پالے وہ مسجد سے نکل جائیں (اور اپنے اپنے گھروں کو پہنچ جائیں۔

(!) بخاری کی ان روایات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر چہ آنحضور صلی اللہ علیہ

فتح الباری میں اس حدیث کو جس باب کے تحت اس کو ذکر کی ہے اس باب کو مکرر ذکر کیا ہے اور اس کی جگہ پر قال نری ہے یہ بات خود ام سلمہ فرماتی ہیں فتح الباری ج ۲ ص ۲۵۳

وسلم کے زمانہ میں عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت بطور رخصت تھی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی حاضری کی وجہ سے ان کے حسب حال اس کا پورا اہتمام فرماتے تھے کہ ان کی عصمت وآبرو کی پوری حفاظت ہو، عورتوں کی صفوں کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پیچھے رکھتے تھے حتی کہ بچوں کے بھی پیچھے ان کی صفیں ہوا کرتی تھیں تا کہ نماز سے سلام پھیرنے کے فورا بعد وہ مسجد سے نکل جائیں اور اس میں کسی طرح کی کوئی تاخیر نہ ہو اور مردوں سے ملنے جلنے کا قطعا کوئی موقع نہ ملے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو اگر چہ مسجد میں آنے کی رخصت مرحمت فرمادی تھی مگر آپ کا یہ بھی حکم تھا کہ عورتیں خوشبو لگا کر اور زیب وزینت کے ساتھ مسجد میں نہ آئیں اسماعیل بن امیہ سے مروی ہے۔

سئل النبى صلى الله عليه وسلم عن خروج النسا ء فقال يخر جن تفلا ت مصنف عبدالزاق ج۳ص ۱۵۱)

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کو مسجد میں آنے کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ وہ مسجد میں آسکتی ہیں مگر پرانے کپڑے میں اور بغیر زیب وزینت کے

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا۔

ولا یخر جن الا وھن تفلات ایضا :

کہ وہ مسجد میں نہ آئیں مگر اس حال میں کہ وہ پرانے کپڑے میں ہوں اور زیب و زینت انہوں نے نہ اختیار کیا ہو۔

امام لیث لیخرجن تفلات کی تفسیر میں فرماتے ھیں کہ:علیھن خلقا ن شعثا ت بغیر دھن مصنف ج۳ص ۱۴۴)

ترجمہ: یعنی اس کے بدن پر پرانے کپڑے ہوں اور بلا تیل اور خوشبو لگائے مسجد میں جائیں(۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت عاتکہ مسجد میں نماز کے لیے جاتی تھیں تو ان سے حضرت عمرؓ فرماتے۔

واللہ انک لتعرفین ما احب ھذا مصنف ج۳ص ۱۴۸)

خدا کی قسم تم خوب جانتی ہو کہ مجھے تمہارا مسجد جانا پسند نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد تھا۔

صلوٰۃ المرأۃ فی بیتھا افضل من صلاتھا فیما سواھا ثم قال ان المر أۃ اذ اخرجت تشوف لھا الشیطا ن(مصنف ج ۳ ص ۱۵۰)

عورت کی نماز اس کوٹھڑی میں دوسری جگھوں کے نماز پڑھنے سے افضل ہے اسلئے کہ یہ جب نکلتی ہے تو شیطان اس کی تا نک جھا نک میں لگا رہتا ہے۔

(۱) مسلم کی ایک روایت ہے کہ اذا شھد ت احدکن المسجد تمسن طیبا (فتح الباری ج ۲ ص ۲۵۰)یعنی اگر کوئی عورت مسجد میں جائے تو خوشبو ہرگز نہ لگا کر جائے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں

ویلحق با الطیب ما فی معناہ لا ن سبب المنع منہ ما فیہ من تحریک داعیۃ الشھوۃ کحسن الملبس والحلی الذی یظھر والزینۃ الفاخرۃ وکذا لک الا ختلاط باالرجال (ایضا)

یعنی خوشبو ہی کے حکم میں وہ تمام چیزیں ہیں جن سے شہوت بھڑکتی ہو جیسے اچھے کپڑے پہن کر مسجد میں جانا زیور کو ظاہر کر کے پہننا خوب زیب و زینت کے ساتھ جانا مردوں سے اختلاط کرنا بسا اوقات تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بڑی سخت قسم کی قسم کھا کر فرماتے۔

ما من مصلی لا مرأۃ خیر من بیتھا الا فی حج اوعمرۃ الا امر أۃ قد یئست من البعولۃ فھی فی منقلھا

(مصنف ج ۳ ص ۱۵۰) .

یعنی عورتوں کے نماز پڑھنے کی جگہ اس کی کوٹھڑی سے بہتر کوئی نہیں الا یہ کہ وہ حج اور عمرہ کو جائے البتہ وہ عورت (مسجد میں حاضر ہو

سکتی ہے) جواتنی بوڑی ہوچکی ہے کہ اب اسے شادی نہیں کرنی ہے اور بڑھاپے سے اس کے قدم بھی مشکل سے اٹھتے ہیں۔

ناظرین کے سامنے عورتوں کے مسجد میں جانے کی رخصت کے سلسلہ میں جو تفصیل اب تک آچکی ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ عورتوں کا مسجد میں جانا شریعت کی نگاہ میں بہت مستحسن فعل اور محمود امر نہیں تھا اور اگر ان کو اجازت بھی دی گئی تھی تو بہت سی قیدوں کے ساتھ ان کو جکڑ بھی دیا گیا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ کبار صحابہ حضرت عمر فاروقؓ اور، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جیسے لوگ اپنے زمانہ ہی میں عورتوں کو مسجد جانے کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے، جب کہ ان کا زمانہ ابھی زمانہ نبوت سے بہت قریب تر تھا ،اور عورتوں میں بیحیائی و بے شرمی کے ان مظاہروں کا دور دور تک تصور نہیں تھا جن کے نمونے آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

اب اس شر و فساد کے زمانہ میں اگر غیر مقلدین حضرات اپنی عورتوں کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس صریح ارشاد کے باوجود بیوتھن خیر لھن مسجد میں لیجانے ہی پر مصر ہیں تو وہ ضرور لے جائیں مگر ان قیود شرائط کا بھی اپنی عورتوں سے پاس و لحاظ کرائیں جن کا ذکر احادیث میں مذکور ہے یعنی عورتیں صرف رات میں اور اندھیرے کے وقت جائیں چادر میں بالکل لپٹ کر جائیں، بوسیدہ کپڑوں میں جائیں، زیب و زینت سے بالکل عاری ہوں، بدن پر خوشبو نہ ہو، اور امام کے سلام پھیرتے ہی وہ مسجد سے باہر آجائیں مردوں سے قطعا خلا ملا نہ ہو، کم از کم ان شرائط کا تو وہ اپنی عورتوں کو پابند بنالیں اور یہ شرائط وہ ہیں جو خود آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد مبارک میں جو سب سے زیادہ خیر و صلاح کا زمانہ تھا عورتوں کو مسجد میں جانے کے لیے تھیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر آج کا زمانہ پایا ہوتا تو نہ معلوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو مسجد میں جانے کے لیے اور کتنی قیود و شرائط لگاتے یا پھر جیسا کہ حضرت عائشہ کا خیال تھا بالکل ان کو مسجد میں آنے سے منع ہی فرما دیتے۔

اگر غیر مقلدین کا پندار اجتہاد اور اپنے حق پر ہونے کا زعم باطل اس حد کو نہ پہنچا ہو کہ وہ دوسروں کی باتیں بالکل نہ سنیں تو میں ان سے گزارش کروں گا کہ اگر آپ کو یہی شوق ہے کہ آپ اس زمانہ میں شر و فساد بھی اپنی عورتوں کو مسجد میں لے جائیں تو آپ ایسا ضرور کریں مگر خدارا اس امت کے اور لوگوں پر آپ حضرات رحم فرمائیں اور اس بات کی دعوت دوسروں کو نہ دیں، امت کی بھلائی اسی میں ہے۔

ان اردت الا اصلا ح وما تو فیقی الا با اللہ .

کیا رفع یدین کی چار سو حدیثیں ہیں؟

مکرمی حضرت مولانا غازی پوری صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

زمزم کا مطالعہ جاری ہے، الحمد للہ اس سے کافی فائدہ ہوا، خدشات کے بادل چھٹے، شبہات کافور ہوئے، اور غیر مقلدین کی کاروائیوں سے واقفیت ہوئی۔

رفع یدین کے سلسلہ میں اب اطمینان حاصل ہے کہ حضرت امام اعظمؒ کا جو مذہب ہے وہی فی الاصل مرجح اور اقرب الی الصواب ہے۔

اس کی کیا حقیقت ہے کہ رفع یدین کی چار سو حدیثیں ہیں، براہ کرم اس پر روشنی ڈالیں۔ والسلام

محمود قاسمی دربھنگوی بمبئی

زمزم!

برادرم آپ کا خط جب ملا تو میں سفر پر تھا فوری طور پر جو جواب ذہن میں تھا اسے کارڈ پر لکھ کر بھیج دیا گیا تھا، مگر آپ کا تقاضا تفصیلی جواب کا ہے اس کے لئے فرصت کا متلاشی تھا آج کچھ موقع ملا ہے تو یہ تحریر حاضر خدمت ہے۔ غیر مقلدین حضرات کے نزدیک کسی ایک حدیث کا دس بیس بلکہ سو پچاس بلکہ ہزار دو ہزار اور اس سے بھی زیادہ بتا دینا بچوں کا کھیل ہے، ان کو اس میں خصوصی مہارت حاصل ہے۔ غیر مقلدین کے یہاں مثلاً ایک حدیث سو کیسے بنتی ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

مولانا رئیس احمد ندوی حفظہ اللہ جامعہ سلفیہ بنارس کے محقق استاذ ہیں، بس یہ پی ایچ ڈی نہیں ہیں، بقیہ سب کچھ ہیں، جامعہ سلفیہ کے قابل فخر استاذ حدیث ہیں ان کا ایک رسالہ ہے "قصہ امام قربانی کا" کے نام کا جس میں ایک جگہ وہ ایک حدیث ذکر کر کے فرماتے ہیں

-

اس متواتر المعنی حدیث نبوی کی اگر ایک سو معتبر سندیں مانی جائیں تو اصول محدثین سے لازم آتا ہے کہ ایک سو احادیث نبویہ قربانی کے چار ایام ہونے کی دلیل ہیں بلفظ دیگر ایک سو نصوص شرعیہ اس موقف پر دلالت کرتے ہیں کہ ایام قربانی چار ہیں (ص ۳۲)

آپ نے دیکھا کہ کیسے محققانہ ومحدثانہ انداز پر اور اصول محدثین کی روشنی میں غیر مقلدین کے یہاں ایک حدیث ایک سو بنتی ہے، بس آپ کا کام اتنا ہے کہ کسی حدیث کی متعدد معتبر سندیں فرض کرتے چلے جائیں وہ حدیث ایک سے کئی سو خود بخود ہوتی چلی جائے گی۔

جن کے یہاں اس انداز سے احادیث ڈھلتی ہوں اور ایک حدیث ایک سو ہوتی ہو ان بیچاروں کا کرم ہی ہے کہ رفع یدین کے سلسلہ میں صرف چار سو احادیث بتلانے پر انہوں نے اکتفا کیا، ورنہ ان کا کوئی محقق فرصت کے وقت اطمینان سے بیٹھتا اور ہر حدیث کی سند سو فرض کرتا جاتا تو یہی چار سو احادیث چار ہزار ہو جاتیں۔

امام بخاریؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں امام بخاری کا رفع یدین کے سلسلہ میں ایک رسالہ ہے، مگر ان چھ لاکھ والے امام المحدثین امام بخاریؒ نے اس رسالہ میں صرف سترہ صحابہؓ کے بارے میں فرمایا

یروی عن سبعة عشر نفسا من اصحاب النبی ﷺ انهم کانوا یرفعون ایدیهم عندالرکوع وعند الرفع منه

یعنی صحابہ کرامؓ میں سے سترہ حضرات رفع یدین کرتے تھے اسی سے چار سو والی حدیث کے افسانہ کا آپ اندازہ لگالیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرامؓ میں سے (جیسا کہ عوام میں عام طور پر مشہور ہے کہ آنحضور ﷺ کے انتقال کے وقت صحابہ کرامؓ کی یہ تعداد تھی) ۲۵ صحابہ کرامؓ سے بھی صحیح سند سے کوئی غیر مقلد رفع یدین کی روایت نہیں پیش کرسکتا لیکن اگر نسخہ جامعہ سلفیہ کے انہیں محقق صاحب کا استعمال کیا جائے تو چار سو نہیں چار ہزار احادیث کا بھی دعویٰ کیا جاسکتا ہے

امام بیہقی جیسا ماہر فن جو خود بھی رفع یدین کا قائل ہے ان کو بھی آخر کار یہی کہنا پڑا کہ رفع یدین کے سلسلہ میں لائق احتجاج صرف پندرہ حدیثیں ہیں لیکن علامہ یوسف بنوریؒ فرماتے ہیں کہ مزید چھان بین کروگے تو تم کو صرف چھ حدیث ہی قابل احتجاج نظر آئیں گی۔ (معارف السنن ج۲ص ۴۶۷)

اور لطف یہ ہے کہ ان چھ حدیثوں میں سے بھی غیر مقلدین کے مطلب کی صرف تین حدیثیں رہیں گی اس لئے کہ ان چھ حدیثوں میں سے بعض احادیث میں سجدوں میں بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔ جو غیر مقلدین کے مذہب کے خلاف ہے اور بعض میں تیسری رکعت کے شروع میں رفع یدین کا ذکر نہیں۔ جب کہ غیر مقلدین کا مذہب یہ ہے کہ اس موقع پر بھی رفع یدین ہے۔ غرض ہزارہا ہزار احادیث میں سے رفع یدین کے بارے میں جو احادیث منقول ہیں غیر مقلدین کے کام کی اس میں سے صرف تین احادیث ہوسکتی ہیں لیکن جب اس کی بھی تحقیق ہوگی تو وہ بھی کالعدم ہوجائیں گی اور غیر مقلدین کے پاس صرف شور شرابا باقی رہ جائے گا۔

غیر مقلدین کا مرض یہ ہے کہ وہ ہمیشہ عوام کو دھوکہ اور فریب میں رکھتے ہیں۔ صحیح بات سے آگاہ کرنا اور ان کی فطرت نہیں ہے۔ وہ لوگوں کو دینی معاملات میں اسی طرح بے وقوف بناتے ہیں جیسا کہ جامعہ سلفیہ کا محقق غیر پی، ایچ، ڈی استاذ حدیث لوگوں کو بے وقوف بناتا ہے اور ایک حدیث کو سو بنادینے کا گر سکھلاتا ہے۔

بلاشبہ امام بخاری نے رفع یدین کی حدیث ذکر کی ہے، مگر کسی چیز کا بطور حدیث منقول ہونا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ عمل مشروع اور سنت بھی ہے۔ اور اگر کبھی وہ عمل مشروع رہا ہے تو یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اس کی مشروعیت بعد میں بھی باقی رہی ہے، رفع یدین کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ اگر رفع یدین کسی موقع پر مشروع رہا بھی ہے تو اس کی مشروعیت بعد میں ختم ہوگئی تھی، یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت رفع یدین کے سلسلہ کی امام بخاریؒ نے ذکر کی ہے خود امام بخاریؒ جزء رفع یدین میں ان کا عمل ان کے شاگرد مجاہد سے نقل کرتے ہیں۔

عن مجاهد قال ما رأیت ابن عمرؓ لا یرفع یدیه فی شئ من الصلوٰة الافی التکبیرة اولٰی .

یعنی حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو تکبیر اولیٰ کے سوا نماز میں کہیں اور رفع یدین کرتے نہیں دیکھا یہ حضرت مجاہد وہ ہیں جن کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ دس سال تک رہنے کا موقع ملا تھا۔

نیز حضرت امام بخاریؒ اپنے رسالہ جزء رفع یدین ہی میں امام اوزاعی کا فتویٰ نقل کرتے ہیں کہ رفع یدین کا مسئلہ شروع زمانہ اسلام کا تھا۔ ہذیل بن سلیمان فرماتے ہیں کہ میں نے امام اوزاعی سے پوچھا کہ نماز میں کھڑے ہونے کی حالت میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ یہ شروع زمانہ کی بات تھی۔

بہر حال عرض یہ کرنا کہ چار سو صحابہؓ سے رفع یدین کا ثبوت تو محض افسانہ ہے جن صحابہ کرامؓ سے رفع یدین والی حدیث منقول بھی ہے اس کا تعلق شروع زمانہ اسلام سے ہے، اور یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جہاں کے ذرہ ذرہ پر اسلام کا آفتاب طلوع تھا وہاں حضرت امام مالکؒ کے زمانہ تک اس رفع یدین کا مساجد میں اور خصوصاً مسجد نبوی میں چلن نہیں تھا ورنہ امام مالک کا مذہب رفع یدین کا ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ان سے تو رفع یدین کا مکروہ ہونا منقول ہے اگر اب کسی غیر مقلد سے اس قسم کی بات ہو تو اس سے پوچھیں کہ بھائی رفع یدین کے بارے میں تمہارا مذہب کیا ہے وہ چار جگہ رفع یدین کرنے کو بتلائے گا۔ آپ اس سے کہیں کہ تم بخاری شریف میں چار سو نہیں صرف چار حدیث چار جگہ رفع یدین والی دکھلا دو، آپ دیکھیں گے کہ اس کے چہرہ پر ہوائی اڑنے لگے گی۔

اس صحبت میں اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں، میری یہ مختصر تحریر بھی غیر مقلدین کو حالت سکر میں پہنچا دے گی، پھر وہ اول فول بکیں گے، اگر ان کے اس اول فول میں کچھ کام کی بات نظر آئی تو ان شاء اللہ دوبارہ اذرا اور تفصیل سے اس مسئلہ کو واضح کروں گا۔

میں آپ کی محبت اور کرم فرمائیوں کا شکر گزار ہوں۔ زمزم کی اعانت آپ نے جس انداز سے فرمائی ہے اس سے مجھے بڑی تقویت ملی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بہترین بدلہ دے۔ حاجی صاحب سے میرا سلام ضرور کہہ دیں، بمبئی آنے کا سر دست کوئی پروگرام نہیں ہے۔

والسلام محمد ابوبکر غازی پوری

ترک رفع یدین کی ایک حدیث کے بارے میں
ایک سوال کا جواب

محترم مولانا صاحب.........السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ سے فون پر سوال کیا تھا اس کی تفصیل حسب ذیل ہے برائے مہربانی اس کو زمزم میں شائع کریں تا کہ اور لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔

حضرت جابر بن سمرہؓ کی روایت جس میں رفع یدین کو شریر گھوڑے کی طرح کہہ کر رفع یدین سے منع کیا گیا ہے، اور سکون سے نماز پڑھنے کا حکم ہے، اس کو امام مسلم نے اور سارے محدثین نے سلام کے باب میں رکھا ہے، کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ حدیث عندالرکوع رفع یدین کی نہیں ہے، غیر مقلدین کا یہ کہنا ہے کہ اگر عندالرکوع رفع یدین کی حدیث ہے تو پھر عیدین اور وتر کی نماز میں بھی رفع یدین نہ کرنا چاہئے۔

اردو میں لکھنے کی عادت نہیں ہے اسلئے غلطی ہو تو نظر انداز کردیں۔

والسلام غفران احمد اندور

زمزم!

مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ ایک بات آپ کو کھٹکی اور آپ نے اس کے بارے میں تحقیق ضروری سمجھی، باشعور اور دین کی فکر رکھنے والوں کا یہی انداز ہونا چاہئے آج کل یہ وبا عام ہوگئی ہے کہ غیر مقلدین کی باتوں میں پڑکر اور بلا تحقیق کئے ہوئے ان کی باتوں کو درست جان کر بہت سے لوگ راہ حق سے بھٹک رہے ہیں نوجوانوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کو غیر مقلدین ترجمہ والی بخاری ومسلم دکھا دکھا کر گمراہ کررہے ہیں، اللہ اس فتنہ سے امت مسلمہ کی حفاظت فرمائیں۔

آپ کے اصل سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ عرض کردوں کہ اگر کسی نے آپ سے یہ کہا کہ جو حدیث آپ نے ذکر کی ہے اس کو امام مسلم نے اور سارے محدثین نے سلام کے باب میں رکھا ہے، تو اس نے جھوٹ کہا ہے، غلط بکا ہے، دھوکا دیا ہے، غیر مقلدین اس معاملہ میں بڑے پرانے کھلاڑی ہیں جھوٹ بولنا، دھوکا دینا، کم پڑھے لکھے لوگوں کو وسوسوں میں ڈالنا ان کا بہت پرانا طریقہ ہے، غیر مقلدیت اسی راہ سے پھیلی ہے اور اب بھی پھیل رہی ہے۔

نسائی شریف میں امام نسائیؒ نے باب فی السلام قائم کیا ہے اور اس میں اسکنوا فی الصلوٰۃ والی حدیث ذکر نہیں کی ہے بلکہ یہ حیث ذکر کی ہے۔

عن عبداللہ وھوابن القبطیہ عن جابربن سمرۃ قال صلیت مع رسول اللہ ﷺ فکنا اذا سلمنا قلنا بایدینا السلام علیکم، السلام علیکم قال! فنظر الینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فقال مابالکم تشیرون بایدیکم کانها اذا ناب خیل شمس اذا سلم احد کم فلیلتفت الی صا حبه ولا یو مئی بیده (نسا ئی باب السلا م با لیدین)

حضرت عبیداللہ بن قبطیہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی تو ہم جب سلام پھیرتے تو اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر السلام علیکم السلام علیکم کہتے، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا کیا ہو گیا ہے تم کو کہ تم اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کرتے ہو گویا یہ ہاتھ سرکش گھوڑے کی دم ہیں جب تم میں سے کوئی سلام کرے تو اپنے بغل والے کی طرف متوجہ ہو اور ہاتھ سے اشارہ نہ کرے۔

اس حدیث میں غور فرمایئے، آپ کو کہیں اسکنو فی الصلوٰۃ نماز میں سکون اختیار کرو کا جملہ نظر نہیں آئے گا، اور نہ اس میں رفع یدین کا ذکر نظر آئے گا، معلوم ہوا کہ اسکنو فی الصلوۃ یعنی ترک رفع یدین والی حدیث الگ ہے اور یہ حدیث الگ اسکنوا فی الصلوۃ والی حدیث میں صحابہ کرام کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین کرتے دیکھا تھا اس سے منع فرمایا اور اس حدیث میں ہے کہ صحابہ کرام سلام پھیرتے وقت ہاتھ ہلاتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں سلام پھیرتے وقت ہاتھ ہلانے سے منع فرمایا

اس باب میں نسائی نے اسکنوا فی الصلو ۃ والی حدیث ذکر ہی نہیں کی ہے، اس لیے غیر مقلدین کا یہ کہنا کہ تمام محدثین اس حدیث کو سلام کے بارے میں ذکر کرتے ہیں حقیقت کے بالکل خلاف ہے اور بالکل جھوٹ بات ہے۔

اب آیئے مسلم شریف کی طرف جسمیں اسکنو ا فی الصلو ۃ والی بھی حدیث ہے اور اصل صورت حال سے واقفیت حاصل کیجئے۔ مسلم شریف میں یہ باب قائم کیا گیا ہے۔

با ب الا مر با السکو ن فی الصلو ۃ والنھی عن الا شارۃ با لید ورفقھا عندا لسلا م واتمام الصفوف الا ول والترا ض فیھا والا مر با الا جما ع .

یعنی اس باب کے تحت جو حدیثیں ہوں گی ان سے مندرجہ ذیل مسائل کا اثبات کیا جائے گا۔

(۱) نماز میں سکون اختیار کرنا (۲) سلام کے وقت ہاتھ سے اشارہ کرنے اور ہاتھ اٹھانے سے منع کرنا۔ (۳) پہلی صفوں کو پورا کرنا اور ان کا ملا ہوا ہونا۔

(۴) اور مل جل کر کھڑا ہونا ادھر ادھر کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھنا۔

امام مسلم نے اس باب کے تحت جو حدیثیں ذکر کی ہیں ان سے انہیں مسائل کو ثابت کیا ہے اور یہ سارے مسائل کسی ایک حدیث سے ثابت نہیں ہو رہے ہیں بلکہ ان کے لیے الگ الگ حدیثیں ہیں، مثلاً ایک حدیث میں ایک تو یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ نماز میں فع یدین نہ کرو، سکوں اختیار کرو دوسرا مسئلہ اسی حدیث سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ پہلی صفوں کو پوری کرو، تیسرا مسئلہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ صفوں کو خوب جما کر کے قائم کرو، چوتھا مسئلہ یہ بیان کیا ہے کہ بکھر کر کے نہیں اجتماعی شکل میں نماز پڑھنا چاہیے۔

ان تمام مسائل کو امام مسلم نے اس حدیث سے ثابت کیا ہے جو اس باب کی پہلی حدیث ہے۔

عن تمیم بن طرفة عن جا بر بن سمر ة قال :خر ج علینا رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال مالی اراکم رافعی ایـد یکم کا نها اذنا ب خیل شمس ؟اسکنوافی الصلوٰة قال ثم خر ج علینافرآنا حلقاً فـقال مالی اراکم عزین؟قال ثم خرج علینا فقال الا تصفون کما تصف الملا ئکة عند ربها فقلنا : یا رسول الله صلی الله علیه وسلم کیف تصف الملا ئکة عند ربها ، قال یتمون الصفوف الا ول ویترا صون فی الصف .

حضرت تمیم بن طرفہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہمارے اوپر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور ہم ہاتھ اٹھا کر نماز پڑھ رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (نا گواری کے طور پر) فرمایا، مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں تم کو رفع یدین کرنے والا دیکھ رہا ہوں گویا یہ ہاتھ سرکش گھوڑے کی دم ہیں، نماز میں سکون اختیار کرو۔اتنے حصہ کے ترجمہ میں غور کریں، اس حصہ میں رفع یدین کرنے پر نا گواری کا اظہار کرنا ہے، اور نماز میں سکون اختیار کرنے اور ہاتھ نہ اٹھانے والے مسئلہ کو بتلانا ہے، اب حدیث کے دوسرے حصہ کا ترجمہ دیکھئے، حضرت جابر فرماتے ہیں،

پھر ایک دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اوپر نکلے تو آپ نے ہم کو دیکھا کہ ہم مختلف حلقوں میں بٹ کر نماز پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے کیا ہو گیا ہے میں تم کو بکھرا ہوا الگ الگ حلقوں میں دیکھ رہا ہوں۔

حدیث پاک کے اس حصہ میں آپ ﷺ نے الگ الگ حلقوں میں بٹ کر نماز پڑھنے پر نا گواری کا اظہار فرمایا ہے یعنی اجتماعی شکل میں نماز پڑھنے کا مسئلہ بیان ہوا۔

حدیث پاک کا تیسرا حصہ ملاحظہ ہو، جس کا ترجمہ یہ ہے

پھر ایک دفعہ اور آپ ﷺ ہمارے اوپر نکلے تو آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اس طرح صف کیوں نہیں بناتے ہو جس طرح ملائکہ کی صفیں ان کے رب کے پاس ہوتی ہیں ہم نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ملائکہ اپنے رب کے پاس کس طرح صف بناتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔وہ پہلی صفوں کو پوری کرتے ہیں اور صف میں جم کر کھڑے ہوتے ہیں۔

حدیث پاک کے اس تیسرے حصہ میں پہلی صفوں کو پورا کرنے اور صفوں میں جم کر کھڑے ہونے کا مسئلہ بیان ہوا۔

یعنی باب میں جن چار مسئلوں کا ذکر تھا کہ ان کو حدیث سے ثابت کیا جائے گا اس پہلی حدیث میں ان میں سے تین کا ذکر ہے ،سلام کے وقت اشارہ کرنے سے منع کرنے والا مسئلہ اس حدیث میں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔اس کے لئے امام مسلم نے دوسری حدیث ذکر کی ہے، اس دوسری حدیث کے راوی بھی حضرت جابر بن سمرہ ہیں، مگر چونکہ وہ حدیث دوسری ہے اس لئے اس کی سند اور اس کے الفاظ بھی الگ ہیں، یہ دوسری حدیث اصل الفاظ کے ساتھ ملاحظہ ہو

عبیدابـن الـقبـطیه عن جابر بن سمرة قال :کنا اذاصلینا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم : قلنا السـلام عـلیـکـم ورحـمة الـله واشاربیده الی الجانبین فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم .علام

تــومــون بــايــديكم كانها اذناب خيل شمس ؟ انما يكفيكم احدكم ان يضع يده على فخذه ثم يسلم على اخيه من على يمينه وشماله.

عبید اللہ بن قبطیہ حضرت جابر بن سمرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے تو ہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ اسلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے دونوں جانب دائیں اور بائیں اشارہ کرتے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا تم لوگ اپنے ہاتھوں سے کس وجہ سے اشارہ کرتے ہو گویا وہ سرکش گھوڑے کی دم ہیں، بس تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ تم میں کا ہر شخص اپنی ران پر ہاتھ رکھے پھر دائیں بائیں اپنے بھائی کی طرف رخ کر کے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے۔

دیکھئے اس حدیث پاک میں صرف ایک مسئلہ کا ذکر ہے یعنی سلام کے وقت اشارہ کرنے سے منع کیا گیا ہے اور سلام کس طرح سے پھیرا جائے اس کا طریقہ بتایا گیا ہے کہ سلام پھیرتے وقت ہاتھ سے اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ ران پر ہو اور دائیں بائیں رخ کر کے سلام پھیرا جائے۔

اس حدیث کو امام مسلم نے ایک دوسری سند سے ان الفاظ کے ساتھ بھی ذکر کیا ہے جس سے مسئلہ اور صاف ہو جاتا ہے، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں۔

صليت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فكنا اذاسلمنا قلنا بايدينا السلام عليكم ، السلام عليكم فـنـظـر الـيـنـا رسـول الـلـه صلى الله عليه وسلم فقال :ماشانكم ؟تشيرون بايديكم كانها اذناب خيل شمس؟ اذاسلم احدكم فليلتفت الى صاحبه ولايومى بيده

یعنی میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو ہم جب سلام پھیرتے تھے تو اپنا ہاتھ ہلا کر السلام علیکم، السلام علیکم کہتے تھے، تو آپ ﷺ نے ہم سے کہا کیا بات ہے؟ تم اپنے ہاتھوں سے کیوں اشارہ کر رہے ہو گویا وہ سرکش گھوڑے کی دم ہیں، جب تم میں کا کوئی سلام پھیرے تو اپنے بغل والے کی طرف متوجہ ہو اور اپنے ہاتھ سے اشارہ نہ کرے۔

یہ حدیث بھی سلام کے وقت صرف اشارہ ہی کو منع کرنے کے لئے امام مسلم نے ذکر کی ہے اس میں کسی دوسرے مسئلہ کا ذکر نہیں ہے۔

آپ دونوں مسئلوں والی حدیثوں کو غور سے پڑھیں یعنی جس میں نماز میں رفع یدین سے منع کرنے اور سکون اختیار کرنے کا حکم مذکور ہے اس کو غور سے پڑھیں اور بعد والی ان دونوں حدیثوں کو غور سے پڑھیں جن میں صرف سلام کے وقت اشارہ سے منع کیا گیا ہے آپ کو ان دونوں حدیثوں میں واضح فرق نظر آئے گا پہلی حدیث میں کئی مسئلوں کا بیان ہے جب کہ دوسری حدیث میں صرف نماز میں اشارہ کرنے کا ذکر اور اس سے منع کرنے کا بیان ہے تو پھر دونوں حدیثیں ایک کیسے ہو گئیں؟ رفع یدین والی پوری حدیث میں سلام کرنے کے وقت اشارہ کرنے کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے تو اس کو سلام کے وقت اشارہ سے منع کرنے والی حدیث قرار دینا آنکھ میں دھول جھونکنا ہے ، اور حدیث رسول کو اپنی خواہش کی بھینٹ چڑھانا ہے، میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس نے دونوں حدیثوں کو ایک قرار دے کر

دونوں کا تعلق سلام کے وقت اشارہ کرنے کے مسئلہ سے جوڑا ہے، وہ سخت غلط فہمی کا شکار ہوا ہے۔اس نے دونوں حدیثوں کے مضمونوں میں غور ہی نہیں کیا ہے یا غور کیا ہے تو اس نے ان دونوں حدیثوں کو سمجھا ہی نہیں ہے اور اگر سمجھا ہے تو تجاہل برتا ہے

یعنی جان بوجھ کر جاہل بنا ہے، اور سخت قسم کی عصبیت کا شکار ہوا ہے اور حق پر پردہ ڈالنے کی ناروا کوشش کی ہے۔

یوں تو غیر مقلدین عدم تقلید کا راگ الاپتے ہیں ہم کسی کی تقلید نہیں کرتے ہم مجتہد لوگ ہیں، یہی ان کا نعرہ ہوتا ہے، مگر جب حقیقت کی نگاہ سے ان کو دیکھو تو ان سے بڑا کوئی مقلد نظر بھی نہیں آتا، چونکہ امام بخاریؒ نے اور بعض دوسرے محدثین نے ان دونوں حدیثوں کو سلام کے وقت اشارہ کرنے ہی سے جوڑا ہے اس وجہ سے غیر مقلدین نے بھی انہیں کی اتباع وتقلید میں یہی کہنا شروع کر دیا کہ ان دونوں حدیثوں کا تعلق سلام کے وقت اشارہ ہی سے ہے اس لئے کہ دونوں حدیثوں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی لفظ ''کانھا اذناب خیل شمس'' (گویا وہ سرکش گھوڑے کی دم ہیں) سے منع کیا ہے۔

تحفۃ الاحوذی میں مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے دونوں حدیثوں کو ایک بتلانے میں امام بخاری ہی کا اصل سہارا لیا ہے اور اپنی عقل کو دعوت غور وفکر دینے کی زحمت نہیں دی۔

امام بخاریؒ بہت بڑے محدث ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے مسائل میں ان کی تحقیق بہت کمزور ہوتی ہے اب یہیں دیکھئے کہ دونوں حدیثوں کو اشارہ عندالسلام سے متعلق قرار دینا امام بخاریؒ کی نری زبردستی ہے جبکہ دونوں حدیثوں میں واضح فرق ہے، اور ایک نہیں کئی فرق ہے آپ ان فرقوں کو ملاحظہ فرمائیں۔

پہلا فرق یہ ہے کہ حضرت جابر بن سمرہؓ کی وہ حدیث جس میں رفع یدین سے روکا گیا ہے وہ بہت مفصل اور اس میں ایک ساتھ کئے مسائل کا ذکر ہے، جب کہ اشارہ عندالسلام والی حدیث میں صرف اشارہ عندالسلام کا مسئلہ ہے کسی دوسرے مسئلہ کا ذکر نہیں ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ رکوع سے منع والی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ ایک دفعہ باہر تشریف لائے تو ایک چیز سے منع کیا اور دوسری مرتبہ باہر تشریف لائے تو دوسری چیز سے منع کیا تیسری مرتبہ تشریف لائے تو تیسری چیز کا حکم فرمایا گویا آنا جانا کم از کم تین بار ہوا جب کہ دوسری حدیث میں اس آنے جانے کا کہیں ذکر بھی نہیں ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ کا بار بار آنا ایک ہی دن اور ایک وقت میں ہوا ہو بلکہ غالباً گمان یہ ہے کہ آپ کا یہ آنا جانا اور منع فرمانا الگ الگ دنوں یا الگ وقتوں میں ہوا تھا جیسا کہ لفظ ''ثم'' کا تقاضا ہے اور یوں بھی عقل میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ آپ ﷺ ایک ہی دفعہ میں کئی ایسی چیزوں کو جن سے آپ کو منع فرمانا ہے دیکھیں اور اس کے لئے آپ بار بار گھر سے باہر نکلیں اگر آپ ﷺ ان ساری باتوں کو جن سے آپ نے منع فرمایا ہے پہلی ہی مرتبہ میں دیکھتے تو ضرور اسی وقت آپ سب سے منع فرما دیتے اس لئے بلاشبہ اس حدیث پاک میں الگ الگ وقتوں کا ذکر ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ رفع یدین سے منع کرنے والی حدیث میں ہے کہ صحابہ کرامؓ اپنی الگ الگ نماز حلقہ بنا کر کے پڑھ رہے تھے ....آنحضور ﷺ کے نماز پڑھانے اور صحابہ کرامؓ کا آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے جبکہ اشارہ عندالسلام والی حدیث میں آپ ﷺ کے نماز پڑھانے اور صحابہ کرامؓ کا آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔

چوتھا فرق یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پہلی حدیث میں ''مالی اراکم رافعی ایدکم'' فرمایا یعنی مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں تم کو نماز میں ہاتھ اٹھانے والا دیکھ رہا ہوں جب کہ دوسری حدیث میں رفع یدین کا اشارہ تک نہیں ہے۔

پانچواں فرق یہ ہے کہ رفع یدین کرنے سے آپ نے اسکنوافی الصلوٰۃ یعنی نماز میں سکون اختیار کرو، یہ کہہ کر روکا جب کہ دوسری حدیث میں آپ نے یہ فرمایا علام تومون بایدیکم کانھا اذناب خیل شمس یعنی تم لوگ ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیوں کر رہے ہو گویا وہ سرکش گھوڑے کی دم ہیں، کبھی آپ نے فرمایا ما شانکم تشیر ون بایدیکم تمہارا کیا حال ہے تم لوگ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہیں یعنی سکون اختیار کرنے کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔

چھٹا فرق یہ ہے کہ اشارہ عندالسلام والی حدیث اپ نے اشارہ کرنے سے منع فرما کر نماز میں سلام پھیرنے کا طریقہ بتلایا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے والا اپنا ہاتھ اپنی ران پر رکھے رہے اور دائیں بائیں بلا ہاتھ ہلائے سلام پھیر دے جب کہ رفع یدین والی حدیث میں اس کا دور دور ذکر تو کیا اشارہ تک نہیں ہے۔

ساتواں فرق یہ ہے کہ رفع یدین سے منع کرنے والی حدیث میں حضرت جابر سے روایت کرنے والے تمیم بن طرفہ ہیں اور ان سے روایت کرنے والے مسیّب بن رافع ہیں اور ان سے روایت کرنے والے اعمش ہیں ہیں اور اعمش سے روایت کرنے والے ابو معاویہ ہیں اور ابو معاویہ سے روایت کرنے والے دو ہیں ابو کریب اور ابو بکر بن ابی شیبہ اور ان دونوں سے اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور اشارہ والی حدیث جو امام مسلم نے ذکر کی ہے اس کو حضرت جابر سے روایت کرنے والے دوسرے صاحب عبید اللہ ابن قبطیہ ہیں اور ان سے روایت کرنے والے مسعر ہیں اور مسعر سے روایت کرنے والے ابن ابی زائدہ ہیں اور ان سے روایت کرنے والے ابو کریب ہیں اور ان سے روایت کرنے والے امام مسلم ہیں۔

آپ غور فرمائیں کہ ابو کریب کے بعد دونوں حدیثوں کی سند بالکل الگ الگ ہو جاتی ہیں جب دونوں حدیثوں کی سند الگ الگ ہے اور دونوں کا مضمون الگ الگ ہے تو دونوں حدیثوں کو ایک قرار دینا کس قدر زبر دستی کی بات ہے، دونوں حدیثوں میں ان واضح اختلافات اور فرق کے باوجود محض امام بخاری یا کسی اور محدث کی تقلید میں ایک قرار دینا کیا دیانت اور انصاف کی بات ہوگی۔ اور جس کے سامنے دونوں حدیثیں اپنے متن اور سند کے ساتھ ہونگی کیا وہ اس کو تسلیم کریگا؟

امام بخاریؒ تو ایک بہت ہی عجیب بات ان دونوں حدیثوں کے سلسلہ میں فرما گئے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ رفع یدین کا ذکر جس حدیث میں ہے اس کا تعلق تشہد کی حالت میں ایک دوسرے کو سلام کرنے سے ہے چنانچہ اسکنوافی الصلوٰۃ والی حدیث کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں۔

فانما کان ھذا فی التشھد لا فی القیام کان یسلم بعضھم علی بعض فنھی النبی ﷺ عن رفع الایدی فی التشھد .(جزء رفع یدین)

یعنی نماز میں سکون کا حکم جس حدیث میں ہے وہ تشہد کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے حالت قیام سے اس کا تعلق نہیں ہے، صحابہ کرامؓ

تشہد کی حالت میں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو نبی ﷺ نے تشہد میں ہاتھ اٹھانے سے منع فردیا۔

امام بخاریؒ کی اس بات میں کتنا وزن ہے اس کا فیصلہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس کے سامنے دونوں حدیثیں ہوں، رفع یدین سے منع کرنے والی بھی اور سلام پھیرتے وقت اشارہ کرنے والی بھی رفع یدین سے منع کرنے والی حدیث امام مسلم کی کتاب سے میں نے شروع مضمون میں پوری نقل کی ہے آپ اس میں غور فرمائیں امام بخاری نے جو یہ فرمایا ہے کہ اس کا تعلق تشہد میں ایک دوسرے سے سلام کرنے سے ہے اس کی کسی طرح بھی گنجائش اس حدیث سے نکلتی ہے؟

اگر امام بخاری کی یہ بات کسی درجہ میں مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے تشہد کی حالت میں ایک دوسرے کو سلام کرنے کی اجازت دی ہے سلام کرتے وقت صرف ہاتھ اٹھانے سے منع کیا ہے یعنی حالت تشہد جو نماز کی حالت ہے اس میں ایک دوسرے کو سلام کرنا جائز ہے، صرف ہاتھ اٹھانا منع ہے تو اب غیر مقلدین کو چاہئے کہ امام بخاری کے فتویٰ پر عمل کریں اور حالت تشہد میں ایک دوسرے کو سلام کیا کریں البتہ ہاتھ اٹھا کر سلام نہ کریں۔

امام بخاری نے اس حدیث کا یہ جو مطلب بیان کیا ہے یہ ان کے ذہن کی ایجاد ہے حدیث پاک کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے نہ کسی محدث نے یہ مطلب سمجھا ہے۔

اشارہ عند السلام والی حدیث کا بھی امام بخاری نے یہی مطلب سمجھا ہے کہ حالت تشہد میں سلام کے وقت ہاتھ اٹھانے سے روکا گیا ہے۔ یعنی صحابہ کرامؓ ایک دوسرے کو تشہد میں ہاتھ اٹھا کر سلام کیا کرتے تھے تو آنحضور ﷺ نے ایک دوسرے کو سلام کرنے سے تو منع نہیں کیا البتہ ہاتھ اٹھانے سے منع کر دیا۔ اس اور دوسری حدیث کو امام بخاری نے پہلی حدیث کی شرح قرار دیا ہے۔ امام بخاریؒ خود دونوں حدیثوں کے مفہوم سے نا آشنا ہیں پہلی حدیث کا تعلق نماز میں رفع یدین ہی سے روکنے سے ہے اور دوسری کا تعلق سلام پھیرتے وقت ہاتھ اٹھا کر السلام علیکم کہنے سے ہے تشہد کی حالت میں ایک دوسرے کو سلام کرنے کا اس حدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے یہ امام بخاری کا غلط اجتہاد ہے اور دونوں حدیثوں کے اصل مفہوم سے ناواقفیت کی بات ہے، اس وجہ سے امام بخاری سے پہلے جن لوگوں نے دونوں حدیثوں کو الگ الگ سمجھا ہے اور ہر ایک کا مفہوم دوسرے سے الگ سمجھا ہے انہیں کی بات درست ہے یہ وہ لوگ ہیں جو امام بخاری کے استاذوں کے استاذ ہوں گے ان کے مقابلہ میں امام بخاری کی بات نہیں سنی جائے گی۔ رہا یہ سوال کہ پھر وتر میں اور تکبیرات عیدین میں کیوں ہاتھ اٹھایا جاتا ہے، یہاں بھی اسکنوافی الصلوٰۃ پر عمل کرتے ہوئے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے یہ بات بھی امام بخاری ہی کی پیدا کردہ ہے اور انہیں سے غیر مقلدین اخذ کر کے یہ سوال کیا کرتے ہیں حالانکہ امام بخاریؒ کا یہ اعتراض بالکل بودا ہے۔ معلوم نہیں امام بخاری کے ذہن میں اعتراض کیسے پیدا ہوا اس لئے کہ وتر اور عیدین کی نماز اسی طرح سے آنحضور ﷺ نے تازندگی پڑھی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے موافق و مخالف سب ہاتھ اٹھا کر ہی وتر بھی پڑھتے ہیں اور عیدین کی نماز بھی ادا کرتے ہیں جب کہ نماز میں رفع یدین کا مسئلہ اختلافی ہے کسی کے یہاں ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرنا ہے خواہ قیام کی حالت ہو خواہ رکوع کی یا رکوع سے اٹھنے کی یا سجدہ سے اٹھنے کی یا دو رکعت پر، اٹھنے کی ان تمام جگہوں پر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرنا ہے کسی کے ہاں صرف چار جگہ رفع یدین

کرنا ہے جیسا کہ آج کل عام غیر مقلدین کا اسی پر عمل ہے کسی کے یہاں صرف نماز کے شروع ہی میں رفع یدین کرنا ہے جیسا کہ امام مالک اور احناف کا مذہب ہے تو پنج وقتہ نماز میں رفع یدین کا مسئلہ تو اختلافی ہے اس لئے اس مسئلہ میں ہر ایک اپنے اپنے دلائل پیش کریگا اور دیکھا جائے گا کہ کس کے دلائل قوی ہیں اور کس کے کون کون سے دلائل ہیں چنانچہ احناف نے پنج وقتہ نماز میں رفع یدین نہ کرنے کی ایک دلیل حضرت جابر بن سمرہؓ والی حدیث کو بھی بنایا جائے اور یہ اتنی قوی اور صحیح دلیل ہے کہ امام بخاری جیسا محدث بھی اس دلیل کے سامنے بے بس اور عاجز ہے اور بے جان اعتراض کر کے اس دلیل کو مشکوک بنانا چاہتا ہے۔ امام بخاری کا یہ اعتراض ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ جب نماز میں سکون کا حکم ہے تو رکوع اور سجدہ کیوں کیا جائے نماز میں اٹھنا بیٹھنا کیوں ہو ظاہر ہے یہ اعتراض غلط ہے ہمیں نماز اسی طرح پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور سب اسی طرح رکوع اور سجدہ کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اس وجہ سے یہ رکوع اور سجدہ اسکنوافی الصلوۃ کے خلاف نہ ہوگا، اسی طرح وتر اور عیدین کی نماز جس طرح شریعت میں مشروع ہے اسی طرح پڑھی جائے گی وہ اسکنوافی الصلوۃ کے خلاف نہ گی نہ اس سے آنحضورﷺ نے منع فرمایا ہے نہ اس پر ناگواری کا اظہار کیا ہے جب کہ نماز میں رفع یدین کا مسئلہ کافی اختلافی ہے حتی کہ مالکیہ کی بعض کتابوں میں رفع یدین کرنے کو مکروہ کہا گیا ہے اور امام مالک کا مشہور مذہب یہی ہے کہ ابتداء صلوٰۃ کے علاوہ دوسری جگہوں پر رفع یدین کرنا مستحب نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں امام مالک کے زمانہ میں جو نماز پڑھی جاتی تھی وہ بلا رفع یدین کے تھی۔ اور ظاہر ہے کہ امام مالک کے زمانہ میں تابعین تھے جنھوں نے صحابہ کرامؓ سے نماز سیکھی تھی معلوم ہوا کہ عام صحابہ کرامؓ کا مذہب رفع یدین کرنا نہیں تھا اور اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ امام بخاری کے شاگرد امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ رفع یدین والی حدیث ذکر کر کے فرماتے ہیں، وبھذا یقول بعض اہل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی رفع یدین پر عمل کرنے والے اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بعض ہی لوگ تھے، لفظ بعض لا کر امام ترمذی نے مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا کہ رفع یدین کرنا صحابہؓ میں سے کچھ ہی لوگوں کا مذہب تھا، عام طور پر صحابہ کرامؓ رفع یدین نہیں کرتے تھے (ا)

(!) اور جب عام طور پر صحابہ کرام رفع یدین نہیں کرتے تھے تو کیوں نہیں کرتے تھے ان کے رفع یدین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہوگی اور وجہ وہی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہو چکا تھا کہ اسکنوفی الصلواۃ نماز میں سکون اختیار کرو مالی ارٰکم رافعی ایدیکم کیا ہو گیا ہے کہ میں تم کو رفع یدین کرتا ہوا دیکھتا ہوں، اس جملہ میں رفع یدین کرنے پر ناگواری کا اظہار ہے۔

امام بخاریؒ کو بھی رفع یدین کرنے والے صرف سترہ صحابہ کرامؓ کا پتہ چل سکا حضورﷺ کے وصال کے وقت صحابہ کرامؓ کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی اتنی بڑی تعداد میں سے صرف سترہ کا امام بخاری پتہ لگا سکے جو رفع یدین کرتے تھے۔

اب تک کی ہماری گزارشات سے جو آپ کے اصل سوال کے متعلق تھی یہ بات آشکارا ہوگئی کہ مسلم شریف میں جو دونوں حدیثیں ہیں وہ دونوں الگ ہیں ایک کا تعلق رفع یدین روکنے سے ہے اور دوسرے کا تعلق نماز سے سلام پھیرتے وقت اشارہ کرنے سے منع کرنے سے ہے، جو لوگ دونوں کو ایک حدیث قرار دیتے ہیں ان کی سوچ غلط ہے، دونوں حدیثوں کا مضمون اس کے علاوہ جو اور فرق ہیں اس کی تائید نہیں کرتے۔

اگراب بھی کوئی غیر مقلد نہ مانے تو آپ اس سے کہیں کہ دونوں حدیثوں کے مضمون کو سامنے رکھ کراوران کی سندوں کو سامنے رکھ کروہ دونوں حدیثوں کوایک ثابت کر کے دکھلائے، نیز اگر دونوں حدیثیں ایک ہی ہیں جیسا کہ امام بخاری کا بھی خیال ہے تو امام بخاری کی تشریح کے مطابق صحابہ کرام تشہد میں ہاتھ اٹھا کر ایک دوسرے کوسلام کرتے تھے، ان کوتشہد میں سلام کرنے سے نہیں روکا گیا صرف ہاتھ اٹھانے سے روکا گیا ہے اب غیر مقلدین حالت تشہد میں بلا ہاتھ اٹھائے ایک دوسرے کوسلام کرنے کی سنت کو جاری کریں۔

خدا کرے ہماری یہ تحریر آپ کے لیےاور زمزم کے دوسرے قارئین کے لیے باعث تسلی ہو۔

والسلام محمد ابوبکر غازیپوری

گردن پر مسح کرنے کا حکم:

محترم مولانا محمد ابوبکر صاحب زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

بعض غیر مقلدین حضرات سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ گردن پر مسح کرنا جائز نہیں براہ کرم صحیح بات کیا ہے اس سے آگاہ فرمائیں۔ والسلام

خورشید انصاری جون پور یوپی

زمزم!

جن حضرات کے یہاں ضعیف حدیث اور اقوال اعمال صحابہ سے استدلال جائز ہے ان کے نزدیک گردن کا مسح ثابت ہے اور جن کے یہاں ضعیف حدیث قابل عمل نہیں ہے اور صحابہ کرام کا قول وفعل حجت نہیں ہے ان کے نزدیک گردن کا مسح جائز نہ ہوگا۔

گردن کے مسح کے سلسلہ میں عام طور پر جو احادیث ہیں ان پر محدثین نے ضعف کا حکم لگایا ہے اس وجہ سے جن کا یہ مذہب ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنا حرام ہے ان کے نزدیک گردن کا مسح درست نہیں ہے، اور جن کا یہ مذہب ہے کہ حدیث ضعیف اگر موضوع اور من گھڑت نہ ہو صرف ضعیف ہو یعنی اس کی سند میں بعض روای کمزور قسم کے ہوں تو اس کو رد نہیں کیا جائے گا بلکہ اگر صحیح حدیث سے اس کا تعارض اور ٹکراؤ نہ ہو تو اس پر بھی عمل ہوگا، ان کے نزدیک گردن کا مسح درست ہوگا، اور یہ فیصلہ بر بنائے احتیاط ہے۔

ایک بات یہ یاد رکھیئے کہ گردن کا مسح نہ کرنے سے وضو جاتا نہیں ہے بلکہ جو لوگ گردن کے مسح کے قائل ہیں وہ صرف جواز استحباب کے قائل ہیں گردن کا مسح کرنا کسی کے یہاں فرض وواجب نہیں ہے۔

غیر مقلدین حضرات میں دو گروپ ہو گیا ہے، ایک گروپ جو ابھی بیس پچیس سال کے اندر کی پیداوار ہے جن کا نام البانیے اور ابن بازیئے ہے، ان کا مذہب تو یہ ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز نہیں ہے اور غیر مقلدین کا ایک گروپ وہ ہے جس کی پیدائش پر صدی ڈیڑھ صدی کا عرصہ گذرا ہے اور جس کا سرا مولانا میاں نذیر حسین اور نواب صدیق حسن سے ہوتا ہوا، شوکانی یمنی تک پہنچتا ہے، ان حضرات کا مسلک یہ ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز ہے اور اس سے شرعی حکم ثابت ہوتا ہے تو غیر مقلدین کے اس گروپ کے نزدیک گردن کے مسح کا انکار درست نہ ہوگا۔

احناف کا مشہور مذہب ہے کہ ضعیف حدیث کا ضعف اگر بہت زیادہ نہیں ہے اور اس کا ٹکراؤ بھی صحیح حدیث سے نہیں ہو رہا ہے تو اس پر عمل کرنا جائز ہے بلکہ اولی اور افضل ہے، اس وجہ سے ان کے یہاں گردن پر مسح کرنا بہتر ہے اسلئے کہ گردن پر مسح کو بتلانے والی روایات ضعیف تو ہیں مگر ان کا ضعف ایسا نہیں ہے کہ وہ موضوع احادیث کے درجہ میں آجائیں، اور ان کا ٹکراؤ صحیح احادیث سے بھی نہیں ہو رہا ہے، مثلاً آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول کسی روایت صحیح میں گردن پر مسح کرنے سے منع نہیں کیا گیا ہے اگر کسی صحیح حدیث میں منع کیا

گیا ہوتا اور ضعیف حدیث میں اس کا ثبوت ہوتا تو یہ ٹکراؤ کی شکل تھی اور اب ضعیف حدیث کا چھوڑنا ازروئے قاعدہ محدثین ضروری ہوتا مگر جب یہ ٹکراؤ کی شکل نہیں ہے اور منع کی کوئی حدیث نہیں ہے اور ثبوت متعدد ضعیف احادیث سے ہے اور صحابہ کرام کے عمل سے بھی ضعیف حدیث کے مضمون یعنی گردن پر مسح کرنے کی بات کی تائید ہوتی ہے تو اب احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ صحابہ کرامؓ کے عمل کو دیکھتے ہوئے اس ضعیف حدیث پر عمل کیا جائے اس لیے کہ محتاط محدثین کے نزدیک کسی حدیث کا محض ضعیف ہونا اس کے مردود ونامقبول ہونے کی علامت نہیں بنتا

اوپر میں نے عرض کیا کہ غیر مقلدین گروپ کے البانیوں اور ابن بازیوں کو چھوڑ کر خود اکابر غیر مقلدین یعنی شوکانیت والے غیر مقلدین کا مذہب بھی یہی ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز ہے۔

فتاویٰ ستاریہ کا یہ فتویٰ ملاحظہ فرمایئے، سوال کیا گیا کہ، ضعیف حدیث پر عمل کیا جا سکتا ہے جواب دیا جاتا ہے کہ۔

ضعیف حدیث بھی قابل عمل ہوتی ہے ج ۴ ص ۴۷ فتاوی ستاریہ اور غیر مقلدین کے شیخ الکل میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ضعیف حدیث سے جو موضوع نہ ہو استحباب وجواز ثابت ہوتا ہے۔

فتاویٰ نذیریہ ص ۵۶۴ ج ۱

اور مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں کہ محرم کی دسویں تاریخ کو کھانے میں وسعت کرنے کا ثبوت حدیث سے ہے پھر وہ حدیث پیش کی ہے اور پھر اس حدیث کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

اس حدیث کو اگرچہ بعض محدثین ضعیف اور ناقابل احتجاج اور بعض نے موضوع (من گھڑت) کہا ہے مگر حق بات یہ ہے کہ حدیث موضوع نہیں ہے (ص ۲۷۶ ج ۱)

یعنی حدیث موضوع اور من گھڑت اگرچہ نہیں ہے مگر ضعیف بہر حال ہے اور ایسی ضعیف ہے کہ بعض محدثین نے اس کا ضعف دیکھ کر اس کو موضوع تک کہہ دیا ہے اب دیکھئے ایسی ضعیف حدیث سے بھی محرم میں کھانے میں وسعت کرنے کا حکم شرعی مولانا عبدالرحمٰن صاحب ثابت کر رہے ہیں۔ غیر مقلد عالم مولانا محمد صادق سیالکوٹی کی کتاب صلوٰۃ الرسول میں تقریباً ۸۴ ضعیف حدیثیں ذکر کی گئی ہیں۔

جب اکابر غیر مقلدین کا فیصلہ آپ کے سامنے آ گیا کہ ضعیف حدیث سے مسئلہ شرعی ثابت ہوتا ہے تو پھر یہ کہنا کہ گردن پر مسح بتلانے والی احادیث ضعیف ہیں اور اس سے گردن پر مسح کا ثبوت نہیں ہو سکتا، غلط اور باطل ہو گیا گردن پر مسح کو بتلانے والی دو ایک حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

میں صرف ترجمہ کر رہا ہوں حدیث کے جن کو الفاظ دیکھنے ہیں وہ حدیث اور اہلحدیث کتاب کیطرف رجوع کریں۔

(۱) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے وضو کیا اور دونوں ہاتھ سے اپنی گردن پر مسح کیا قیامت کے روز طوق پہنائے جانے کے عذاب سے محفوظ رہے گا، (تلخیص الحبیر ج ۱ ص ۹۳)

(۲) حضرت طلحہ بن مصرف اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے اگلے سر سے پچھلے سر گردن کے آخر حصہ تک مسح کیا۔

طحاوی ج ۱ص ۴۸

(۳) معجم طبرانی میں حضرت وائل بن حجرؓ کی ایک روایت میں ہے کہ ثم مسح رقبته وبا طن اللحیته کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تو آپ نے گردن کا اور داڑھی کے نچلی حصہ کا مسح کیا۔

شیخ السلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

ومن استحبه فاعتمد فيه على اثر يروى عن ابی ہریرہ رضی الله عنه اوحديث يضعف نقله

یعنی گردن پر مسح کو جس نے مستحب سمجھا ہے تو اس نے اس بارے میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ایک اثر پر اور ضعیف حدیث پر اعتماد کیا ہے۔

(فتاوی ابن تیمیہ ص ۱۲۸ ج ۲۱)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے حدیث پر تو ضعف کا حکم لگایا ہے مگر حضرت ابوھریرہؓ والے اثر پر آپ نے ضعف کا حکم نہیں لگایا، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوھریرہ کا اثر صحیح ہے اگر وہ بھی ضعیف ہوتا تو شیخ السلام ابن تیمیہ اس کا بھی ضعف ظاہر کرتے جس طرح انہوں نے حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

چونکہ احناف کے نزدیک صحابہ کرامؓ کا عمل حجت ہے اور ضعیف حدیث پر بھی عمل جائز ہے اس وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ احناف کا یہ کہنا کہ گردن پر مسح جائز ہے۔ خلاف دلیل ہے یا اسلام اور صحابہ کرام کے عمل کے خلاف ہے، بلکہ اکابر غیر مقلدین کے مذہب کے مطابق بھی گردن پر مسح جائز ہونا چاہیے اسلئے کہ ان کے نزدیک اگر چہ صحابہ کرام کا قول وفعل حجت نہیں ہے مگر ضعیف حدیث سے ان کے نزدیک بھی استحباب اور جواز کا حکم ثابت ہوتا ہے جیسا کہ سابق میں معلوم ہوا میں نے آپ کے سوال میں ذرا درازنفسی سے کام لیا اس لیے کہ مجھے معلوم ہوا کہ اندور شہر میں ایک پمفلٹ کے ذریعہ اس مسئلہ کو بھی اچھالا جا رہا ہے۔

والسلام محمد ابوبکر غازی پوری

محمد ابوبکر غازی پوری　　　　　　خط کا جواب

رمضان میں تراویح کے بعد
وتر پڑھنا افضل ہے یا تہجد کے بعد

محترمی زید مجدہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالی صحت و عافیت کے ساتھ تا دیر سایۂ عاطفت قائم رکھے۔ زمزم برابر مل رہا ہے اس کی ضرورت وافادیت روز روشن کی طرح عیاں ہے، جس کو قاری ہی محسوس کر سکتا ہے۔

عرض خدمت یہ ہے کہ احناف رمضان المبارک میں تراویح کے ساتھ ہی وتر پڑھ لیتے ہیں کیا حضورﷺ اور صحابہ کرام کا یہی معمول تھا اب کوئی آخری شب میں تہجد پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے یا نہیں اگر پڑھے تو لا صلوٰۃ بعد الوتر کے خلاف ہوگا یا نہیں، امید کہ مدلل جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

محمد عارف حسین قاسمی مدرسہ اسلامیہ لطیفیہ

سردار شہر چورو راجستھان

زمزم!

آپ ﷺ نے وتر کا وقت عشاء کے بعد سے قبل طلوع فجر تک کا مقرر کیا ہے آپ ﷺ نے خود اس پر عمل کیا اور آپ کے بعد صحابہ کرامؓ کا بھی اس پر عمل رہا ہے۔ بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے، فرماتی ہے

عن عائشةؓ قالت كل الليل اوتر رسول الله صلى الله عليه وسلم وانتهى وتره الى السحر

یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے ہر حصہ میں وتر کی نماز پڑھی ہے اور آپ کی انتہا سحر پر ہوتی تھی۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ وتر عشاء کی نماز کے بعد طلوع سحر سے پہلے پہلے رات کے ہر حصہ میں پڑھنا جائز ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔

من كل الليل قد اوتر رسول الله صلى الله عليه وسلم من اوله واوسطه وآخره لكن ثبت الوتر لرسو ل الله صلى الله عليه وسلم من آخر الليل

یعنی رات کے ہر حصہ میں رسول اللہ ﷺ نے وتر کی نماز پڑھی ہے اول حصہ میں (۱) بیچ کے حصے میں اور رات کے آخر حصہ میں البتہ رسول اللہ ﷺ کے لئے وتر کا پڑھنا بعد میں آخری حصہ میں ثابت رہا (۲)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ واما وتره فی آخره فكانه كان غالب احواله من

(۱) فتح الباری میں ہے۔ المراد باوله بعد صلوٰۃ العشاء ج ۲ص ۴۸۷ یعنی اول حصہ سے مراد عشاء کی نماز کے بعد کا وقت ہے۔

(۲) چونکہ آپ ﷺ پابندی سے نماز تہجد ادا کرتے تھے اس وجہ سے عموماً وتر تہجد کے بعد ہی پڑھا کرتے تھے اور افضل یہی ہے کہ جو پابند تہجد ہو وہ رات کے آخری حصہ میں تہجد کے بعد وتر پڑھے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا

مواظبته ﷺ علی الصلوٰۃ اکثر اللیل (الفتح ج ۲ص ۴۸۷)

یعنی آپ ﷺ کا آخری رات میں وتر پڑھنا غالباً اس وجہ سے تھا کہ آپ ﷺ کی عادت مبارکہ رات کے بیشتر حصہ میں نماز پڑھنے کی تھی۔

مسند احمد میں حضرت معاذؓ کی مرفوع روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔

زادنی ربی صلوٰۃ وھی الوتر وقتھا من العشاء الی طلوع الفجر .

یعنی حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے ایک مزید نماز عطا کی ہے اور یہ وتر کی نماز ہے اس کا وقت عشاء سے طلوع فجر تک ہے۔

ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ وتر کی نماز کا وقت عشاء کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے اور جس نے تہجد سے پہلے عشاء کے بعد یا تراویح کے بعد نماز وتر پڑھ لی اب اس کو دوبارہ وتر کی نماز نہیں پڑھنی چاہئے اس لئے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہیں اور یہی جمہور فقہاء ومحدثین کا مذہب ہے کہ ایک رات میں دو دفعہ وتر نہیں پڑھی جائے گی۔ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا لا وتران فی الیلۃ یعنی دو وتر ایک رات میں نہیں ہے یعنی دو وتر کو ایک رات میں پڑھنا جائز نہیں ہے امام ترمذی فرماتے ہیں کہ

قال بعض اھل العلم من اصحاب النبی ﷺ اذا اوتر من اول اللیل ثم نام ثم قام من آخرہ انه یصلی مابداله ولا ینقص وترہ ویدع وترہ علی ماکان وھو قول سفیان الثوری ومالک بن انس واحمد وابن المبارک وھذا اصح لانه قدروی من غیر وجه ان النبی ﷺ قدصلی بعد الوتر .

یعنی بعض اہل علم صحابہ کرام اور تابعین کا یہ مذہب ہے کہ جب آدمی شروع رات میں وتر پڑھ لے پھر سو جائے اور پھر تہجد کے لئے اٹھے تو جتنی رکعت چاہے پڑھے اور اپنی وتر کو توڑے نہیں (۱)

(۱) پہلی وتر کو توڑنے کا مطلب یہ ہے کہ سو کر جب اٹھے تو صرف ایک رکعت پہلے پڑھے تاکہ جو اس نے اول رات میں تین رکعت یا ایک رکعت وتر پڑھی ہے وہ دو رکعت یا چار رکعت ہو جائے اور وہ نماز وتر باقی نہ رہے یہ مذہب اسحاق کا ہے اور حضرت ابن عمرؓ سے بھی اس قسم کا عمل منقول ہے، فقہ میں اس مسئلہ پر ''نقض وتر'' کے عنوان سے بحث ہوتی ہے۔

اور جو اس نے وتر پڑھ لی ہے اس کو اسی طرح چھوڑ دے یہی سفیان ثوری، مالک بن انس، امام احمد، اور ابن المبارک کا مذہب ہے اور یہی زیادہ صحیح قول ہے اسلئے کہ آپ ﷺ سے متعدد سندوں سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے وتر کے بعد بھی نماز ادا کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ سے صاف صاف اس بارے میں ممانعت منقول ہے، مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت ابن عباس اور حضرت عائذ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اذا اوتر اول اللیل فلا توتر آخرہ واذا اوترت آخرہ فلا توتر اوله یعنی جب تو شروع رات میں وتر پڑھ لے تو آخر رات میں

مت پڑھ اور اگر آخر رات میں وتر پڑھے تو شروع رات میں مت پڑھ، یعنی تجھ کو وتر صرف ایک بار پڑھنا ہے۔

پھر حضرت امام ترمذی نے اس بات کی تائید میں کہ حضور ﷺ وتر کی نماز کے بعد بھی نفل نماز ادا کی ہے حضرت ام سلمہؓ کی یہ حدیث ذکر کی ہے،

عن ام سلمۃؓ ان النبی ﷺ کان یصلی بعد الوتر رکعتین

یعنی حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ وتر کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے تھے۔

پھر امام ترمذی فرماتے ہیں۔ وقد روی نحو ھذا عن ابی امامۃؓ وعائشۃؓ وغیر واحد عن النبی ﷺ یعنی اس طرح کی روایت کہ آپ ﷺ وتر کے بعد بھی نفل پڑھا کرتے تھے حضرت

ابو امامہؓ اور حضرت عائشہؓ اور ان کے علاوہ متعدد صحابہ کرامؓ سے مروی ہے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت مسلم شریف، ابو داؤد اور نسائی میں ہے مسلم شریف میں اس طرح روایت ہے

کان یصلی بعد الوتر وھو جالس، یعنی آپ ﷺ وتر کی نماز کے بعد بیٹھ کر نفل ادا کرتے تھے۔

حضرت ابی امامہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ پہلی رکعت میں سورۃ الزلزال اور دوسری میں قل یایھا الکافرون پڑھا کرتے تھے۔

حضرت ابن عباس کی مصنف ابن ابی شیبہ میں ایک روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں من اوتر اول اللیل ثم قام فلیصل رکعتین رکعتین یعنی اگر کوئی شروع رات میں وتر ادا کر لے تو پھر تہجد میں دو دو رکعت کر کے نماز ادا کرے۔

بہت سے تابعین کا بھی یہی مذہب ہے جس کی تفصیل مصنف ابن ابی شیبہ اور احادیث کی دوسری کتابوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔

بہر حال ان روایات سے معلوم ہوا کہ وتر کی نماز کے بعد بھی نماز پڑھنا ثابت ہے اس لئے بعض حدیث میں جو یہ مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اجعلوا آخر صلوٰتکم باللیل وتراً (بخاری) یعنی تم لوگ رات کی اپنی آخری نماز وتر کو بناؤ، تو اس حدیث میں امر وجوب کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنا مستحب ہے ابن قیم اس حدیث کو نقل کر کے فرماتے ہیں حملوا قولہ اجعلوا آخر صلوٰتکم باللیل وتراً علی الاستحباب یعنی حضور ﷺ کے قول کو کہ تم لوگ رات کی آخر نماز وتر کو بناؤ لوگوں نے استحباب پر محمول کیا ہے (زاد المعاد ج ا ص ۳۳۲) لیکن یہ استحباب اس کے لئے ہے جو نیند سے جاگ کر نوافل پڑھنے کا عادی ہو اور اس کو وثوق ہو کہ اس کی وتر چھوٹے گی نہیں اگر کسی کو اپنے بیدار ہونے کا وثوق نہ ہو تو بہتر اس کے لئے یہی ہے کہ وہ وتر ادا کر کے سوئے اگر وہ تہجد کے لئے بیدار ہوا تو خیر ورنہ اس کی وتر تو نہیں چھوٹی

مسلم شریف میں حضرت جابرؓ کی اس بارے میں جو روایت ہے اس سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اجعلوا آخر صلوٰتکم باللیل وترا میں جو حکم ہے وہ صرف استحباب کے لئے ہے اور اس شخص کے لئے ہے جو سو کر بیدار ہونے کا عادی ہو یا اس کو وثوق ہو کہ وہ بیدار ہو جائے گا۔ مسلم شریف کی روایت یہ ہے آپ ﷺ نے فرمایا۔

من طمع منکم ان یقوم آخر اللیل فلیوتر من آخرہ فان صلوٰۃ آخر اللیل مشھودۃ وذلک افضل ومن

خاف منکم

ا ن لایقوم من آخر اللیل فلیوتر من اولہ

یعنی جو تم میں سے اس کی توقع رکھے کہ وہ رات کے پچھلے حصہ میں بیدار ہوکر تہجد پڑھے گا تو وہ تہجد کے بعد وتر پڑھے اس لئے کہ آخر رات میں جو نماز ادا کی جاتی ہو اس میں فرشتوں کی حاضری ہوتی ہے اور یہی بہتر ہے اور جس کو اندیشہ ہو کہ وہ پچھلے پہر اٹھ نہیں سکے گا تو اس کو شروع رات ہی میں وتر پڑھ لینی چاہئے (ا)

حضرت ابو ہریرۃؓ فرماتے ہیں کہ اوصانی النبی ﷺ بالوتر قبل النوم یعنی نبی اکرم ﷺ نے مجھے

(!) آپ نے جو حدیث نقل کی ہے اگر وہ کسی کتاب میں ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہوگا ان احادیث کی روشنی میں کہ ایسا کرنا اولیٰ اور انسب نہیں ہے اس کا یہ مطلب لینا کہ وتر کی نماز کے بعد کوئی نماز ممنوع اور حرام ہے خلاف واقعہ بات ہوگی ایسا کیسے ہوسکتا ہے جب کہ خود آنحضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے اور تابعین سے وتر کے بعد نماز پڑھنی ثابت ہے اور آپ ﷺ خود امر فرما رہے ہیں کہ جس کو آخری شب میں اٹھنا مشکل ہو وہ شروع ہی شب میں وتر پڑھ لے۔

حکم بلاشبہ یہی مذہب حق اور صواب ہے کہ جو تہجد کے لئے جاگ سکتا ہو وہ تہجد کے بعد ہی وتر پڑھے لیکن یہ حکم سب کے لئے نہیں ہے اسی وجہ سے بخاری شریف ہی میں ہے کہ دیا کہ میں سونے سے پہلے ہی وتر پڑھ لیا کروں۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے

اوصانی خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم ان لاانام الاعلی الوتر یعنی میرے خلیل نے مجھے وصیت فرمائی کہ میں وتر پڑھ کر کے ہی سوؤں۔

حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا کہ ارأیت ان اوترت قبل ان انام ثم تمت من اللیل فشفعت حتی اصبح قال لیس بذاک باس .

یعنی آپ فرمائیں کہ آپ کی کیا رائے ہے اگر میں سونے سے پہلے وتر پڑھ لوں پھر اٹھ کر نوافل پڑھوں تا آنکہ طلوع صبح ہوجائے (یعنی کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں) تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے حضرت سعید بن حارث نے اسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ اذا کنت لاتخاف الصبح ولا النوم فاشفع ثم صل ثم اوتر والا فصل وترک الذی کنت اوترت۔

یعنی اگر تم کو نیند کا خوف ہو یا صبح ہوجانے کا خوف ہو تو پہلے وتر ادا کرو مصنف ہی میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ سے پوچھا

تم وتر کب پڑھتے ہوتو انہوں نے فرمایا کہ میں عشاء کی نماز کے بعد شروع رات ہی میں سونے سے قبل وتر پڑھ لیتا ہوں پھر آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے پوچھا تم وتر کب پڑھتے ہوتو حضرت عمرؓ نے کہامیں تورات کے آخری حصہ میں وتر پڑھتا ہوں تو آپ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا، اخذت بالحزم تمہارا عمل احتیاط پر ہے اور حضرت عمرؓ سے فرمایا تو نے مضبوطی کو اختیار کیا ہے

غرض ان تمام احادیث وآثار سے معلوم ہوتا ہے کہ سونے سے قبل وتر پڑھنے کا معمول صحابہ کرامؓ میں تھا اور خود حضور ﷺ سے بھی اس کا ثبوت ہے۔

پس معلوم ہوا کہ تراویح کے بعد جو وتر پڑھ لیا جائے تو تہجد کے وقت اس کا اعادہ نہیں کرنا ہے بلکہ اس کا پہلا وتر ہی کافی ہے۔ جو لوگ ایک رات میں دو وتر پڑھتے ہیں ان کا یہ عمل اس حدیث کے خلاف ہے کہ دو وتر ایک رات میں نہیں ہے بلکہ جن کو وتر چھوٹ جانے کا اندیشہ ہوتو ان کے لیے یہی متعین ہے کہ وہ تراویح کے بعد متصلا وتر پڑھ لیں چونکہ تراویح میں خواص کم ہوتے ہیں عوام کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور جو خواص ہوتے ہیں ان میں بھی بہت کم ہی لوگ پابند تہجد ہوتے ہیں، عوام تو اکثر تہجد سے تعلق ہی نہیں رکھتے اس وجہ سے احتیاط کا یہی تقاضا ہے کہ تراویح کے ساتھ وتر بھی پڑھ لیا جائے تا کہ تراویح میں شریک ہونے والے تمام مصلیوں کی وتر ادا ہوجائے اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو بہت سے لوگوں کی وتر کی نماز جو احناف کے یہاں واجب ہے چھوٹ جائے گی تہجد کے ساتھ وتر پڑھنا زیادہ سے زیادہ مستحب ہے، کسی مستحب فعل کو حاصل کرنے کے لیے واجب کا ترک کرنا جائز نہیں نہ عقلا نہ شرعا۔

آجکل حرم شریف میں ائمہ حضرات یہ کرتے ہیں کہ رمضان کے عشرہ اخیر میں تراویح کے بعد وتر نہیں پڑھتے ہیں بلکہ تہجد کی نماز کے بعد وتر ادا کرتے ہیں، اور چونکہ وہ تراویح کے بعد وتر نہیں پڑھتے ہیں اس لیے کہ تراویح میں شریک ہزار ہا ہزار لوگوں کا وتر چھوٹ جاتا ہے، اسلئے کہ تراویح میں شریک تمام لوگ تہجد میں حاضر نہیں ہو پاتے ہیں اور نہ ان کو الگ سے وتر پڑھنے کی توفیق ہوتی ہے، ان ہزاروں آدمیوں کی وتر چھوٹ جانے کا گناہ ان ائمہ کے سر جاتا ہے ان کا یہ عمل نہایت قبیح ہے، نہ اس کا ثبوت کسی حدیث سے ہے اور نہ کسی صحابی کے اثر سے، یہ عمل بدعت ہے اور اس بدعت کے ترویج کے گناہ گار حرم شریف کے ائمہ کرام ہیں جن کے سامنے صرف یہ حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ تم اپنی آخری نماز وتر کو بناؤ ان ائمہ حرمین کو یہ پتہ نہیں کہ یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کس کے لیے ہے (۱)

اگر آپ کے ذہن میں یا کسی اور کے ذہن میں حرم کے ائمہ کا عمل ہے تو خوب جان لینا چاہیے کہ ائمہ حرم کا یہ عمل قطعا غیر شرعی ہے، ائمہ حرم ہونے کی وجہ سے ان کے کسی غلط اور غیر شرعی عمل کی تائید نہیں کی جاسکتی۔

(۱) خوب سمجھ لیجئے کہ کسی حدیث کا صحیح مطلب جاننے کے لیے بسا اوقات بہت ساری دوسری حدیثوں کو بھی دیکھنا پڑتا ہے پھر ان تمام احادیث کی روشنی میں اس حدیث کا صحیح معنی واضح ہوتا ہے فقہاء کرام علیہم الرحمتہ کا یہی امتیاز ہوتا ہے کہ وہ مسائل شرعیہ کی چھان بین میں بڑی جانفشانی اٹھاتے ہیں احادیث کے ذخائر پر انکی نگاہ ہوتی اور متعلق مسئلہ کا کتاب وسنت کی روشنی میں ہر پہلو کا جائزہ لے کر پھر وہ کوئی فیصلہ

صادر فرماتے ہیں۔ میں یہاں یہ بھی بتلا دوں کہ غیر مقلدوں میں سے جو ان کے سابق علماء تھے ان کا مذہب بھی یہی ہے کہ وتر پڑھ لینے کے بعد دوبارہ وتر نہیں ادا کی جائیگی، مولانا مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی ترمذی کی شرح میں فرماتے ہیں وھذا ھو المختار عندی ولم اجد حدیثا مرفوعا صحیحا یدل علی ثبوت نقض الوتر (ج ۱ ص ۳۴۵)

یعنی میرے نزدیک بھی پسندیدہ بات یہی ہے کہ ایک رات میں دو وتر نہ ادا کئے جائیں اسلیے کہ مجھے کوئی ایک حدیث بھی صحیح مرفوع نہ ملی جس سے پہلی وتر کا توڑنا ثابت ہوتا ہو۔ البتہ غیر مقلدوں کی محرومی یہ ہے کہ وہ تراویح کو وتر کے ساتھ پڑھ کر تہجد کی نماز سے بھی اپنے ذمہ کو فارغ کر لیتے ہیں، یعنی انکو آخر شب میں تہجد پڑھنے کی سعادت سے اللہ نے محروم کر دیا ہے اور اخیر شب میں تہجد پڑھنے کے جو فضائل ہیں یہ غیر مقلدین بیچارے ان تمام فضیلتوں اور ثوابوں سے عدم تقلید کی پاداش میں محروم کر دیئے گئے

زمزم کے بارے میں آپ کے خیالات سے خوشی ہوئی۔

نوٹ: یہ تحریر ایک ہی نشت میں بہت جلدی میں لکھی گئی ہے اسلئے اہل علم حضرات کو اس جواب میں کوئی بات خلاف تحقیق نظر آئے تو احقر کو مطلع فرمائیں اگر وہ چاہیں گے تو ان کی تحقیق کو زمزم میں شائع بھی کر دیا جائے گا۔ والسلام

محمد ابوبکر غازی پوری

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو
امام اصحاب الرای کیوں کہا جاتا ہے؟

محترمی حضرت مولانا محمد ابوبکر صاحب زادمجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ　　　　مزاج اقدس

جناب والا کی تحریرات پڑھنے کا اکثر موقع ملتا رہتا ہے، زمزم کا مطالعہ تو پابندی سے کرتا ہوں، آپ کی کئی کتاب بھی دیکھ چکا ہوں، غیر مقلدین کی ڈائری لاجواب کتاب اور لمحہ فکریہ اتنی دلچسپ کہ پڑھو تو ختم کئے بغیر نہیں رہا جاتا، الحمدللہ آپ کی تحریرات ہر مسئلہ میں بڑی تشفی بخش ثابت ہوتی ہے انداز بھی بہت سہل ہوتا ہے کہ عام لوگ بھی اہم بحثوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

ایک گزارش ہے کہ کتاب وسنت میں جیسا کہ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ قیاس ورائے کی مذمت ہے، اور اصحاب الرائی کو حضرت عمرؓ نے اعداء السنن فرمایا ہے تو امام ابوحنیفہؒ کو اصحاب الرای کیوں کہا جاتا ہے براہ کرم اس پر ذرا تفصیلی روشنی ڈالیں؟

والسلام آپ کا خادم نور محمد شیخ اورنگ آباد

زمزم: زمزم کے بارے میں آپ کے تاثرات میرے لیے باعث خوشی ہیں، زمزم اپنے مقدور بھر احناف اور فقہ حنفی کے خلاف پھیلائی باتوں اور پروپیگنڈوں سے متاثر لوگوں کے سامنے حقیقت حال لانے کی کوشش کررہا ہے، نیز سلفیت اور غیر مقلدیت کے نام پر جو فتنہ برپا ہوچکا ہے عوام کو اس سے آگاہ کررہا ہے، صحابہ عظام، اسلاف کرام، ائمہ دین کے بارے میں ان سلفیوں کی ناگفتنیوں سے مسلمانوں کو باخبر کررہا ہے۔ اگر یہ سب صدق دل اخلاص کے ساتھ ہو تو اللہ سے اجر ثواب کی امید ہے اور اگر اس میں نفس کا دخل ہے تو ساری کوشش رایگاں اور ساری محنت ضائع، اسلیے دعا فرمائیں کہ اللہ صدق واخلاص کی نعمت سے ہمیں سرفراز کرے۔

جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو عرض ہے کہ صاحب رائے ہونا عین محمود صفت ہے یہ عیب کی کوئی بات نہیں ہے، کہا جاتا ہے کہ فلاں صاحب رائے ہے، اس کا مطلب ہماری زبان میں بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ صاحب عقل ہے، صاحب فراست ہے، ہوشمند اور ہوشیار ہے، صاحب بصیرت ہے، اس کے دل کی بینائی روشنی ہے، وہ سوچ سمجھ کر کام کرنے والا آدمی ہے، صاحب تدبیر ہے، بے بصیرت بے عقل نہیں ہے، بیوقوف اور احمق نہیں ہے، بدھو اور بدعقل نہیں ہے۔

غرض صاحب رائے ہونا تو بڑی اچھی بات ہے، چونکہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کو اللہ نے دین وشریعت کے بارے میں بڑا صاحب بصیرت اور صاحب عقل بنایا تھا اس وجہ سے انکو بطور خاص اہل علم نے صاحب رائے کہا ہے بلکہ اصحاب رائے کا امام کہا ہے امام ابو

حنیفہؒ کا تفقہ انکی، ذہانت، وذکاوت، دور بینی ودور اندیشی، طبعیت کی تیزی اور دانش وبینش میں ان کا مقام بلندان چیزوں کا انکاران کے ان سے حسد کرنے والوں اوران کے مخالفوں کو بھی ہے اس وجہ سے ہم تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو صاحب رائے ہونے کو عیب نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ ان کے صاحب رائے ہونے کو انکی بڑی خوبی اوران پر اللہ کا انعام سمجھتے ہیں، جو صاحب رائے نہ ہوگا وہ کتاب وسنت کے احکام کو کیا سمجھے گا اور شریعت کے مغز کو کیا پائے گا کتاب وسنت میں تبحر اس کو کیسے حاصل ہوگا، شریعت کے مغز کو وہی پائے گا اور کتاب وسنت کے اسرار اسی پر کھلیں گے جو صاحب رائے وصاحب عقل ہوگا اور جس کے دل کی آنکھیں روشن ہوں گی، جو غور وفکر کا عادی ہوگا، کوڑھ مغزوں اور دل کے اندھیروں پر شریعت کے اسرار اور کتاب وسنت کے حقائق کیونکر کھل سکتے ہیں۔

فیروز للغات اردو کی مشہور اور مستند لغت ہے اس میں رائے کا ترجمہ لکھا ہے تجویز، دانائی، عقل، خیال، مشورہ، قیاس، اور لغات فارسی میں رائے کا معنی ہے عقل ، تدبر، تجویز خیال، دانائی، اور مشہور لغت صراح میں رائے کا معنی دیدن بدل کیا ہے یعنی رائے کا معنی دل سے دیکھنا ہے اور اسی دل سے دیکھنے کو دل کی بصیرت ودل کی بینائی کو کہتے ہیں اور اسی دانائی وبینائی کو روشن ضمیری کہتے ہیں تو اب اگر خالص لغت کو سامنے رکھ کر صاحب رائے کا مفہوم اخذ کیا جائے تو اس کا معنی یہ نکلتا ہے صاحب رائے یعنی صاحب تجویز، صاحب عقل ،صاحب خیال، صاحب مشورہ ،صاحب تدبر، روشن ضمیر، صاحب دانائی وبینائی صاحب قیاس یعنی کام کو اندازہ سے کرنے والا اور مسائل کی علت دریافت کرنے والا۔

براہ کرم آپ بتلائیں کہ کیا ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی انسان کے لئے مذموم ہے یا اس کے خلاف ہونا قابل مذمت اور عیب کی بات ہے۔

اب غیر مقلدوں اور زمانہ حاضر کے سلفیوں کی عقل پر ماتم کیجئے کہ جو چیز ارباب علم ودانش کے یہاں محمود قرار پاتی ہے اور جو صفت انسان کے لئے باعث زینت اور باعث خوبی ہے غیر مقلدین اسی محمود صفت کو مذموم قرار دینے کے درپے ہیں یعنی ان غیر مقلدین کے نزدیک آدمی کا بے عقل ہونا اس کے عاقل ہونے سے اور اس کا بے بصیرت ہونا اس کے بابصیرت ہونے سے اور اسکے دل کا اندھا ہونا اس کیدل کے روشن اور بینا ہونے سے زیادہ اچھی اور بہتر بات ہے۔

بہر حال چاہے غیر مقلدین کتنے ہی پیچ پاہوں اللہ نے حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ کو حد درجہ روشن ضمیر، حد درجہ صاحب بصیرت حد درجہ دانا بینا بنایا تھا، اس وجہ سے آپ بلاشبہ اپنے زمانہ میں اصحاب الرائے کے امام تھے، حضرت امام اعظم کی اس صفت کا اعتراف بڑے بڑے ائمہ فقہ وحدیث کو تھا حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں اگر حدیث معلوم ہو اور اس کے معنی معلوم کرنے کی ضرورت ہو تو امام سفیان ثوری اور امام مالک اور امام ابوحنیفہؒ کی رائے جاننی چاہیے پھر فرماتے ہیں کہ ان تینوں میں امام ابوحنیفہ سب سے اچھی رائے والے اور باریک فہم والے ہیں۔

(خطیب ص ۳۴۳)

یہی عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ اگر سفیان ثوری اور امام ابوحنیفہؒ کسی بات پر جمع ہو جائیں تو وہ میرے نزدیک قوی بات

ہوگی۔ایضا

نیز فرماتے ہیں:

میں نے فقہ میں ان سے بہتر کلام کرنے والا نہیں دیکھا (ایضا)

مزید فرماتے ہیں:

اگر شرعی مسائل میں رائے سے کسی کو بات کہنی ہو تو میرے نزدیک یہ حق ابو حنیفہؒ کو ہے کہ وہ اپنی رائے سے بات کہیں (ایضا)

ابن داؤد فرماتے ہیں کہ اگر فقہ کی باریک باتوں کو معلوم کرنا ہو تو امام ابو حنیفہؒ سے معلوم کرو (ایضا ص ۳۴۴)

حضرت یحیٰ قطان فرماتے ہیں:

ہم خدا سے جھوٹ بولنے والے نہیں ہیں ہم نے امام ابو حنیفہؒ سے زیادہ اچھی رائے والا نہیں دیکھا (ایضا ص ۳۴۵)

حضرت امام شافعیؒ کا قول مشہور ہے جو تاریخ خطیب اور دوسری بہت سی کتابوں میں ہے کہ۔

فقہ میں لوگ امام ابو حنیفہؒ کے محتاج ہیں۔

غرض حضرت امام اعظم کی ذکاوت وذہانت اور فقہ میں غواصی اور باریک بینی کا شہرہ انہیں کے زمانہ میں پھیل چکا تھا اور وہ اپنی انہی صفات کی وجہ سے رائے وفقہ میں امام اہل الرای کہلاتے تھے۔

امام اعظم سے پہلے یہ لقب حضرت امام مالک کے استاذ ربیعہ کو ملا تھا اور رائے ان کے نام کا جز بنا ہوا تھا، ان کا تعارف ہی ربیعہ الرای سے ہوتا ہے ان کو ربیعۃ الرای کیوں کہا جاتا ہے تو حافظ ذہبی فرماتے ہیں۔

کا ن بصیرا با الر ی ولذا لک یقال له ربیعة الرای (تذکره)

یعنی چونکہ ان کو رائے میں بصیرت حاصل تھی یعنی وہ علم شریعت کے بارے میں بڑے دانا بینا اور روشن ضمیر تھے اس وجہ سے انکو ربیعۃ الرای کہا جاتا ہے۔

امام یحیی بن سعید فرماتے ہیں کہ ربیعہ بہت زیادہ پختہ عقل والے تھے (تاریخ بغداد)

قرآن پاک میں اصحاب بصائر، اور اصحاب عقل کی تعریف کی گئی ہے نہ کہ بے عقلوں اور بے بصیرتوں کی بلکہ اللہ تو یہ فرماتا ہے کہ اصل بینائی تو دل ہی کی بینائی ہے جو اس نعمت سے محروم رہا وہی لوگ فی الاصل اندھے کہلانے کے مستحق ہیں انھا لاتعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور، یعنی اندھا پن نگاہوں کا نہیں ہوتا حقیقت میں اندھا پن تو دلوں کا ہوتا ہے جو سینہ میں ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں کافروں کو **صم بکم عمی فهم لا یعقلو ن** فرمایا گیا، یعنی یہ کافر بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں اسلئے وہ لوگ خدا کی بات کو سمجھتے نہیں ہیں ان کافروں کو جانوروں سے بھی زیادہ بے عقل اور گمراہ کہا گیا ہے،

. **ان هم الا کا لا نعام بل هم اضل ،**

یہ اسی لیے کہ یہ لوگ خدا کی باتوں کو شریعت کے احکام کو نبی کے فرمان کو سمجھنے میں اپنے عقل اور اپنی رائے کو بالائے طاق رکھدیتے ہیں اگر یہ کافر عقل ورائے کا استعمال کرتے یا ان کے پاس عقل ورائے ہوتی تو خدا کی باتوں کی حقانیت اور اسلام اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی حقانیت وصداقت ان پر کھلتی اور یہ اسلام کے قبول کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے میں ذرہ بھی تردد نہ کرتے اس سے واضح ہوا کہ کسی میں عقل ورائے کی صفت کا ہونا یہ عین خوبی کی بات ہے اور یہ خدا کا ایک عظیم عطیہ ہے جس پر اللہ کا شکر واجب ہے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ نے اس عظیم دولت سے خوب خوب نوزا تھا یہاں تک کہ خود ان کے زمانہ کے لوگ بڑے بڑے فقہاء بڑے بڑے محدثین کتاب وسنت کے ماہرین کو اصحاب الرای کہتے تھے اور ان کے حسن رائے کی داد دیتے تھے اور چونکہ امام ابو حنیفہؒ کے تلامذہ بھی آپ کی خدمت میں رہ کر اور آپ کی صحبت کی برکت سے اور خدا کے ان کے اوپر بے انتہا فیضان سے عقلائے زمانہ شمار ہونے لگے تھے اور شریعت میں نہایت دقیقہ رس بن گئے تھے، اس وجہ سے ان سب کو بھی اصحاب الرای کہا جاتا تھا، ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ:

انما سمو بذالک لدقۃ رأیھم وحذاقۃ عقلھم

(مرقات جلد دوئم ص ۷۸)

یعنی اصحاب امام ابو حنیفہ کو اصحاب الرای اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی رائے دقیق تھی اور ان کی عقل پختہ اور تیز تھی فقہ حنفی کو جو خدا داد مقبولیت حاصل ہوئی اور امت کے دوثلث سے زیادہ لوگوں نے اسکو جو دین وشریعت پر عمل کرنے کے لیے اختیار کیا تو اس کا راز بھی یہی ہے کہ یہ فقہ کتاب وسنت کی مضبوط بنا پر قائم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ترتیب وتدوین میں بڑی دقیقہ رسی سے کام لیا گیا ہے فقہ حنفی کے علاوہ یہ بات کسی اور فقہ میں نہیں پائی جاتی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر عقل ورائے کا استعمال صحیح طریقہ پر ہو تو یہ بات قابل تعریف ہے اور اگر اس کا استعمال بیجا اور غلط ڈھنگ سے ہو تو یہ مذموم حرکت ہے اسی وجہ سے رائے کی دو قسم ہے، ایک مذموم رائے اور ایک محمود رائے یعنی اگر کتاب وسنت کے مقابلہ میں اور خدا اور رسول کے احکام کے منصوص احکام کو رد کرنے کے لیے رائے کا استعمال کیا جائے تو یہ مذموم رائے کہلائے گی اور اگر عقل ورائے کو شریعت کے حقائق ودقائق اور اس کے اسرار معلوم کرنے اور خدا کے احکام پر عمل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ رائے محمود ہوگی۔

احادیث پاک میں یا سلف کے اقوال میں جس رائے کی برائی ہے یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو خدائی احکام کو رد کرنے کے لیے اور شریعت پر عمل کرنے سے جان چرانے کے لیے اپنی رائے کا سہارا لیتے ہیں انہیں کو اعداالسنن سنتوں کا دشمن کہا جاتا ہے جیسے غیر مقلدین کا حال ہے کہ خدا اور رسول اور قرآن وسنتوں کے مقابلہ میں رائے کا استعمال کرتے ہیں اسلیے یہ اعداسنن ہیں اور ان سے پرہیز کرنا لازم ہے مثلا دیکھئے کہ انہوں نے یعنی غیر مقلدین نے اپنا مذہب یہ بنایا ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قبر مبارک کی زیارت اور آپ پر صلوۃ سلام پڑھنے کے لیے سفر کر کے مدینہ پاک جانا حرام ہے اس بارے میں انہوں نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل خلاف اپنا یہ عقیدہ بنایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس کو قاضی عیاض نے معتد دسندوں سے نقل کیا ہے

من زار قبری وجبت لہ شفاعتی (۱)

یعنی جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہے، غیر مقلدین کی عقل وفہم کا حال یہ ہے کہ وہ ابن تیمیہ کی تقلید میں لاتشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد کی حدیث سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت کرنے کو حرام قرار دیتے ہیں جب کہ اس حدیث پاک میں مساجد کا بیان ہے نہ کہ قبروں کی زیارت کا اور آپ ﷺ کی قبر کی زیارت کے بیان کا تو اس حدیث پاک میں دور دور تک نشان نہیں ہے جس طرح قرآن وحدیث کے مقابلہ میں رائے اور قیاس کا استعمال حرام ہے اسی طرح اپنی رائے سے کسی حدیث کا من مانا اور گڑھا ہوا مطلب بیان کرنا بھی حرام ہے غیر مقلدین نے اس مسئلہ میں یہی مذموم حرکت کی ہے، حدیث کا اپنی رائے سے غلط معنی بیان کر کے سنت سے دشمنی کا ثبوت بہم پہنچایا اور جو بات تمام اہل سنت کے نزدیک مشروع اور نہایت مبارک تھی اس کو ان غیر مقلدین نے محض اپنی رائے سے حرام قرار دیا۔

(۱) غیر مقلدین اس حدیث کو ضعیف کہتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ جو حدیث متعدد ضعیف سندوں سے مروی ہو وہ قوی اور حسن لغیرہ ہو جاتی ہے، یہ بات محدثین میں معروف ہے اسلیے اس کا انکار کرنا جائز نہیں ہے نیز یہ کہ اگر حدیث ضعیف بھی ہو مگر اہل علم کا اس پر عمل ہو تو بلا شبہ وہ حدیث قابل احتجاج ہوتی ہے آپ کی قبر کی زیارت کرنے اور اس کے لیے سفر کے جواز مشروع ہونے پر تمام اہلسنت کا اجماع ہے غیر مقلدین اور ابن تیمیہ اور ابن قیم ہی جیسے لوگ اس کے منکر ہیں اسلیے بلاشبہ یہ حدیث قابل عمل اور قابل حجت ہے اور اس کی دلیل اجماع امت بھی ہے

اسی طرح سے غیر مقلدین کے نزدیک زانیہ کی کمائی اگر زانیہ نے توبہ کر لی ہے تو جائز ہے حالانکہ حدیث پاک میں ہے کہ زانیہ کی کمائی خبیث اور حرام ہے، بخاری وترمذی وغیرہ میں یہ حدیث ہے، مگر غیر مقلدین نے حدیث پاک کے ساتھ دشمنی کی، اور اپنی رائے سے جو چیز حرام تھی اسکو حلال قرار دیا۔

حدیث پاک میں ہے کہ اللہ فرماتا ہے جو میرے ولی سے عداوت رکھتا ہے میں اس سے اعلان جنگ کر دیتا ہوں مگر آج کے غیر مقلدین نے اولیائے امت کیخلاف محاذ جنگ چھیڑ رکھا ہے اور تصوف انکو بدعت نظر آتا ہے اور سارے اولیاء کرام جو تصوف سے وابستہ تھے ان غیر مقلدین کو گمراہ نظر آتے ہیں شیخ عبدالقادر جیلانی امام غزالی مولانا رومی، نظام الدین اولیا مجدد الف ثانی معاذ اللہ یہ سارے بزرگان دین آج کے غیر مقلدین کے مذہب وعقیدہ کے مطابق گمراہ ہیں غیر مقلدین کا یہ فیصلہ محض اپنی رائے سے ہے اور حدیث پاک کے خلاف ہے۔

جن بزرگوں کی ولایت پر اجماع امت ہو غیر مقلدین ان کو گمراہ قرار دیں اس سے بڑھ کر گمراہی کیا ہو سکتی ہے۔

بعض غیر مقلدین کے نزدیک کھیل کود کے لیے نماز کو اپنے وقت سے موخر کیا جا سکتا ہے یہ بات محض اپنی رائے سے انہوں نے گڑھی ہے، قرآن میں صاف موجود ہے کہ ساری نماز کے اوقات مقرر ہیں، نماز کو ان کے اوقات سے آگے پیچھے بلا عذر

شرعی نہیں کیا جا سکتا، قرآن کے مقابلہ میں یہ غیر مقلدین کی رائے اور ان کا اجتہاد ہے اسی قسم کے اجتہادات ورائے کی کتاب وسنت میں مذمت ہے، اس رائے اور اجتہاد کی نہیں جس کا مقصد شریعت کے احکام پر عمل کرنا ہوتا ہے، اور ان کی تہ تک رسائی ہوتی ہے اور انکی علتوں کو معلوم کرنا ہوتا ہے تا کہ اس جیسے دوسرے مسائل پر عمل کرنا بھی آسان ہو جائے اور اس کے بارے میں بھی شریعت کا حکم معلوم ہو جائے۔

خطیب بغدادی فرماتے ہیں

والقیاس هو حجة فی الشر عیا ت وطریق لمعرفة الاحکا م و دلیله من ادلتها من جهة الشر ع

یعنی قیاس شرعی مسائل کے لیے حجت ہے اور احکام شریعت کے جاننے کا ایک راستہ ہے اور وہ شرعی دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔

الفقیہ والمتفقہ ص ۱۷۸

پھر فرماتے ہیں کہ قیاس ورائے کا انکار کرنے والے اہل سنت نہیں بلکہ معتزلہ اور شیعہ نے اس کا انکار کیا ہے فرماتے ہیں۔

وذهب ابر اهیم النظا م والرا فضة الی انه لیس بطریق للا حکا م الشرعیه

یعنی ابراہیم النظام اور رافضیوں نے یہ کہا ہے کہ قیاس احکام شریعت کے معلوم کرنے کا ذریعہ نہیں ہے۔

پھر فرماتے ہیں۔

فرقہ ظاہریہ نے بھی اس کا انکار کیا ہے (ایضا)

تو جب قیاس ورائے احکام شرعیہ معلوم کرنے کا اہلسنت کے نزدیک ایک ذریعہ ہے اور وہ شرعی دلیل ہے، تو صاحب رائے وقیاس ہونا یہ عیب کیسے قرار پائیگا۔ اور جو اس وصف سے متصف ہوگا اس کو برا کیسے سمجھا جائے گا، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مذموم رائے اور قیاس وہ ہے جو نص کے مقابل ہو اور جس کا مقصد شرعی احکام کو اپنی رائے سے باطل کرنا ہے، ظاہر بات ہے کہ ائمہ اس طرح کی رائے وقیاس سے بری ہیں، تو وہ احادیث جن میں قیاس ورائے کی مذمت ہے ان کو ان ائمہ پر چسپاں کرنا نہایت درجہ جہالت اور گمراہی کی بات ہے۔

احادیث میں جن رائے والوں اور قیاس والوں کی مذمت آئی ہے ان کی صفت بھی بیان کر دی گئی ہے کہ یہ لوگ وہ ہوتے ہیں جو اپنی رائے اور اپنے قیاس سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے ہیں اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے۔

یقیسو ن الامور برایھم فیحلو ن الحرام ویحر مون الحلال

یعنی یہ لوگ اپنے قیاس کے ذریعہ حرام کو حلال کرتے ہیں اور حلال کو حرام کرتے ہیں۔

اس طرح کی رائے وقیاس بلاشبہ مذموم ہے اور یہی لوگ دین میں فتنہ برپا کرنے والے ہیں اور آج کے زمانہ میں یہ کام سلفی اور غیر مقلدین کر رہے ہیں اللہ ان سے پناہ میں رکھے۔

حضرت امام اعظمؒ کا تو حال یہ تھا کہ وہ ضعیف حدیث کے مقابلہ میں بھی رائے وقیاس سے پرہیز کرتے تھے، ان کا یہ مذہب تمام اہل علم کو معلوم ہے۔(۱)

(۱) نواب صدیق حسن خان بھوپالی فرماتے ہیں کہ ذکر ابن حزم الاجماع علی ان مذهب ابی حنیفة ان ضعیف الحدیث اولی عنده من الرایٔ والقیاس اذلم یجد فی الباب غیره (دلیل الطالب ص۸۸۷) یعنی اگر کسی مسئلہ میں صحیح حدیث نہ ملے تو ابن حزم نے اس پر اجماع ذکر کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ تھا کہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث قیاس اور رائے سے اولیٰ ہے۔

حضرت امام اعظمؒ کی احتیاط اور دین میں بے جا رائے وقیاس کے دخل دینے سے پرہیز کا عالم یہ تھا کہ وہ کتاب وسنت کے بعد اقوال صحابہؓ میں سے کسی کو اختیار کرتے تھے، قیاس ورائے کا استعمال وہ بالکل آخر میں کرتے جب نہ کتاب میں اس کا حکم ہوتا اور نہ سنت رسول اللہ ﷺ میں اور نہ کسی صحابیؓ کا اس مسئلہ میں قول ملتا۔ خود فرماتے ہیں:

اٰخذ بکتاب الله فما لم اجد فبسنة رسول الله ﷺ فان لم اجد فی کتاب الله وسنة رسول الله ﷺ اخذت بقول اصحابه اٰخذ بقول من شئت منهم وادع من شئت منهم ولا اخرج من قولهم الیٰ قول غیرهم فاما اذاانتهی الامر الی ابراهیم والشعبی وابن سیرین والحسن وعطاء وسعید بن ابی المسیب فقوم اجتهد وافاجتهد کما اجتهدوا .(تاریخ خطیب ص ۳۱۸ ج ۳)

یعنی میں پہلے کتاب اللہ کو اختیار کرتا ہوں پھر سنت رسول اللہ کو لیتا ہوں، اور جو چیز کتاب وسنت میں نہیں ملتی ہے تو میں صحابہ کے اقوال میں سے کسی ایک کا قول اختیار کرتا ہوں، لیکن جب معاملہ ابراہیم نخعی، شعبی، ابن سیرین، حسن بصری، عطاء اور سعید بن مسیّب تک پہنچ جاتا ہے، تو جس طرح ان لوگوں نے اجتہاد کیا میں بھی اس مسئلہ میں اجتہاد کرتا ہوں۔

یہ خود امام اعظم کا بیان ہے، ان کا یہ کلام مختلف کتابوں میں منقول ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حضرت امام اعظمؒ کتاب وسنت بلکہ صحابہ کے قول کی موجودگی میں بھی اجتہاد وقیاس ورائے سے کام نہیں لیتے تھے۔ جب کسی مسئلہ میں قیاس کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تب ہی قیاس کرتے تھے۔ اور ان کا یہ عمل بھی کتاب وسنت اور اقوال صحابہ کی روشنی میں تھا، یعنی خود کتاب وسنت اور اقوال صحابہ سے دینی مسائل میں قیاس ورائے کا ثبوت ہے۔

حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کا قصہ حدیث وتفسیر کی کتابوں میں مشہور ہے کہ دو عورتیں تھیں دونوں کا ایک ایک بچہ تھا، کوئی بھڑیا آیا اور ایک بچہ کو اٹھا کر لے گیا دونوں عورتیں میں جھگڑا ہوا، ہر ایک کا دعوی تھا کو بچہ رہ گیا ہے وہ اس کا ہے، یہ مقدمہ حضرت داؤدؑ کے پاس گیا، حضرت داؤد نے جو عورت عمر کے لحاظ سے بڑی تھی اس کے حق میں فیصلہ کردیا، جب یہ عورتیں حضرت سلیمان کے پاس گزریں تو

انہوں ان سے معلوم کیا ابا جان نے کیا فیصلہ کیا ہے، عورتوں نے حضرت داؤد کے فیصلہ سے ان کو آگاہ کیا تو حضرت سلیمان نے کہا کہ تم دونوں کا فیصلہ میں کروں گا، پھر انھوں نے چھری منگا کر کہا کہ میں اس بچہ کو آدھا آدھا کروں گا اور تم دونوں کو اس کا آدھا آدھا حصہ دوں گا، یہ سن کر چھوٹی عمر کی عورت نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے اسی بڑی عورت کا ہے چھوٹی عمر والی عورت کی حالت غیر ہو رہی تھی جب کہ بڑی عمر والی عورت کے چہرے سے سلیمانؑ کی بات سن کر کسی پریشانی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا، اس سے حضرت سلیمانؑ نے سمجھ لیا کہ یہ بچہ بڑی کا نہیں ہے اسی چھوٹی عورت کا ہے، جو اس کے قتل کئے جانے پر راضی نہیں تھی اور اپنے دعوی سے بچہ کی جان کی سلامتی کی خاطر دست بردار ہو رہی تھی۔

دیکھئے یہاں دو پیغمبر ہیں حضرت داؤد اور اس کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہما السلام اور ان دونوں نے اپنے اجتہاد اور اپنی رائے سے اس مسئلہ میں فیصلہ کیا۔ تو اگر کسی شرعی مسئلہ میں رائے واجتہاد کا استعمال حرام اور ناجائز ہوتا تو کیا کوئی اللہ کا نبی پیغمبر اجتہاد ورائے کا استعمال کرتا۔ اگر غیر مقلدوں کی منطق کا استعمال کیا جائے تو معاذ اللہ کہنا پڑے گا کہ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام نے حرام کام کیا اس سے آپ اندازہ لگالیں گے کہ شرعی مسائل میں مطلقاً قیاس ورائے کے استعمال کو حرام قرار دینا کس قدر خطرناک بات ہے اور اس سے حضرات انبیاء پر کیسا الزام عائد ہوتا ہے۔

بخاری ومسلم کی روایت میں صاف اللہ کے رسول کا ارشاد موجود ہے کہ فیصلہ کرنے والے اگر اپنی رائے وقیاس سے فیصلہ کریں گے تو غلطی پر بھی ان کو ایک اجر ملے گا۔(۱)

بھلا بتائیں کہ اگر اجتہاد کرنا اور رائے کا استعمال کرنا مطلقاً حرام ہوتا ہے تو حضورﷺ کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہوگا آپ تو شرعی مسائل میں اجتہاد ورائے کی استعمال کی حاکموں اور قاضیوں کو ترغیب دے رہے ہیں اور غیر مقلدین جو اہلحدیث بنتے ہیں قیاس ورائے کو حرام قرار دینے کے درپے ہیں۔

قیاس ورائے کے بارے میں حضرت معاذؓ کی مشہور حدیث ہے کہ آنحضورﷺ نے ان کو یمن کا مفتی بنا کر جب بھیجنے کا ارادہ کیا تو ان سے پوچھا تم فیصلہ کس طرح کروگے تو انہوں نے فرمایا کتاب اللہ سے آپ نے دریافت کیا کہ اگر وہ حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو انہوں نے فرمایا میں سنت رسول اللہ سے فیصلہ کروں گا۔ پھر آپ نے پوچھا کہ اگر اس مسئلہ کا حکم تم کو سنت رسول اللہ میں بھی نہ ملے تو کس طرح فیصلہ کروگے تو حضرت معاذ نے فرمایا پھر میں اجتہاد کروں گا اور اپنی رائے کا استعمال کرونگا اس پر آپﷺ نے خوشی کا اظہار فرمایا اور فرمایا الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله لمایرضی رسول الله یعنی اللہ کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہ کے قاصد کو اس بات کی توفیق عطا فرمائی جس کو اللہ کا رسول پسند کرتا ہے

(۱) بخاری ومسلم کی پوری حدیث یہ ہے حضرت عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اذا حکم الحاکم فاجتهد فاصاب فله اجران واذا حکم الحاکم فاجتهد فاخطا فله اجر واحد (بخاری ج ۲ ص ۹۳)

اس سے معلوم ہوا کہ دینی وشرعی مسائل میں اجتہاد تو اللہ کے رسول کا پسندیدہ عمل تھا اگر یہ چیز نا جائز اور حرام ہوتی تو اللہ کے رسول اس کو پسند کیوں فرماتے یہ کھوپڑی تو غیر مقلدین ہی کو حاصل ہے کہ رسول خدا کا پسندیدہ ومحبوب عمل بھی ان کو حرام اور نا جائز دکھائی دیتا ہے ۔جب ان غیر مقلدوں کو کوئی چارہ نہیں دکھائی دیتا ہے ان کی طرف سے اس حدیث کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے غیر مقلدوں اور فرقہ ظاہریہ، کے علاوہ کسی اور کو اس حدیث پر کلام کرنے اور اس کو ضعیف قرار دینے کی جرأت نہیں ہوئی۔

صحیح حدیث کو ضعیف بتلا کر رد دینے کا یہ سہرا انہیں غیر مقلدین کے سر بندھا ہے۔

حافظ ابن عبد البر اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں

حدیث معاذصحیح مشهور رواه الائمه وهواصل فی الاجتها د والقیادس .(جامع بیان العلم ج ۲ ص ۷۷)

یعنی حضرت معاذ کی حدیث صحیح اور مشہور ہے۔جس کو عادل وثقہ ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث اجتہاد وقیاس کے (مشروع ہونے کی) اصل ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے۔

اور خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مشہور ہے وراس کے رواۃ کثیر ہیں اور اس کی دوسری سند میں سب راوی ثقہ ہیں، تمام اہل علم نے اس حدیث کو قبول کیا ہے اور اس سے حجت پکڑی ہے یہ اس کے صحیح ہونے کی مزید دلیل ہے (الفقیہ المتفقہ ص ۱۸۹)

غرض یہ حدیث قیاس ورائے کی مشروعیت کے سلسلہ میں تمام اہل فقہ واہل علم کے نزدیک قابل قبول ہے، تمام ائمہ نے اس سے استدلال کیا ہے اور اسے قبول کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ کے سوال کا جواب ہو گیا اور آپ نے معلوم کر لیا کہ دینی مسائل میں قیاس ورائے کا استعمال کرنا مذموم عمل نہیں ہے بلکہ اس کی بنا کتاب وسنت اور فعل صحابہ وتابعین پر اور تمام اہل سنت کے نزدیک قیاس ورائے کا استعمال شرعی مسائل میں مشروع ہے۔

اور چونکہ امام ابوحنیفہ تفقہ واجتہاد کے میدان میں شہ سواروں کے شہ سوار تھے اور اللہ نے ان کو قیاس واجتہاد میں امتیازی شان عطا فرمائی تھی اس وجہ سے وہ امام اصحاب الرائ کہلائے اور چونکہ عام طور پر محدثین کو یہ شرف حاصل نہیں رہا ہے

اسی لئے انہوں نے حسد سے کام لیا اور امام اعظم کے اس لقب کو برے انداز میں لوگوں میں پھیلایا اور رائے وقیاس کی مذمت میں وارد جھوٹی اور سچی (۱)

روایتوں کی مخلوق خدا کو گمراہ اور فقہ حنفی سے بدظن کرنے کے لئے اشاعت کی قاتلہم اللہ (۲)

(۲) امام ابوحنیفہ اپنے حاسدوں کے بارے میں فرماتے ہیں

ان یحسدونی فانی غیر لائمهم قبلی من الناس اهل الفضل قدحسدوا

فدام لی ولهم مابی و بهم ومات اکثر ناغیظا بما یجدوا

یعنی اگر میرے دشمن مجھ پر حسد کرتے ہیں تو میں ان کو ملامت کرنے والا نہیں ہوں اس لئے کہ مجھ سے پہلے اصحاب فضل پر حسد کیا جاچکا ہے جو چیز میرے لئے ہے وہ ہمیشہ میرے لئے رہے گی اور جو چیز ان کے ساتھ ہے وہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گی اور بیشتر لوگ مارے حسد وغصہ کے مر گئے محمد ابوبکر غازی پوری

(۱) قیاس ورائے کی مذمت میں عام طور پر جو حدیثیں نقل کی جاتی ہیں سب ضعیف وکمزور اور واہی سندوں سے مروی ہیں افسوس ان لوگوں پر ہے جو کہ ان ضعیف احادیث سے قیاس ورائے کی مذمت بیان کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ضعیف احادیث کو صحیح بنا کر پیش کرنا محدثین کے یہاں بڑا جرم ہے۔

محمد ابوبکر غازی پوری　　　　　خط اور اس کا جواب

حالت تشہد میں انگلی ہلانے کا مسئلہ

مکرمی حضرت مولانا ابوبکر غازی پوری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آج کل غیر مقلدین نماز کے اندر ایک نیا طریقہ اضافہ کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ سنت ہے۔ تشہد پر جب پہنچتے ہیں تب سے لے کر سلام پھیرنے تک شہادت کی انگلی ہلاتے رہتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ کے قلم سے اس کے صحیح مفہوم سے ہم آگاہی حاصل کریں آپ کی کتابوں اور زمزم سے حق واضح ہورہا ہے ،اللہ تعالیٰ آپ کی محنت کو قبول فرمائیں اور تمام مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

فقط جمیل احمد قاسمی

کرلا ویسٹ جری مری بمبئی

زمزم!

غیر مقلدین حضرات کی اپنی دنیا ہے، اور یہ دنیا سب سے نرالی ہے اسلاف کرام اور ائمہ دین اور جمہور امت کی دنیا سے بالکل الگ اور بالکل منفرد دنیا اور انفرادیت کی یہ شان اسی وقت تک باقی رہے گی جب تک کہ اس مذہبی دنیا میں نیا پن ہو۔ نئی نئی باتیں ہوں، نیا طریقہ نیا ڈھنگ ہو، جلسہ شہادت میں بیٹھنے کے وقت سے لے کر آخر نماز تک انگشت شہادت کا ہلانا اسی انفرادیت کا ایک مظہر ہے جس کی شہادت ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک مذہب میں نہیں ملتی اور یہ معلوم کرلیں کہ ائمہ اربعہ کا کسی بات پر اتفاق یا ان کا اجتماعی طور پر کسی بات سے اختلاف اس کے حق یا ناحق ہونے کی اتنی بڑی شہادت ہے کہ جس کا کوئی صاحب دین اور صاحب عقل انکار نہیں کرسکتا اس کا انکار کرنے والا مسلمانوں میں موجودہ صرف دو فرقہ ہے ایک شیعہ فرقہ اور دوسرا غیر مقلدوں کا فرقہ، وکلتاھما علی الضلالۃ بینۃ اور یہ دونوں فرقے کھلی گمراہی پر ہیں

اور تعجب تو یہ ہے کہ خود غیر مقلدین کا اس مسئلہ میں آپس میں اتفاق نہیں ہے صادق سیالکوٹی نے اپنی کتاب صلوٰۃ الرسول میں لکھا ہے کہ تشہد میں انگلی کا حرکت دینا بھی ثابت ہے اور نہ دینا بھی ثابت ہے، اس وجہ سے یہ دونوں عمل کرنا سنت ہے، یعنی ہلانا بھی اور نہ ہلانا بھی، صادق صاحب فرماتے ہیں۔

مشکوٰۃ شریف میں ابوداؤد اور دارمی شریف کے حوالہ سے حضرت وائل کی حدیث میں تحرکھا بھی آیا ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ انگلی ہلاتے تھے، اور حضرت عبداللہ بن زبیر کی حدیث میں لا تحرکھا ہے یعنی انگلی ہلاتے نہیں تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ہلانا بھی درست ہے اور

نہ ہلانا بھی درست ہے، اسلئے کبھی ہلانا بھی چاہئے اور کبھی نہ ہلانا بھی چاہئے تاکہ دونوں سنتوں پر عمل ہوتا رہے۔ (محقق ایڈیشن طبع اول ص ۳۰۸)

دلچسپ بات تو یہ ہے کہ صادق صاحب کو پتہ ہی نہ چلا کہ یہ حدیث ابوداؤد میں نہیں ہے چونکہ مشکوٰۃ والے سے غلطی ہوگئی تو صادق صاحب نے بھی ابوداؤد کا صاحب مشکوٰۃ پر بھروسہ کرکے حوالہ دیدیا۔ غیر مقلدوں کا علم بس اسی قدر رہوتا ہے اور اس پر بھی ان کو اجتہاد کا شوق پریشان کئے رہتا ہے۔ یہ حدیث نسائی اور دارمی میں ہے ابوداؤد میں نہیں۔ (دیکھو صلوٰۃ الرسول کا محقق ایڈیشن)

اور پھر صلوٰۃ الرسول کے محقق نے شیخ البانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ لایحرکھا والی حدیث شاذ اور منکر ہے۔ صحیح حدیث یحرکھا والی ہے یعنی ہلانا ہی ثابت ہے نہ ہلانا ثابت نہیں ہے یعنی نہ ہلانے کا جو عمل صادق صاحب کے یہاں سنت تھا دوسرے غیر مقلدوں نے اس کو ناجائز اور غیر سنت بتلایا اور جو حدیث صادق صاحب کے یہاں ثابت تھی دوسرے غیر مقلدوں نے اس کو غیر ثابت بتلایا اب غیر مقلدین دونوں حدیثوں پر کیسے عمل کریں گے غیر مقلدوں کی کونسی بات تحقیقی ہے صادق
صاحب والی یا البانی و محقق والی۔ اس کا فیصلہ غیر مقلدین کرکے عوام کی صحیح رہنمائی فرمائیں اگر صادق صاحب والی بات صحیح ہے تو اس کا اعلان کریں ورنہ یہ اعلان کریں کہ صلوٰۃ الرسول کتاب میں نماز کے مسائل غلط بھی درج کئے گئے ہیں

اب آپ احادیث کی کتابوں میں سے صحاح ستہ کا مطالعہ فرمائیں گے تو ہلانے والی روایت کا نام ونشان بھی نہیں ملے گا بلکہ سنن نسائی میں تصریح ملے گی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم انگشت شہادت کو ہلاتے نہ تھے۔ اور جن احادیث میں آپ کو ہلانے والی بات ملے گی ان میں یہ کہیں نہیں ملے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شروع تشہد سے ہی انگشت شہادت کو حرکت دیا کرتے تھے جب کہ غیر مقلدین کا مذہب یہ ہے کہ شروع تشہد ہی سے انگلی کو حرکت دینا مسنون ہے صادق سیالکوٹی صاحب لکھتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم شروع التحیات سے اخیر تک اشارہ کئے رہتے۔

پھر کچھ آگے فرماتے ہیں۔

رسول اللہ علیہ وسلم نے انگلی اٹھائی اور اسکو ہلاتے تھے۔

ان دونوں باتوں کو ملا کر غیر مقلدین نے اپنا مذہب یہ بنایا ہے کہ شروع تشہد ہی سے انگلی اٹھا کر ہلاتے رہنا چاہیے اور یہ سلسلہ ختمِ تشہد تک رہے گا۔

اب آیئے آپ کتب صحاح ستہ میں تشہد کے سلسلہ کی جو رواتیں ہیں انکو ملاحظہ فرمائیں آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کتابوں میں انگلی حرکت دینے کا کہیں ذکر نہیں ہے

بخاری شریف میں تو اس بارے میں کچھ نہیں ہے، مسلم شریف سے شروع کیجئے۔

(۱) مسلم شریف کی پہلی روایت میں ہے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ہے اس میں ہے

وضع یدہ الیسریٰ علی رکبتہ الیسری ووضع یدہ الیمنی علی فخذہ الیمنی واشار باصبعہ .

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشہد میں داہنا ہاتھ داہنے گھٹنے پر اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھا کرتے تھے اور اپنی انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔

(۲) عبداللہ بن زبیر ہی کی مسلم شریف میں یہی روایت ایک دوسری سند سے ہے کہ اس کے الفاظ اس طرح ہیں واشارہ باصبعہ السبابۃ۔

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سبابہ سے اشارہ کرتے تھے سبابہ بیچ کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان والی انگلی کو کہتے ہیں جسے ہم لوگ شہادت کی انگلی کہتے ہیں۔

(۳) مسلم شریف کی تیسری روایت حضرت عبداللہ بن عمر کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا جلس فی الصلوٰۃ وضع یدیہ علی رکبتیہ ورفع اصبعہ الیمنی التی تلی الا بھا م فد عا بھا .

یعنی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں بیٹھتے تو اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھتے اور اپنی اس انگلی کو اٹھاتے جو انگوٹھے سے ملی ہوئی ہے اور اس سے دعا کرتے۔

(۴) اور حضرت ابن عمر کی مسلم شریف میں یہی روایت ایک دوسری سند سے ہے اس میں ہے کہ واشارہ بالسبابۃ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے۔

(۵) مسلم شریف میں حضرت ابن عمرؓ ہی کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ساری انگلیوں کو سمیٹ لیتے اور اشا ر با صبعہ التی تلی الا بھا م یعنی انگوٹھے سے ملی انگلی سے اشارہ کرتے۔

مسلم شریف کی تشہد کے سلسلہ کی یہ کل پانچ روایتیں ہیں، اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان پانچوں روایتوں میں سے کسی ایک روایت میں بھی انگلی کو شروع تشہد سے لیکر آخر تک انگلی ہلانے کا ذکر تک نہیں بلکہ مطلقاً انگلی کو حرکت دینے ہی کا ذکر نہیں ہے۔

اب ابوداؤد شریف میں تشہد کی روایتوں کو ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) حضرت وائل بن حجر فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے جی میں کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو دیکھوں گا کہ آپ کیسے نماز پڑھتے ہیں تو میں نے دیکھا کہ

ووضع یدہ الیسریٰ علی فخذہ الیسریٰ وحد مرفقہ الایمن علی فخذہ الیمنی وقبض ثنتین وحلق ملقہ رأیتہ یقول ھکذا وحلق بشر الا بھا والو سطیٰ و اشارہ با السبابۃ.

یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ انگوٹھا اور بیچ کی انگلی کا حلقہ بنایا اور سبابہ سے اشارہ کیا۔

(۲) ابوداؤد نے بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ذکر کی ہے، اس میں بھی صرف اشارہ کا ذکر ہے

اذا جلس فی الصلو ۃ وضع کفہ الیمنی علی فخذہ الیمنی وقبض اصا بعہ کلھا واشارہ با صبعہ التی تلی الابھا م .

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد میں بیٹھتے تو ساری انگلیوں کو سمیٹ لیتے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے۔

(۳) ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن زبیر والی بھی روایت ذکر کی ہے ابوداؤد کی سند سے جو روایت ہے اس میں بھی صرف اشارہ ہی کا ذکر ہے۔

واشا رہ با صبعه

(۴) حضرت ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن زبیر کی یہ روایت بھی ذکر کی ہے جس میں انگلی کو حرکت نہ دینے کا صاف ذکر ہے۔

عن عامر بن عبدالله عن عبدالله بن الزنير انه ذكر ان النبی صلی الله عليه وسلم كان يشير با صبعه اذادعا ولا يحر كها

حضرت عامر اپنے والد حضرت عبداللہ بن زبیر سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد کے لیے بیٹھتے تو اپنی انگلی سے اشارہ کرتے اور اسکو حرکت نہیں دیتے تھے۔

(۵) ابوداؤد میں ایک روایت مالک بن نمیر الخزاعی کی ہے وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا

واضعا ذراعه اليمنى على فخذه اليمنى رافعا اصبعه السبا بة قد حنا ها شيئاً

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا داہنا ہاتھ اپنی داہنی ران پر رکھا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت کی انگلی کو اٹھا رکھا تھا اور اس کو جھکا رکھا تھا۔ (۱)

ابوداؤد شریف کی تشہد کے سلسلہ کی ان تمام رواتیوں میں کہیں بھی انگلی کو حرکت دینے کا ذکر نہیں ہے بلکہ ذکر ہے تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انگلی کو حرکت نہیں دیتے تھے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی روایت میں آپ نے دیکھا،

ابوداؤد کو آپ نے ملاحظہ فرمالیا، اب ترمذی شریف کی روایتیں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) حضرت ابوحمید فرماتے ہیں کہ میں تم لوگوں میں سے سب سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو جاننے والا ہوں پھر انہوں نے اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھ کر دکھلائی تو روایت میں یہ ہے واشار باصبعہ یعنی السبابۃ کہ انہوں نے شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔

(۱) یہاں ذراع سے مراد کلائی والا حصہ ہے یعنی ہاتھ کا وہ حصہ جو گھٹنہ پر رکھا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کہیں ذراع بول کر صرف کلائی سے پہلے کا حصہ مراد ہوتا ہے یہیں سے بخاری شریف کی اس حدیث کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دائیں ذراع کو بائیں ذراع پر نماز میں باندھتے تھے، یعنی اپنی دائیں کلائی کے حصہ سے بائیں کلائی کا حصہ پکڑتے تھے، بعض غیر مقلدین نے بخاری شریف کی حدیث سے نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے پر استدلال کیا ہے کہ چونکہ ذراع کہنی تک کے ہاتھ کو کہتے ہیں اس وجہ سے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کہنی تک کا پورا حصہ دوسری کہنی تک کے پورے حصہ پر رکھتے تھے اور یہ اس

وقت ہوگا جبکہ سینہ پر ہاتھ باندھا جائے مگر ابوداؤد کی اس روایت نے معاملہ کو صاف کردیا کہ ذراع کا اطلاق عربی زبان میں ہاتھ کے ایک جز اور ایک حصہ پر بھی ہوتا ہے اس وجہ سے بخاری شریف کی حدیث کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کلائی کو دوسری کلائی پر باندھتے تھے اگر غیر مقلدین اسکو نہ تسلیم کریں تو ابوداؤد شریف کی اس حدیث کی روشنی میں حالت تشہد میں کہنی تک حصہ ان کو اپنی ران پر رکھنا ہوگا۔

(۲) ترمذی نے حضرت ابن عمر والی بھی حدیث ذکر کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں ورفع اصبعه التی تلی الا بها م یدعو بها ، یعنی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم شہادت کی انگلی اٹھا کر دعا فرماتے ، امام ترمذی اس حدیث کو ذکر کرکے فرماتے ہیں۔

والعمل علیه عند بعض اهل العلم من اصحا ب النبی صلی الله علیه وسلم والتابعین یختا رون الا شا رة فی التشهد وهو قول اصحا بنا .

یعنی صحابہ وتابعین میں سے کچھ لوگوں کا یہی مختار مذہب ہے کہ تشہد میں اشارہ کرنا ہے اور یہی ہمارے اصحاب کا بھی مذہب ہے (یعنی تمام محدثین کا بھی یہی اشارہ کرنا مذہب ہے)

غیر مقلدین عالم مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری امام ترمذی کے اس کلام کی شرح فرماتے ہوئے فرماتے ہیں۔

المرد یقوله اصحا بنا هم اهلحدیث رحمهم الله تعالی کما حققنا ه فی المقد مة وکا ن للترمذی ان یقول والعمل علیه عندا اهل العلم فانه لایعرف فی هذا خلاف السلف ج ۱ ص ۲۴۲ تحفه

یعنی ترمذی کے اس قول اصحابنا سے مراد اہلحدیث ہیں (یعنی محدثین نہ کہ غیر مقلدین) جیسا کہ ہم نے مقدمہ میں اس کو تحقیق بیان کیا ہے اور ترمذی کو (بعض اہل العلم کے بجائے) یہ کہنا چاہیے تھا کہ اس پر اہل علم یا عام اہل علم کا عمل ہے اسلئے کہ اس مسئلہ میں کسی سلف سے اختلاف معلوم نہیں ہے۔

مولانا مبارکپوری کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ اسلاف میں انگلی سے اشارہ کرنا عام تھا مگر انگلی کو ہلانا ان کا مذہب نہیں تھا ، یا کم از کم عام طور پر ان کا یہ مذہب نہیں تھا ترمذی شریف کی احادیث آپ نے ملاحظہ فرمالیا اب سنن نسائی کھولئے اس میں۔

(۱) ایک روایت تو حضرت ابن عمر کی ہے جس میں انگلی سے اشارہ کا ذکر ہے یہ حدیث گزر چکی۔

(۲) دوسری وائل بن حجر کی ہے جس میں یہ ہے کہ

ثم قبض اثنتین من اصا بعه وحلق حلقه ثم رفع اصبعه فرأیته یحر کها ید عو بها

یعنی میں نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیوں کو سمیٹ کر حلقہ بنایا پھر اپنی انگلی کو اٹھایا پس میں نے دیکھا کہ آپ اس کو حرکت دے رہے ہیں اور اس کے ذریعہ سے دعا کر رہے ہیں۔

(۳) تیسری حدیث وہی حضرت ابن عمر کی ہے اس میں صرف شہادت کی انگلی اٹھانے کا ذکر ہے۔

(۴) چوتھی حدیث حضرت عبداللہ بن زبیر والی ہے جس میں اس کی صراحت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انگلی سے اشارہ فرماتے تھے

اور اس کو ہلاتے نہیں تھے۔

(۵) پانچویں حدیث ابن نمیر خزاعی والی ہے جس میں صرف اشارہ کا ذکر ہے اب آپ ابن ماجہ کو بھی دیکھ لیجئے ابن ماجہ نے باب قائم کیا ہے باب الاشارۃ فی التشہد یعنی یہ باب اس بات کے بیان میں ہے کہ تشہد میں اشارہ کرنا ہے اور اس باب کے تحت ابن ماجہ نے تین حدیثیں ذکر کی ہیں مالک بن نمیر الخزاعی کی حدیث جو گزر چکی ہے حضرت وائل کی حدیث یہ بھی گزر چکی ہے ابن عمرؓ کی حدیث یہ بھی گزر چکی ہے اور تینوں احادیث میں سے کسی ایک حدیث میں بھی انگلی کو حرکت دینے کا ذکر نہیں ہے۔

آپ کو اندازہ لگ گیا ہوگا کہ جن غیر مقلدوں نے اپنا مذہب یہ بنایا ہے کہ نماز کی سنت یہ ہے کہ تشہد کے لئے جب سے بیٹھا جائے اسی وقت سے تشہد کے ختم تک انگلی کو ہلاتے رہا جائے، ان کے پاس نسائی کی ایک حدیث کے علاوہ صحاح ستہ سے کوئی دلیل نہیں ہے میں نے مسلم شریف، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، اور ابن ماجہ، کی جو حدیثیں ذکر کی ہیں آپ ان کا شمار کریں تو مسلم کی پانچ ہیں اور ابو داؤد کی بھی پانچ ہیں اور ترمذی کی دو، نسائی کی پانچ ابن ماجہ کی تین روایتیں ہیں کل ملا کر اکیس ہوئیں ان اکیس روایتوں میں سے صرف نسائی کی ایک روایت میں انگلی کے حرکت دینے کا ذکر ہے بقیہ بیس روایتوں میں اس عمل کا کہیں اتہ پتہ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں انگلی ہلانا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں ہے اگر یہ عمل سنت ہوتا تو بیس روایتوں میں سے دو چار میں تو اس کا ذکر ہوتا، اس لیے سنت وہ عمل ہوتا ہے جس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عام طور پر عمل رہا ہو اور پھر اس عمل کو صحابہ کرام نے بھی اپنی زندگی میں داخل کیا ہو اور پھر وہ عمل امت میں ان حضرات کے واسطہ سے نقل در نقل اور عملا بعد عمل پہنچا ہو۔

اگر آپ صحابہ کرام اور تابعین اور ائمہ دین کے حالات معلوم کریں تو آپ کو انکی نمازوں میں اس ہلانے والے عمل کی حکایت نہیں ملے گی، ائمہ اربعہ کے مذاہب میں اس کا نشان نہیں ملے گا۔ پھر یہ بھی دیکھیں کہ وائل بن حجر کی حدیث ابو داؤد میں بھی ہے اور یہ حدیث ابن ماجہ میں بھی ہے لیکن ان دونوں کتابوں کی روایتوں میں انگلی ہلانے کا ذکر نہیں ہے صرف اشارہ کرنے کا ذکر ہے ہلانے کا ذکر صرف نسائی کی روایت میں ہے، اس معلوم ہوا کہ حضرت وائل نے کبھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی کو نماز میں ہلتے ہوئے دیکھا ہوگا بس اسی کو ذکر کر دیا یا انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ کرنے کو دیکھا تو اسی اشارہ کو بعض دفعہ حرکت دینے سے تعبیر کر دیا، چنانچہ اسی بات کو غیر مقلدوں کے مشہور عالم اور ترمذی شریف کے شارح مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں مولانا لکھتے ہیں

قد جاءت فی تحریک السبابۃ حین الاشارۃ حدیثان مختلفان فروی ابو داؤد والنسائی عن عبداللہ بن الزبیر قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یشیر باصبعہ اذا دعا ولا یحرکھا قال النووی اسنادہ صحیح فھذا الحدیث یدل صراحۃ علی عدم التحریک وھو قول ابی حنیفۃؒ وحدیث وائل بن حجر یدل علی التحریک وھو مذھب مالک ، قال البیھقی یحتمل ان یکون المراد بالتحریک والاشارۃ بھا لا تکریر تحریکھا حتی لا یعارض حدیث ابن الزبیر عند احمد والنسائی وابن حبان فی صحیحہ بلفظ کان یشیر بالسبابۃ ولا یحرکھا والا یجاوز بصرہ اشارتہ قال الشوکانی فی

النیل ومما یر شد الی ما ذکر ہ البیھقی روایۃ ابی داؤد لحدیث وائل فا نھا بلفظ واشا رۃ با السبا بۃ(ج ا ص ۲۴۲ تحفہ الا حوذی)

یعنی تشہد میں اشارہ کے وقت انگلی کے ہلانے کے بارے میں دو حدیثیں آئی ہیں اور یہ دونوں حدیثیں الگ الگ ہیں ابو داؤد اور نسائی میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد پڑھتے تو انگلی سے اشارہ کرتے اور اسکو ہلاتے نہیں تھے امام نووی فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے اور یہ حدیث صراحۃ دلالت کرتی ہے کہ انگلی کا ہلانا نہیں ہے اور یہی حضرت امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔

اور دوسری حدیث حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی ہے جو انگلی کے ہلانے کے بارے میں ہے یہ حضرت امام مالک کا مذہب ہے (۱) حضرت امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ہلانے سے مراد ہو سکتا ہے کہ اشارہ کرنا ہو نہ یہ کہ بار بار اور مسلسل حرکت دینا اور یہ معنی مراد لینا اس لئے بہتر ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی حدیث سے ٹکرائے نہیں جس کو امام احمد، نسائی اور ابن حبان نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ جس وقت انگلی سے اشارہ کرتے تو آپ ﷺ انگلی ہلاتے نہیں تھے اور آپ ﷺ کی نگاہ اشارہ سے ہٹتی نہیں تھی ۔اور شوکانی نے نیل الاوطار میں یہ لکھا ہے کہ جو بات امام بیہقی فرماتے ہیں اس کی طرف وائل کی وہ حدیث رہنمائی کرتی ہے جو ابوداؤد میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سبابہ سے اشارہ کرتے (یعنی اس میں ہلانے کا ذکر نہیں ہے صرف اشارہ کا ذکر ہے)

مولانا عبدالرحمٰن مبا کپوری کا بھی اس سے رجحان معلوم ہو گیا کہ وہ بھی صرف انگلی سے اشارہ کرنے کو صحیح سمجھتے ہیں انگلی کا تشہد میں ہلانا انکے نزدیک سنت نہیں ہے اس لیے کہ انہوں نے بیہقی اور شوکانی کا کلام ذکر کر کے اس کا رد نہیں کیا ہے بلکہ دونوں مختلف حدیثوں کی باہم توفیق و تطبیق کو اسی طرح اولیٰ قرار دیا ہے کہ حضرت وائل کی جس حدیث میں انگلی کے ہلانے کا ذکر ہے اس سے مراد اشارہ کرتے وقت انگلی کا ہلانا مراد ہے ہلانے والی حدیث اور نہ ہلانے والی حدیث کے مابین جو تعارض اور اختلاف ہے وہ ختم ہوا اور غیر مقلدین کی دوسری کتاب عون المعبود میں ہے کہ

وجمھور علی ان لمرا د با لتحر یک ھنا ھو الر فع لا غیرہ (ج ا ص ۳۷۵)

یعنی جمہور کا قول یہ ہے کہ جس حدیث میں حرکت دینے سے مراد صرف انگلی کا

(۱) خوب یاد رہے کہ غیر مقلدین شروع تشہد سے انگلی ہلاتے ہیں اور یہ امام مالک کا مذہب نہیں ہے امام مالک کا مذہب کلمہ شہادت کے وقت اشارہ کر کے انگلی کو حرکت دیتے رہنا ہے۔

اٹھانا ہے کوئی بھی دوسرا معنی نہیں۔

ایک بات جو یہاں اور بھی قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ مدینہ کے باشندہ نہیں تھے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچوقتہ نماز کا انہیں ہر روز کا مشاہدہ حاصل تھا بلکہ یمن سے سال میں کبھی کبھار آپ ﷺ کی خدمت کے لئے تشریف لاتے جب کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ مدینہ میں رہتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پنج وقتہ نماز کا مشاہدہ فرماتے تھے اس وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی

جو کیفیت حضرت ابن زبیر بیان فرمائینگے وہ زیادہ قابل قبول ہوگی اس وجہ سے بھی ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی حدیث کو حضرت وائل کی حدیث پر ترجیح حاصل ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن زبیر کی حدیث کی اور دوسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ ان سے صرف ایک بات عدم تحریک کی منقول ہے، جب کہ حضرت وایل کی کسی حدیث میں اشارہ کا ذکر ہے اور کسی میں اشارہ کے ساتھ انگلی کے حرکت دینے کا بھی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ فقہاء کا یہ اصول ہے کہ اگر کسی حدیث میں کسی چیز کی نفی ہو اور دوسری حدیث میں میں اسی کا اثبات ہو تو نفی کو اثبات پر مقدم کیا جاتا ہے اس وجہ سے بھی ہے حضرت عبداللہ بن زبیر کی حدیث کو وائل کی حدیث پر مقدم کیا جائے گا۔

چوتھی بات جو بہت اہم ہے کہ اشارہ کے وقت انگلی کو حرکت دینے والی حدیث کے راوی حضرت وائل ہیں کسی اور صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل نقل نہیں کیا ہے، اگر یہ عمل نماز کی سنت ہوتا تو دوسرے صحابہ سے بھی یہ منقول ہوتا۔

پانچویں بات یہ ہے کہ بہت سے صحابہ کرام سے عملا نماز کی تعلیم منقول ہے یعنی انہوں نے اپنے ساتھیوں یا شاگردوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سیکھلانے کے لیے انکو نماز پڑھ کر دکھلائی ہے جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود یا حضرت حمید الساعدی وغیرہ تو ان حضرات میں سے کسی نے بھی نماز اس طرح نہیں پڑھی کہ اس میں تشہد کی حالت میں انگلی ہلانے کا ذکر ہو۔

ان وجوہ کی بنا پر صحیح بات یہ ہے کہ نماز میں تشہد کی حالت میں صرف انگلی سے اشارہ کرنا ہے انگلی کو حرکت دینا نہیں ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے جیسا کہ خود مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب کے کلام میں اوپر گزرا بلکہ بقول مبارکپوری صاحب کے حضرت ترمذی رحمۃ اللہ کے زمانہ تک تمام محدثین کا مذہب بھی یہی تھا کہ وہ تشہد کی حالت میں صرف اشارہ کرتے تھے انگلی کو حرکت دینا ان کا مذہب نہیں تھا صاحب عون المعبود نے بھی اسی کو جمہور کا مذہب قرار دیا ہے۔

اور آپ کو معلوم ہوگا کہ غیر مقلدین کا عام طور پر دستور یہ ہے کہ وہ جمہور کے خلاف مذہب اختیار کرتے ہیں اور اپنی مسجد الگ بناتے ہیں تا کہ انکی انفرادیت کی شان باقی رہے اور لوگ کہیں کہ یہ نئے ڈھنگ کے لوگ ہیں۔

تشہد میں بیٹھنے کی حالت میں شروع التحیات سے لے کر آخر تک انگلی ہلانے کو مذہب بنانا اپنی اسی انفرادیت کی شان کو باقی رکھنے کا غیر مقلدوں کا ایک انداز ہے ورنہ یہ سنت طریقہ ہرگز نہیں ہے، نہ غیر مقلدین کا اس سے پہلے نماز پڑھنے کا یہ طریقہ رہا ہے یہ طریقہ تو آج کے دور کے البانیے اور ابن بازیے جیسے جدید سلفیت زدہ گروہ نے نکالا ہے۔

امید ہے کہ جناب والا کو مسئلہ کی صحیح حقیقت سے اس تحریر سے آگاہی ہوگئی ہوگی میں نے ذرا تفصیلی گفتگو اس لئے کر دی کہ اس بارے میں کئی اور جگہوں سے یہ سوال آیا تھا ان کو میں نے اپنے دوسرے مشاغل کی وجہ سے جواب نہ دے سکا تھا۔

والسلام

محمد ابوبکر غازی پوری

محمد ابوبکر غازی پوری

سترہ حدیث اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ:

مکرمی حضرت مولانا زاد فضلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ارمغان جلد اول نے روح اور دل کو تازہ کردیا۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے احناف کے خلاف سلفیت زدہ ٹولہ کی حقیقت واضح ہوئی زبان ایسی سہل ،طرز استدلال دل میں گھر کر جانے والا حوالے مدلل اور طرز تحریر عالمانہ جس طرح سے دیکھو کتاب خوب سے خوب تر ہے، سنا ہے کہ پاکستان میں بھی یہ کتاب چھپ گئی ہے، فجز اکم اللہ خیراًالجزاء

مولانائے محترم عوام کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے غیر مقلدین حضرت امام اعظم کو قلیل الحدیث بتلاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ انکو صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں براہ کرم آپ اس بارے میں کچھ تحریر فرمادیں۔

فقط والسلام انظر انصاری فیض آبادی درالعلوم دیوبند

زمزم!

یہ محض خدا کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ ارمغان کو اللہ نے بہت مقبولیت دی اور لوگ اس سے فائدے اٹھا رہے ہیں۔

جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو ہمارے غیر مقلدین برادران حضرت امام اعظم سے خاصا تعلق رکھتے ہیں اور ان کی زبانیں حضرت امام اعظم کے خلاف کھلی رہتی ہیں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو یہ شان عطاء کی تھی کہ وہ شروع زمانہ ہی سے محسودیت کے وصف عظیم سے نواز دیئے گئے تھے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا اللھم لا تجعلنی حاسدا و اجعلنی محسو دا

یعنی اے اللہ مجھے حاسد نہ بنا مجھے محسود بنا،

حضرت امام اعظم نے بھی غالبا کسی وقت یہ دعا کی ہوگی جو اللہ کے یہاں مقبول ہوئی اور امام اعظم کے حاسدین کا ایک بہت بڑا طبقہ پیدا ہوا خصوصا وہ لوگ جو امام اعظم کے فقہ کی بلندی سے حیران رہ گئے اور اللہ نے ان کو جس فہم دین کی دولت سے نوازا تھا اس کی گہرائی کا انہیں اندازہ نہ ہوسکا ان حاسدین میں ظاہر پرست محدثین کی ایک بڑی تعداد تھی انہوں نے حضرت امام اعظم کی شان گھٹانے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ایک دنی فطرت ذلیل انسان کرسکتا ہے کچھ محدثین جو اپنی ذات سے تو نیک تھے مگر عقل وشعور کی کمی کی وجہ سے یا حضرت امام اعظم کی بلندی وعظمت اور امت میں ان کی مقبولیت ومحبوبیت نے ان کو چکا چوند کردیا تھا اس وجہ سے وہ بھی انہیں حاسدین کی راگ میں راگ ملانے لگے اور حضرت امام اعظم کی برائیاں کرنا اور انکا عیب گننا ان حضرات کا مشغلہ ہوگیا، ابونعیم اور حمیدی وغیرہ محدثین جو اتفاق سے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ بھی ہوتے ہیں حضرت امام اعظم کے حاسدین اور ان کی برائیاں کرنے والوں میں سے سرفہرست ہیں، نعیم کا حال تو یہ تھا کہ وہ حضرت امام اعظم کی برائیاں بیان کرنے کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے

حدیثیں گڑھا کرتا تھا،حمیدی کو بھی اس کا خاص ذوق تھا،پھر حضرت امام بخاری کی طرف انہیں اساتذہ کا رجحان منتقل ہوا اور انہوں نے اپنی تاریخ میں حضرت امام اعظم کو ضعیف اور متروک قرار دیا ہے۔

جب دور اول کے لوگوں کا یہ حال تھا جو آج کہ زمانہ کے غیر مقلدین جنکو امام اعظم کے نام ہی سے بخار چڑھ جاتا ہے وہ اگر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں گھٹانے کے لیے یہ کہیں کہ امام اعظم کو صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں تو کیا تعجب ہے۔

آج کے سلفی محققین کی تو حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ تحقیق ہے کہ ان کو تعلیم وتربیت جہمیہ ومعتزلہ ومرجیہ کی گود میں ہوئی تھی وہ مذہب جہمیہ ومعتزلہ کے بہت بڑے حمایتی تھے۔ان کی پیدائش بلاد اسلامیہ سے بہت دور خراسان کے شہر نسا کے مضافات میں ہوئی وہ جس شہر کوفہ میں آکر بسے تھے وہ فتنوں کا شہر تھا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوفہ کو فتنوں کی سرزمین کہا تھا(۱) اب اگر اسی طرح کے سلفی شیوخ حدیث اگر یہ کہیں کہ ابو حنیفہ کو جن کو دنیا نے امام اعظم کے لقب سے یاد کیا ہے صرف سترہ احادیث یاد تھیں تو وہ کہہ سکتے ہیں اسلئے کہ مقصود تو حضرت امام اعظم کی حدیث کی تعداد بتلانا نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود حضرت امام اعظم کی برائی کرنا اور شان گھٹانا ہے یہی وجہ ہے کہ سلفیوں کے پیش رو امام ابو حنیفہ کے حاسدین نے کبھی یہ کہا کہ امام ابو حنیفہؒ نے پچاس حدیثیں روایت کی ہیں اور سب میں غلطی کی ہیں،دیکھئے اب وہ سترہ یہاں پچاس ہو گیا اور کبھی ان کے حاسدوں نے کہا کہ امام ابو حنیفہ کی کل روایت ایک سو پچاس تھی اور انہوں نے آدھی حدیثوں میں غلطی کی یعنی پچہتر میں غلطی کی اور پچہتر ٹھیک ٹھاک تھی دیکھئے اب وہ سترہ کی تعداد یہاں ایک سو پچاس ہو گئی اور کبھی امام ابو حنفیہؒ کے کرفرماؤں نے یہ کہا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت امام ابو حنیفہ سے چارسو حدیثیں لکھی ہیں اور انشا اللہ میں عراق جاکر سب کو مٹادونگا،دیکھئے اب وہ پچاس سے بڑھتے بڑھتے چار سو ہو گئی اور وہ بھی ان کا ایک شاگرد بیان

(۱) رئیس احمد ندوی استاذ جامعہ سلفیہ کی نئی کتاب،،دیوبندی پمفلٹ کے تحقیقی جائزہ میں اس کی تفصیل پڑھیے

کرتا ہے کہ اس نے ان سے چارسو حادیثیں لکھی ہیں بقیہ ان کے سیکڑوں شاگردوں کا ذکر ہی کرنے کی ضرورت نہیں ہے،اب یہ تعداد گھٹ کر پھر پیچھے کی طرف آتی ہے تو امام ابو حنیفہؒ کے دوستوں نے کہا کہ عبدالرزاق نے ان سے بیس حدیثیں لکھی تھیں۔ان کا مقصد محض اپنے شیوخ کی تعداد کو زیادہ کرنا تھا ورنہ عبدالرزاق کے نزدیک امام صاحب اس لائق نہیں تھے کہ وہ ان سے حدیثیں روایت کرتے (۱)

غرضیکہ امام ابو حنیفہؒ کے دوستوں کو ان کی حدیثیں تعداد کی قلت وکثرت سے مطلب نہیں ہے۔ان کو بس اس سے غرض ہے کہ کس بات سے امام کی شان کو بٹہ لگتا ہے اس وجہ سے ایک ہی کتاب میں ان کے بارے میں متضاد قسم کی باتیں ہوتی ہیں جیسا کہ حدیث کی تعداد کے سلسلہ میں آپ نے دیکھا اور اس قسم کی بے تکی اور بے اصل باتیں موجودہ دور کے سلفیوں اور غیر مقلدوں کا وہ علمی سرمایہ ہے جس کے بل بوتے پر وہ امام اعظم کی عظمت سے اپنا سر ٹکراتے ہیں۔

عجیب لطف کی بات ہے کہ جس امام کی فقہ سارے عالم میں پھیلی جو فقہائے مجتہدین میں سے پہلے نمبر کا مجتہد شمار ہوا اس کا علمی سرمایہ صرف سترہ حدیثیں بتلایا جائے کیا صرف سترہ احادیث سے حضرت امام اعظم نے ہزار ہاہزار مسائل کا استخراج کیا تھا،صرف امام

مالک کے پاس حضرت امام اعظم کے ساٹھ ہزار مسائل تھے علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

(۱) خطیب بغدادی کی تاریخ جلد تیرہ کے صفحات ۴۱۶، ۴۱۶، ۴۲۰، ۴۵۰، ۴۱۴، ۴۴۲۔ ۴۱۸۔ ۴۴۸۔ میں یہ تماشے آپ کو نظر آئیں گے

کا ن عنده من مسائل ابی حنیفة فقط ستین الف مسائلة کما رواه الطحاوی بسنده عن عبدالعزیز الدراوردی ونقله مسعود بن شیبة فی کتاب التعلیم ص ۵۴ ا تانیب الخطیب

یعنی حضرت امام مالک کے پاس صرف امام اعظم کے ساٹھ ہزار مسائل تھے جیسا کہ حضرت امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے عبدالعزیز الدرراوردی سے روایت کیا ہے اس کا ذکر مسعود بن شیبہ کی،، التعلیم،، کتاب میں ہے۔

آپ اندازہ لگائیں کہ کیا ان ساٹھ ہزار مسائل کی بنیاد محض قیاس اور رائے پر تھی یا کتاب وسنت کی نصوص کی روشنی میں بھی یہ مسائل تھے کیا امام مالک کے بارے میں یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ مسائل کی اتنی بڑی تعداد جن کی بنیاد کتاب وسنت پر نہ ہو اپنے پاس رکھیں گے۔ جس نے صرف امام ابو یوسف اور امام محمد کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا اسے خوب معلوم ہوگا کہ امام ابوحنیفہؒ کا حدیث میں کیا مقام تھا، ان دونوں شاگردوں نے اپنی کتابوں میں حضرت امام اعظم کی سیکڑوں حدیثیں ذکر کی ہیں۔ آپ فقہ حنفی کی کتابوں کو پڑھیں اور پھر ان کا موازنہ ومقابلہ احادیث رسول ﷺ سے کریں تو آپ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ ہوگی کہ امام اعظم کے حاسدوں نے ان کو قلیل الحدیث ہونے کا طعنہ دے کر اپنی عاقبت کس بری طرح خراب کی ہے۔

فقہ حنفی کے بیشتر مسائل کتاب وسنت اور آثار صحابہ کی روشنی میں ہیں تو اگر احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا علم امام ابوحنیفہؒ کو نہ ہوتا یہ ان کے مسائل اور احادیث رسول سے اتنی موافقت کیسے رکھتے، تو چاہے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ حدیث کا نام نہ لیں مگر ان کے فقہی مسائل کی بنیاد قرآن وحدیث ہی پر ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب کہ حضرت امام اعظمؒ کو ان احادیث کا علم ہو ورنہ پھر یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت امام اعظمؒ کا مزاج مزاج نبوت مزاج شریعت سے اتنا ہم آہنگ کیا تھا کہ ان کی زبان سے نکلی ہوئی بات کتاب وسنت کے خلاف ہوتی ہی نہیں تھی یعنی ان کو حدیث کا علم نہیں تھا مگر خدا نے ان کا ذہن ایسا صالح بنایا تھا کہ وہ خلاف حدیث سوچ ہی نہیں سکتا تھا، اگر غیر مقلدین اسی پر راضی ہو جائیں تو ہم ان کی رعایت میں امام اعظم کو قلیل الحدیث تسلیم کرلیں گے مگر یہ امام اعظم کا اتنا بڑا شرف ہوگا کہ اس کے تصور ہی سے غیر مقلدین کی نیند حرام ہو جائے گی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ غیر مقلدین اور امام اعظم کے حاسدوں کا امام اعظم کے خلاف پروپیگنڈہ ہے کہ ان کو حدیث کا علم کم تھا یا ان کو صرف سترہ احادیثیں یاد تھیں امام حافظ حدیث تھے جیسا کہ حافظ ذہبی نے ان کو ترجمہ اپنی مایہ ناز کتاب تذکرۃ الحفاظ میں ذکر کے ثابت کیا ہے اس لیے کہ اس کتاب میں صرف انہیں محدثین کا انہوں نے تذکرہ کیا ہے جن کا حدیث میں پایہ بہت بلند تھا اور جن کو حافظ حدیث کہا جاسکتا تھا۔ اور حدیث کے بارے میں جو ہر طرح سے حجت تھے جس کا سرمایہ صرف سترہ حدیث ہو اسکو حافظ حدیث نہیں کہا جاتا ہے

۔حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی احادیث کو جب ان کی اور ان کے شاگردوں کی اور دوسرے محدثین کی کتابوں سے جمع کیا گیا تو ان کی تعداد سترہ سندوں تک پہنچی جس میں سے پندرہ مسانید کا ذکر تو صاحب کشف الظنون نے کیا ہے(۱)

ابن خلدون نے امام ابوحنیفہؒ کو اپنے مقدمہ میں علم حدیث کے کبار مجتہدین میں سے شمار

(۱) دیکھوں مقدمہ تحفۃ الاحوذی از مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری ترجمہ امام اعظم

کیا ہے اور ابن خلدون ہی فرماتے ہیں کہ حضرت امام اعظم کی حدیث کے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کے بارے شرطیں سخت تھیں اس وجہ سے ان سے روایت زیادہ نہ ہوسکی اور روایت زیادہ نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کو احادیث کا علم بھی نہیں تھا، جامع بیان العلم میں حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ یحیی بن معین فرماتے ہیں کہ میں نے کسی محدث کو ایسا نہیں پایا کہ اس کو امام وکیع پر مقدم کروں اور امام وکیع حضرت امام اعظم کے مذہب پر فتویٰ دیتے تھے، وکان یحفظ حدیثه کله اور انکی ساری احادیث کے حافظ تھے، وکا ن قد سمع من ابی حنیفةؒ حدیثا کثیر ا .

اور انہوں نے حضرت امام ابوحنیفہؒ سے بہت سی حدیثیں سنی تھیں کیا ایسے ہی شخص کو سترہ حدیثوں والا کہا جائے گا غور فرمائیں کہ امام وکیع جیسا حدیث کا ماہر تو فرمائے کہ امام ابوحنیفہ کثیر الحدیث تھے اور خود انہوں نے امام ابوحنیفہؒ سے بہت سی حدیثوں کا سماع کیا تھا اور غیر مقلدین فرمائیں کہ امام اعظم کو صرف سترہ احادیث یاد تھیں اس بات میں کہاں تک سچائی ہے، حضرت یحی بن معین ہی فرماتے ہیں کہ قد حدث عنہ قوم صالحون، یعنی امام اعظم سے محدثین کی ایک صالح جماعت نے حدیثیں روایت کی تھیں۔

اور امام بخاری کے استاذ حضرت ابن مدینی فرماتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے روایت کرنے والوں میں امام سفیان ثوری حضرت عبداللہ بن مبارک حماد بن زید ہیثم وکیع بن جراح عباد بن عوام اور حضرت جعفر بن عون جیسے ائمہ حدیث ہیں اور امام ابوحنیفہ ثقہ محدث تھے۔ (جامع بیان العلم ص ۴۳۲)

کیا ایسے ہی شخص کو قلیل الحدیث اور سترہ حدیث والا کہا جائے گا جس سے روایت کرنے والے اور جس کے شاگرد ایسے ایسے کبار محدثین ہوں یہ وہ محدثین کرام ہیں جن کی احادیث سے بخاری و مسلم بھری ہیں ذرا امام ابوحنیفہؒ کے ان شاگردوں کا کتب رجال میں کوئی تذکرہ پڑھے تو سمجھ میں آئے گا کہ امام اعظم کا حدیث میں کیا مقام تھا، آپ اندازہ لگائیں کہ امام اعظم کے حاسدین نے کیسا جھوٹ گڑھا ہے کہ ابوحنیفہؒ کو صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں ابن لقطہ مشہور محدث ہیں ان کی رجال حدیث میں ایک کتاب ہے جس کا نام کتاب التقیید ہے اس میں انہوں نے جن کتابوں کے رواۃ کا ترجمہ ذکر کیا ہے ان میں ایک کتاب مسند ابی حنیفہؒ بھی ہے ص ۲ ابن لقطہ کا انتقال ۶۲۹ھ میں ہوا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان کے زمانہ میں مسند ابی حنیفہ کا چرچا تھا اور وہ احادیث کا اہم ماخذ سمجھا جاتا تھا تبھی ابن لقطہ مسند ابی حنیفہؒ کے راویوں کا بھی بخاری و مسلم اور احادیث کی دوسری کتابوں کے رواۃ کے ساتھ اہتمام سے ذکر کیا ہے محمد بن المظفر بن موسی ابوالحسین البغدادی حافظ حدیث اور بڑی شان کے محدث تھے ان کا سن وفات ۳۷۹ ہجری ہے ان کے ترجمہ میں ابن لقطہ لکھتے ہیں

وجمع مسند ابی حنیفه (کتاب التقیید ج ا ص ۱۱۳)

یعنی انہوں نے بھی مسند ابی حنیفہؒ کو جمع کیا تھا، قدمائے محدثین تو امام ابو حنیفہؒ کی احادیث مسند کی شکل میں تالیف کریں جس سے امام ابو حنیفہؒ کا کثیر الحدیث ہونا بالکل واضح ہے، لیکن غیر مقلدین محققین کو امام ابو حنیفہؒ احادیث میں کم مایہ نظر آتے ہیں کچھ ٹھکانہ ہے اس تعصب اور جہالت کا۔

ایک بات یاد رکھیں کہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی شان گھٹانے اور ان کی برائی کرنے کے لیے عام طور پر دشمنان ابو حنفیہؒ کا سب سے بڑا سہارا اور ان کا سب سے مستند ذریعہ خطیب بغدادی کی تاریخ کی تیرہویں جلد ہے مگر حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں تاریخ بغدادی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اس وجہ سے کہ بغدادی جس شخص کا نام ہے وہ امام ابو حنیفہ کا سب سے بڑا دشمن گزرا ہے، اس نے اپنی کتاب میں جعلی موضوع من گھڑت رواتیوں کا ایک انبار جمع کیا ہے انہیں جھوٹی رواتیوں پر امام ابو حنیفہؒ رحمۃ اللہ علیہ کی برائی کرنے والے عام طور پر اعتماد کرتے ہیں حافظ ابن حجر الخیرات الحسان میں فرماتے ہیں

ان الاسانید التی ذکرها للقدح لایخلو غالبها من متکلم فیه او مجهول ولایجوز اجماعاً عرض مسلم بمثل ذالک فکیف بامام من ائمة المسلمین

یعنی خطیب بغدادی نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی برائی بیان کرنے کے لیے جن رواتیوں کو ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر کا حال یہ ہے کہ اس کے رواۃ یا مجروح ہیں یا مجہول ہیں اور یہ بات اجماعی ہے کہ کسی عام مسلمان کی بھی اس طرح کی رواتیوں سے برائی بیان کرنا جائز نہیں ہے چہ جائیکہ ائمہ مسلمین میں سے کسی کی ان روایتوں کو بنیاد بنا کر کے برائی بیان کی جائے۔

حافظ سیوطی فرماتے ھیں لا تغیر بکلام الخطیب فان عنده العصبية الزائدة

کہ اے مخاطب تو خطیب کے کلام سے دھوکا مت کھا اس کے اندر بہت زیادہ تعصب تھا (۱)

اور میزان کبریٰ میں امام حضرت امام شعرانی فرماتے ہیں۔

ولا عبرة بکلام بعض المتعصبين فی حق الامام ولا بقولهم انه من جمعة اهل الرای بل کلام من يطعن فی هذا الامام عندا لمحققين يشبه الهذايانات

(۱) یعنی بعض متعصبین نے جو امام ابو حنیفہؒ رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں بدگوئی کی ہے اس

---

(۱) تبعیض الصحیفۃ للسیوطی ص ۵۵

کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور نہ ہی درست ہے کہ امام صاحب پابند رائے تھے بلکہ ان کی بات جو امام کے حق میں طعنہ کرے محققین کے نزدیک بکواس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے۔

غرض حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ پر اللہ کا شروع ہی سے یہ فضل عظیم تھا کہ اس نے ان کے حاسدین کی ایک جماعت پیدا کردی

تھی جن کا مقصد یہی تھا کہ وہ امام اعظم کی شان میں جھوٹی سچی باتیں سند کے ساتھ بیان کریں تا کہ امام اعظم نے تدوین فقہ کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا تھا اس کی حقیقت کو کم کر سکیں مگر اللہ نے ان حاسدوں کو سخت خیبتہ وخسران کا مزہ چکھایا اور امام اعظم کی فقہ خود انہیں کے زمانہ میں اقطار ارض میں پھیل گئی اور اس وقت سے لے کر آج تک امت کا دو تہائی حصہ انہیں کے فقہ کے واسطہ سے شریعت پر عمل پیرا ہے۔

سترہ حدیث والی بات بھی انہیں حاسدوں کے حسد کا شاخسانہ ہے اس پر توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

محمد ابوبکر غازی پوری

خط اوراس کا جواب

حضرت امام ابوحنیفہ پر محدثین کی جرحوں کی حقیقت

محترم حضرت مولانا غازی پوری صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

زمزم کا شمارہ نمبر ٦ ج ٨ پہنچا حضرت امام اعظم کے بارے میں غیر مقلدین کا نقطہ نظر آپ کی کتابوں اور زمزم کے شماروں سے پہلے سے معلوم تھا مگر یہ شمارہ بطور خاص نظر کشا ہوا، صاحب کتاب کے بارے میں پہلے سے معلوم ہے خاص طور پر آپ کی کتاب صحابہ کرام کے بارے میں غیر مقلدین کا نقطہ نظر پڑھنے کے بعد صحابہ کرام کے بارے میں رئیس احمد ندوی کے گندے خیالات ہمارے علم میں ہیں جب یہ صاحب صحابہ کرام کو نہیں بخشتے ہیں تو امام ابوحنیفہؒ کی شان میں اگر یہ اپنی زبان تیز کریں اور بیہودہ کلمات بکیں تو تعجب کیا ہے۔

براہ کرم آپ وضاحت فرمائیں کہ رئیس احمد ندوی یا ان جیسے دوسرے غیر مقلدین اصحاب قلم حضرت امام ابوحنیفہ کی شان میں بکواس کرنے کے لئے جن کتابوں کا سہارا لیتے ہیں ان کتابوں کی حقیقت کیا ہے، کیا اس کے مصنفین قابل اعتبار لوگ ہیں؟

امید ہے کہ آپ اس جانب توجہ فرما کر احسان فرمائیں گے واقعہ یہ ہے کہ آپ کی تحریروں نے ہمیں سلفیت کی حقیقت سے بہت کچھ واقف کرادیا ہے   والسلام

(بندہ نیاز مند محمد ارشد قاسمی سنت کبیر نگر۔ یوپی)

زمزم!

پہلے تو یہ معلوم کریں کہ امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں جن سے جرحیں منقول ہیں ان جرحوں کا منشا کیا ہے تو اس کی حقیقت کو حافظ ابن عبدالبر مالکی نے جامع بیان العلم میں بایں الفاظ واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ونقموا ایضاً علی ابی حنیفه الارجاء ومن اهل العلم من ینسب الی الارجاء کثیر لم یعن احدبنقل قبیح ماقیل فیه کماعنوابذلک فی ابی حنیفة الامامته وکان ایضامع هذا یحسد وینسب الیه مالیس فیه ،ویختلق علیه مالایلیق به وقد اثنی علیه جماعة من العلماء وفضلوه .(ص ٤٣١ جامع بیان العلم طبع دارالکتب العلمیه)

امام ابوحنیفہ پر لوگوں نے ارجاء کی وجہ سے بھی جرح کیا ہے حالانکہ ارجاء کے قائلین بہت سے اہل علم رہے ہیں، لیکن جتنی بری باتیں امام ابوحنیفہ کے بارے میں کہی گئی ہیں وہ کسی اور کے بارے میں نہیں کہی گئی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ (اللہ نے ان کو) امت کا پیشوا اور امام بنایا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ لوگ ان پر حسد بھی کرتے تھے اور ان کی طرف وہ باتیں منسوب کرتے تھے جن سے ان کا دامن

پاک تھا اور جوان کے مقام علم وفضل سے گری ہوئی تھیں حضرت امام ابوحنیفہ کی تعریف علماء کی ایک بڑی جماعت نے کی ہے اور ان کو دوسرے اہل علم پر فضیلت دی ہے۔

حافظ ابن عبدالبر مزید فرماتے ہیں:

الذین رووا عن ابی حنیفة و اثنو اعلیه اکثر من الذین تکلموا فیه (ایضاً ص ۴۳۲)

یعنی حضرت امام ابوحنیفہ سے جن محدثین نے روایت کیا ہے ان کی تعداد ان لوگوں سے زیادہ ہے جنھوں نے ان پر جرح کی ہے۔

پھر فرماتے ہیں:

و کان یقال یستدل علی نباهة الرجل من الماضین بتباین الناس فیه (ایضاً ص ۴۳۴)

یعنی کہا یہ جاتا رہا ہے کہ اسلاف میں سے کسی کے بارے میں لوگوں کی رایوں کا الگ الگ ہونا اس آدمی کے بلند مرتبہ ہونے کی دلیل ہے۔

یعنی جن کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے اس کی طرف لوگوں کی نگاہ نہیں اٹھتی ہے۔ نگاہ اس کی طرف اٹھتی ہے جو با حیثیت اور عظیم القدر شخص ہوتا ہے اور جس کا مقام جتنا بلند ہوتا ہے اس کے حاسدین بھی اسی قدر ہوتے ہیں چونکہ وہ اس کے مقام بلند کو پا نہیں سکتے ہیں اس وجہ سے اس کی برائیاں کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں، آپ نے سنا ہوگا شجر ثمر دار پر پتھر زیادہ پڑتے ہیں خالی درخت پر کوئی پتھر نہیں مارتا ہے۔

حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کی بات سے آپ نے اندازہ لگالیا کہ عیب حضرت امام اعظم میں کوئی نہیں تھا جس کی بنا پر ان پر جرح کی جائے، عیب ان میں تھا جنھوں نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کو اپنی جرحوں کا نشانہ بنایا ہے اور وہ عیب حسد کا تھا۔ اور آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ وہ خطرناک اخلاقی بیماری ہے جس سے آدمی کا شفا پانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ حاسد اپنے محسود کے بارے میں ہر گھناؤنی حرکت کو آزماتا ہے حتیٰ کہ وہ اس کے خلاف باتیں گڑھتا بھی ہے اور جھوٹی تہمتوں کے لگانے میں اس کو شرم نہیں آتی ہے، مگر ذلیل وخوار حاسد ہی ہوتا ہے محسود کا درجہ دن بدن بلند ہوتا رہتا ہے۔ حضرات امام اعظم کا معاملہ بھی یہی رہا، کم ظرفوں نے حسد تو بہت کیا ان کے خلاف عوام میں بدظنی پیدا کرنے کے لئے جو کچھ ان کے بس میں تھا سب کچھ کیا، خوب خوب روایتیں گڑھیں، جھوٹ کا انبار لگایا مگر امام اعظم کی عزت ورفعت اور امامت فی الدین اور مقبولیت عند اللہ کا ستارا ہر روز بلند ہی ہوتا رہا، اور آج دنیا کا دو تہائی حصہ انہیں کے فقہ کا پابند ہے اور انہیں کی تقلید کرتا ہے

ہر بوالہوس کے واسطے دار ورسن کہاں

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

اور حاسدین اور جھوٹوں کا انجام کیا ہو؟ تو آج ان میں اکثر کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں کتابوں میں بس ان کا ذکر رہ گیا ہے، اور بعضوں کا انجام تو ایسا بھیانک ہوا کہ الامان والحفیظ، انہیں میں سے ایک صاحب نعیم بن حماد ہیں جو خیر سے حضرت امام بخاری کے استاذ بھی

ہیں، یہ صاحب امام ابوحنیفہ کے پکے دشمن تھے اور ان کی ثقاہت اور امانت کا حال یہ تھا کہ یہ حضرت امام اعظم کی شان میں بدگوئی کے لئے روایتیں گڑھا کرتے تھے، امام اعظم کے خلاف جن محدثین نے حد درجہ گرے اخلاق کا ثبوت دیا ہے ان میں نعیم بن حماد کا نام سرفہرست ہے اس شخص کا حال بیان کرتے ہوئے حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

كان يضع الحديث في تقوية السنة وحكايات مزورة في ثلب نعمان كلها كذب . (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۶۳)

یعنی نعیم بن حماد سنت کو تقویت دینے میں حدیثیں گڑھا کرتا تھا اسی طرح امام ابوحنیفہ کی بدگوئی کے لئے افسانے تیار کرتا تھا جو سب کا سب جھوٹ ہوتے۔

تعجب ہے کہ ایسے وضاع اور مزور اور کاذب کی روایتوں کو حضرت امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں درج کیا ہے اور اس سے روایتیں لی ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ امام بخاری نے دوسروں کی حدیثوں کے ساتھ ملا کر اس کی روایتیں نقل کی ہیں، بلاشبہ بخاری نے ایسا ہی کیا ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا ایسا وضاع کذاب شخص اس لائق بھی تھا کہ اسکی روایتیں دوسروں کی روایتوں کو ملا کر ہی لی جائیں؟ امام ابوحنیفہ پر اس کا کذب وافترا تو یہ کہہ کر گوارہ کر لیا جاسکتا ہے کہ اس شخص کو امام سے دشمنی تھی اور یہ اس کے لئے جو کرتا تھا سو کرتا تھا مگر اللہ کے رسول ﷺ کی سنت اس شخص کی محتاج تھی کہ وہ ان کو قوی بتلانے کے لئے احادیث گڑھنے کا گھناؤنا فعل انجام دے اور آپ ﷺ کی ذات مبارک کی طرف ان باتوں کو منسوب کرے جو آپ ﷺ کی زبان پاک سے ادا نہ ہوئی تھیں۔

خیر میں عرض یہ کر رہا تھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ جن لوگوں نے حسد وعداوت کا معاملہ کیا اور ان کی شان میں بٹہ لگانے کی کوشش کی ان میں سے بعض کا انجام بہت برا ہوا انہیں میں یہ نعیم بن حماد بھی تھا، لوگوں نے لکھا ہے کہ حکومت وقت نے اس کو گرفتار کیا اور اس کو رسی میں جکڑ کر کھینچا گیا اور ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا اور اس طرح اس کو زندہ دفن کر دیا گیا۔

ولم يكفن ولم يصل عليه (دیکھو تاریخ خطیب ج ۱۳ ص ۳۱۴)

نہ اس کو کفن نصیب ہوا اور نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔

نعیم بن حماد کا حوالہ امام ابوحنیفہ کی بدگوئی کرنے والے بہت دیتے ہیں، اور نعیم ہی کے حوالہ سے امام بخاری نے بھی حضرت امام ابوحنیفہ کے بارے میں یہ شاندار روایت ذکر کی ہے امام بخاری ابونعیم کے حوالہ سے اپنی کتاب تاریخ صغیر میں لکھتے ہیں

حدثنا نعيم بن حماد قال حدثنا الفزاری قال كنت عندسفيان فنعى النعمان فقال الحمدلله كان ينقض الاسلام عروة عروة ماولدفي الاسلام اشأم منه

(ص ۱۷۱ مطبوعہ لاہور)

یعنی بیان کیا ہم سے نعیم بن حماد نے اس نے کہا کہ بیان کیا ہم سے فزاری نے، اس نے کہا کہ میں امام سفیان کے پاس بیٹھا تھا کہ ان کے پاس ابوحنیفہ کے وفات کی خبر آئی تو انہوں نے کہا اللہ کا شکر ہے یہ شخص اسلام کو گھنڈی گھنڈی کر کے توڑتا تھا اسلام میں اس سے

بڑا بد بخت کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔

تعجب ہے امام بخاریؒ پر انہوں نے اس گندی اور بالکل ظاہر الکذب روایت کو جس کا گڑھا ہونا بالکل واضح ہے کیسے روایت کیا، کیا ان کو معلوم نہیں تھا کہ ان کا یہ استاذ کس کردار اور کس صفت کا آدمی ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ ایک جلیل القدر محدث ہیں سب کو معلوم ہے کہ عام فقہی اعتقادی مسائل میں عموماً وہ حضرت امام ابوحنیفہ کی موافقت کرتے ہیں، ان کے بارے میں اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مسلمان چہ جائیکہ امام اعظم جیسے جلیل القدر فقیہ کی وفات سن کر اناللہ پڑھنے کے بجائے اپنی زبان سے ایسے گندے الفاظ نکالیں گے جس کا تصور ایک عام مسلمان سے بھی نہیں کیا جا سکتا، چونکہ یہ بات امام بخاری نے نقل کی ہے اس وجہ سے امام ابوحنیفہ کے دشمنوں کو امام کے خلاف بکواس کرنے کے لئے اور اپنا بغض ظاہر کرنے کے لئے ایک بڑا ہتھیار مل گیا، مگر اس سے امام اعظم کا تو کچھ نہیں بگڑا بلکہ امام بخاری ہی کو تنقید کا نشانہ بننا پڑا، اس روایت کو نقل کر کے مشہور غیر مقلد عالم مولانا ابراہیم سیالکوٹی فرماتے ہیں کہ نعیم کے متعلق نقاد ائمہ حدیث میں سخت اختلاف ہے، بعض کی رائیں اچھی ہیں اور بعض کی بہت سخت ہیں۔

پھر فرماتے ہیں:

عباس بن مصعب نے اپنی تاریخ میں کہا ہے کہ نعیم بن حماد نے حنفیوں کے رد میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

یعنی نعیم بن حماد کا ایک دلچسپ مشغلہ یہی تھا کہ وہ احناف کے خلاف کتابیں لکھا کرے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ان کتابوں میں آنحضورﷺ کی طرف منسوب کر کے بے اصل روایتیں نقل کرتا تھا یعنی بے شرمی و بے دینی کی انتہا پر یہ شخص تھا کہ آنحضورﷺ کی طرف بے دھڑک جھوٹ حدیث منسوب کرتا تھا حضرت امام یحیٰ بن معین فرماتے ہیں کہ میں اس ابونعیم کے حال سے خوب واقف ہوں، پھر نعیم کی اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں جس میں اس نے رائے وقیاس کی مذمت میں ایک حدیث گڑھ کر آنحضورﷺ کی طرف منسوب کی ہے لیس لہ اصل یعنی یہ حدیث بالکل بے اصل ہے۔

یہ سب کہہ کر حافظ ابراہیم سیالکوٹی صاحب فرماتے ہیں:

اس روایت کو نعیم کی کتب در بارہ تردید حنفیہ کے ساتھ ملا کر غور کیا جائے تو صاف کھل جاتا ہے کہ نعیم کی مخالفت بناپر تحقیقات نہیں ہے بلکہ بے اصل روایات کی بنا پر ہے۔

اور اس کے بعد حافظ ذہبی کی میزان سے انہوں نے بھی یہ نقل کیا ہے کہ نعیم سنت کی تقویت میں حدیث بنالیا کرتا تھا اور جھوٹی حکایتیں بھی امام ابوحنیفہ کی عیب گوئی میں جو سب کی سب جھوٹ ہیں۔ میزان ج ۲ص ۵۳۶ (تاریخ اہلحدیث ص ۶۲)

پھر حافظ صاحب نعیم کے بارے میں امام نسائی کی یہ جرح نقل کرتے ہیں نعیم ضعیف لیس بثقة یعنی نعیم ضعیف ھے ثقه نهیں ۔لیس بحجة وہ حجت نہیں ہے پھر فرماتے ہیں کہ ابن حبان نے اس کو ثقات میں لکھا ہے لیکن یہ بھی کہا ہے کہ وہ غلطی بھی کرتا تھا اور وہم بھی۔ امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ نعیم بن حماد کی بیس احادیث ایسی ہیں جن کا کوئی اصل نہیں۔

پھر فرماتے ہیں:

کہ خلاصۃ الکلام یہ کہ نعیم کی شخصیت ایسی نہیں ہے کہ اس کی روایت کی بناپر حضرت امام ابوحنیفہ جیسے بزرگ امام کے حق میں بدگوئی کریں۔(۶۴)

حضرت امام ابوحنیفہ کے حاسدین اور ان سے عداوت ودشمنی رکھنے والے آپ کی بدگوئی کے لئے اسی طرح کی روایتوں کا سہارا لیتے ہیں۔

خیر یہ تو امام بخاری کے استاذ ابونعیم کا حال تھا،نعیم نے اس روایت کوفزاری سے نقل کیا ہے ۔یہ فزاری کون بزرگ ہیں تو ،دکتورمحمودالطحان(۱)

(۱)استاذالحدیث الجامعہ محمد بن سعودالاسلامیہ بالریاض

اپنی کتاب الحافظ الخطیب البغدادی واثرہ فی علوم الحدیث میں فرماتے ہیں۔

والفزاری هذا یطلق لسانه فی ابی حنیفة کثیر اویعادیه فی جمیع المجالس ویتقرب الی الخلفاء بدمه ؟......ونسبته الی القول بالخروج علی الخلفاء العباسیین وسبب ذلک علی ماقیل ان اباحنیفة کان افتی اخاه الفزاری بمؤازرة ابراهیم بن عبدالله الطالبی الذی خرج بالبصرة علی ابی جعفر المنصور فقتل اخوه فی الحرب مع ابراهیم فطار صوابه حزنا علی مقتل اخیه واعتبر اباحنیفة وهو السبب فی قتله فاطلق لسانه بجهل عظیم علی شیخه ابی حنیفه کماهو مذکورفی مقدمة الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم(ص ۳۲۸)

یعنی فزاری حضرت امام ابوحنیفہ کی شان میں بہت زیادہ زبان چلاتا تھااور اپنی تمام مجلسوں میں ان سے عداوت کامعاملہ کرتا تھااور خلفاءعباسیین کے دربار میں ان کوقتل کرانے کے درپے رہا کرتا تھااس طرح وہ ان کاتقرب حاصل کرنا چاہتا تھاوہ ان سے یہ کہتا تھا کہ امام ابوحنیفہ خلفاءعباسیین کے خلاف بغاوت بھڑ کاتے ہیں،اوراس کا سبب جیسا کہ کہا جاتا ہے یہ تھا کہ حضرت امام ابوحنیفہ نے اس کے بھائی کو فتوٰی دیا تھا کہ جعفر منصور کے خلاف ابراہیم بن عبداللہ الطالبی کی جنگ میں مدد کرے،چنانچہ اس کا بھائی اس جنگ میں قتل ہواتو اس فزاری کی عقل بھائی کے غم میں جاتی رہی وہ سمجھتا تھا کہ ابوحنیفہ اس کے بھائی کے قتل ہونے کا سبب بنے ہیں تو اس نے اپنے شیخ امام ابوحنیفہ کے خلاف نہایت جاہلانہ طریقہ پرزبان کوبے لگام کردیا یہ سارہ قصہ ابن حاتم کی کتاب جرح وتعدیل کے مقدمہ میں مذکور ہے۔

ابواسحاق فزاری کا حال یہ ہوگیا تھا کہ بقول دکتورمحمد بن الطحان:

فقد وصل الامربالفزاری ان یستعین بالائمه لیطعن فی ابی حنیفة فینسب الیهم القول ثم یکمله من عنده

یہ شخص ائمہ حدیث کے نام کوامام ابوحنفیہ پرجرح کا ذریعہ بناتا اوران کی طرف کچھ باتیں منسوب کرکے اپنی طرف سے ان گڑھی حکایتوں اور قصوں کی تکمیل کرتا تھا(ص ۳۳۱)

غرض ابواسحاق فزاری پر اپنے بھائی کے قتل کئے جانے کا غم ایسا سوار ہوا کہ وہ امام ابوحنیفہ کا پکا دشمن ہوگیا اور اس نے ائمہ حدیث کے نام پر خوب خوب حکایتیں گڑھیں اور ان کو رواج دیا، جن کو امام ابوحنیفہ سے ذرا بھی کدر ہی انہوں نے ان جھوٹی روایتوں اور حکایتوں کو، مزا لے لے کر اپنی کتابوں میں درج کیا، حضرت امام بخاریؒ کا معاملہ بھی یہی تھا کہ ان کا ذہن حضرت امام ابوحنیفہ کی طرف سے کسی وجہ سے صاف نہیں تھا۔ جس کی شہادت خود ان کی کتاب صحیح بخاری میں بھی موجود ہے جس سے ہر صاحب علم واقف ہے، سیرۃ امام بخاری کے غیر مقلد مصنف مولانا عبدالسلام مبارکپوری فرماتے ہیں۔

انہوں نے (یعنی امام بخاری نے) صحیح بخاری میں اہل الرائے پر جس طرح تعریضات کی ہیں مخفی نہیں (ص ۹۶)

اس وجہ سے انہوں نے بھی حضرت امام ابوحنیفہ کے بارے میں فزاری اور ابونعیم جیسے افاک وکذاب کی گڑھی روایتوں پر اعتبار کرلیا اور امام ابوحنیفہ کی شان میں اپنے مقام ومرتبہ سے ہٹ کر بالکل خلاف عقل باتوں کو بھی قبول کرلیا، صحیح سندوں سے امام ابوحنیفہ کی شان میں حضرت سفیان کی جو باتیں ہیں بخاری نے ان سے صرف نظر کیا اور امام ابوحنیفہ کے بارے میں منحوس ہونے کی بات ابونعیم اور فزاری جیسے لوگوں پر اعتبار کرکے اپنی کتاب میں درج کردی، حضرت امام بخاریؒ تو فن حدیث کے امام تھے احادیث کا خزانہ ان کے ذہن میں تھا ان کے بعض غالی معتقدین تو ان کے بارے میں اس طرح کی باتیں نہایت شوق وذوق سے لکھتے ہیں کہ

ایک روز امام بخاری نے رات میں احادیث شمار کرنی شروع کی تو دولاکھ حدیثوں کو شمار کیا جو انہوں نے مختلف تصانیف میں داخل کی تھیں (۱)

(۱) غیر مقلدین اس طرح کی مبالغہ آرائیوں کو امام بخاری کی تعریف میں مزہ لے لے کر بیان کرتے ہیں مگر امام ابوحنیفہ کا عشاء کے وضو سے تہجد کی نماز پڑھنے کا واقعہ انکے سر میں درد پیدا کرتا ہے آپ غور فرمائیں امام بخاری ایک رات میں دولاکھ حدیث شمار کرتے ہیں اور صرف نماز کے بارے میں وہ دس ہزار حدیثیں ایک مجلس میں بیان کرسکتے تھے کیا یہ بات عقل میں آنے والی ہے اور کمال یہ ہے کہ جو امام بخاری ایسے تھے کہ ایک مجلس میں دس ہزار صرف نماز کے بارے میں روایت کرسکتے تھے ان کو قرأت خلف الامام کے سلسلہ کی نہ آمین بالجہر کے سلسلہ کی ایک صریح روایت نہیں مل سکی جس کو وہ اپنی صحیح بخاری میں درج کرسکیں، اور سینہ پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے والی کا تو امام بخاری کی صحیح میں کہیں نشان بھی نہیں ملتا، نہ ایک ہاتھ سے مصافحہ نہ تین طلاق کے ایک ہونے کا نہ تراویح کی آٹھ رکعتوں کا، حالانکہ یہی وہ مسائل ہیں جن پر آج کے غیر مقلدوں کا سارا زور صرف ہوتا ہے

اور فرمایا کہ اگر مجھ سے کہا جائے تو میں ابھی بیٹھ کر صرف ایک نماز سے متعلق دس ہزار حدیثیں روایت کرسکتا ہوں۔ (سیرۃ امام بخاری از مبارکپوری ص ۹۲)

ایسے جلیل القدر امام حدیث کو یہ کیسے نہیں معلوم ہوسکا کہ اسلام میں شوم اور نحوست کوئی چیز نہیں ہے، اور اگر ہے بھی تو صرف تین

چیزوں میں ہے حضرت امام بخاری کی نگاہ سے اللہ کے رسول ﷺ کے یہ ارشادات کیوں اوجھل رہے۔

حقیقت میں بات وہی ہے جس کو اہل بصیرت نے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ پر جرح کرنے والے دوہی طرح کے لوگ تھے، یاتو حاسد تھے، یا جاہل تھے، حضرت امام بخاریؒ کا علمی مقام تو مسلم ہے، مگر حسد وہ مرض ہے کہ اس سے وہی محفوظ رہ سکتا ہے جس کو اللہ محفوظ رکھے، اور پھر جب استاذ بھی امام بخاری کو نعیم اور حمیدی جیسے لوگ مل جائیں جن کی جلن اور کڑھن امام ابوحنیفہ سے اور احناف سے معروف زمانہ ہے تو پھر امام بخاری کی زبان وقلم سے امام ابوحنیفہ کے بارے میں جو بھی نہ نکل جائے مقام تعجب نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ جو امام بخاری کے استاذوں کے استاذ تھے کے بارے میں امام بخاری نے جو جرحین کی ہیں شاید وہ اللہ کو پسند نہیں آئیں اور غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ امام بخاری جیسا جلیل القدر محدیث اور فن حدیث کا امام جس کی شہرت سے عالم اسلام گونج رہا تھا اور جس کے شاگردوں کی تعداد ہزار ہا ہزار تھی اپنی عمر کے آخر ایام میں بہت بے قیمت اور بے حیثیت ہوگیا تھا اور اس پر دنیا کی زمین تنگ ہوگئی تھی حضرت امام ذہلی نے ان کو اپنے دربار سے اس طرح باہر کیا کہ نیشاپور سے جب وہ نکلے ہیں تو ان کے ساتھ امام مسلم اور ایک اور صاحب کے سوا کوئی نہیں تھا اور نیشاپور سے نکلنے کے بعد ان کو کبھی قرار سے رہنے کا موقع نہیں ملا، ان کی مخالفت کرنے والے اتنے ہوگئے کہ کسی جگہ پناہ لینا مشکل ہوگیا اور آخر کار امام بخاری کو اللہ سے یہ دعا کرنی پڑی۔ خدایا تیری زمین باوجود کشادہ ہونے کے مجھ پر تنگ ہوگئی ہے، مجھے اپنے پاس بلالے ،خدا نے یہ دعا قبول فرمائی اور چند ہی روز بعد امام بخاری کا انتقال ہوگیا۔(سیرۃ امام بخاری ص ۹۹)

جنازہ میں کتنے آدمی شریک ہوئے، نماز جنازہ کس نے پڑھائی اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا ،حضرت امام اہل سنت احمد بن حنبل کا جب انتقال ہوا تھا تو ان کی نماز جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد لوگوں نے دس لاکھ بتلائی ہے۔ مگر امام المحدثین بخاری کا ایک گمنام جگہ میں انتقال ہوجاتا ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی اور کتنے لوگ اس میں شریک تھے اور معنوی طور پر امام بخاری کی شخصیت ایسی مجروح ہوئی کہ امام مسلم جیسے ان کے شاگرد نے صحیح مسلم میں امام بخاری سے کوئی روایت نہیں لی اور بہت سے محدثین نے ان پر جرح کی اور طرح طرح کے ان کے اوپر مواخذات ہوئے ،ان کی لوگوں نے غلطیاں نکالیں ،اس بارے میں انہوں نے تصانیف کیں امام ذہلی اور ابوحاتم نے ان کو متروک قرار دیا ،صحیح بخاری کے راویوں تک پر دارقطنی جیسے محدث نے کلام کیا، امام بخاری اور ان کی کتاب کے ساتھ یہ معاملہ کرنے والا الحمدللہ کوئی حنفی اور اہل الرائے میں سے نہیں تھا بلکہ یہ سب کے سب امام بخاری کے ہم مسلک وہم مشرب محدثین ہی تھے ،احناف نے تو امام بخاری کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود بھی کہ ان کا معاملہ ابوحنیفہ کے ساتھ کیسا رہا ہے ان کو ہمیشہ اپنے سر ہی پر بٹھایا اور ان کو امیر المومنین فی الحدیث ہی سمجھا۔

امام بخاری جس کسمپرسی کے آخری ایام گزار کر اس دنیا سے تشریف لے گئے اور جس طرح سے ان کا جنازہ پڑھا گیا اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی عبرت ہے جو امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ کی شان میں اپنی زبان دارز کرتے ہیں۔

حضرت امام اعظم کے خلاف جن لوگوں نے بکواسیں کی ہیں یہ لوگ عقیلی کی کتاب کتاب الضعفاء سے بھی بہت کچھ نقل کرتے ہیں ،محدث عقیلی نے کتاب الضعفاء میں امام ابوحنیفہ کا ذکر کرکے ان کا حدیث میں ضعیف ہونا ثابت کیا ہے، اور امام ابوحنیفہ سے جلنے بھلنے

والے لوگ اس کتاب کی باتوں کو نقل کرکے عوام کو امام ابو حنیفہ سے بھڑکاتے ہیں چونکہ محدث عقیلی اور ان کی کتاب سے عام طور سے لوگ ناواقف ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ ان باتوں کو سچ سمجھ لیتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر محدیث عقیلی اور ان کی کتاب پر اعتماد کیا جائے اور اس کو قابل اعتبار سمجھا جائے اور عقیلی کو محدثین کے ضعیف ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں معیار قرار دیا جائے تو فقہ محدثین کی ایک بہت بڑی تعداد مجروح قرار پائے گی، حتی کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے رواۃ بھی ناقابل اعتبار قرار پائیں گے اور اس طرح صحیحین کا پایہ اعتبار بھی جاتا رہے گا، عقیلی کا حال تو یہ ہے کہ وہ امام بخاری کے سب سے بڑے استاذ جن کی روایتوں سے بخاری نے اپنی صحیح کو بھر رکھا ہے یعنی علی بن المدینی کو بھی اس کتاب میں ذکر کیا ہے، حالانکہ علی بن المدینی وہ ہیں جن کے ثقہ ہونے اور جن کی جلالت قدر پر سارے محدثین کا اتفاق عام ہے، مگر عقیلی نے ان کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔

عقیلی نے کثیر بن شنیظر کو بھی ضعیف قرار دیا ہے حالانکہ نسائی کے سوا اصحاب ستہ نے ان کی روایتوں کی اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے
(دیکھو کتاب الضعفاء ج ۱ ص ٦)

کثیر بن شنیظر کی روایتوں کی تخریج امام بخاری نے کی ہے اور ایک روایت کی تخریج امام مسلم نے کی ہے، بخاری والی روایت کو ابوداؤد اور امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔

عقیلی نے کتاب الضعفاء میں کثیر مولی ابن سمرہ کا بھی ذکر کیا ہے، اور کمال یہ ہے کہ صرف ذکر کیا ہے کسی سے ان پر کوئی جرح نہیں نقل کی ہے۔ (ج ۴ ص ۳)

عقیلی نے اس کتاب میں محمد بن ابراہیم تیمی کا بھی ذکر کیا ہے (ج ۴ ص ۲۰) حالانکہ محمد بن ابراہیم کی توثیق پر سارے محدثین کا اتفاق ہے، امام بخاری نے ان کی روایت سے اپنی صحیح میں احتجاج کیا ہے، ابن معین ان کو ثقہ قرار دیتے ہیں، ابو حاتم نے بھی ان کو ثقہ قرار دیا ہے، امام نسائی ابن خراش، ابن حبان یعقوب بن شیبہ سب ان کو ثقہ قرار دیا ہے، امام ذہبی فرماتے ہیں وثقہ الناس واحتج بہ الشیخان وقفز القنطرۃ یعنی عام طور پر لوگوں نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، شیخین یعنی بخاری و مسلم نے ان سے احتجاج کیا ہے اور یہ زبردست قسم کے ثقہ تھے۔ (دیکھو اس صفحہ کا حاشیہ)

عقیلی نے محمد بن اسحاق کو بھی کتاب الضعفاء میں ذکر کیا ہے حالانکہ اس کی روایت سے غیر مقلدین قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں احتجاج کرتے ہیں اور یہ شخص ان کے نزدیک زبردست ثقہ ہے۔

عقیلی نے محمد بن حجادہ کو بھی ضعیف قرار دیا ہے (ج ۴ ص ۴۳) حالانکہ یہ شخص بالاتفاق ثقہ محدث ہے بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ ان تمام کتابوں میں ان کی حدیثیں ہیں۔

عقیلی نے محمد بن حسن الاسدی کو بھی ضعیف قرار دیا ہے (ج ۴ ص ۵۰) حالانکہ یہ بخاری کے نزدیک حجت ہیں بخاری نے اپنی صحیح میں ان کی روایت ذکر کی ہے، نسائی میں بھی ان کی روایت ہے اور بڑے بڑے محدثین نے جیسے ابن المدینی، دارقطنی ابن شاہین وغیرہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔

عقیلی نے محمد بن ارشد الخزاعی کو بھی ضعیف بتلایا ہے (ج ۴ ص ۶۵) جب کہ امام احمد، ابن معین علی بن المدینی نسائی جیسے لوگ ان کو ثقہ بتلاتے ہیں ان کے تلامذہ میں کبار ائمہ فقہ وحدیث ہیں مثلاً امام ثوری، شعبہ ابن المبارک ابن المہدی وغیرہ نے اس سے روایت کی ہے۔ (صفحہ کا حاشیہ دیکھو)

عقیلی نے محمد بن طلحہ کو بھی ضعیف قرار دیا ہے (ج ۴ ص ۸۵) جب کہ یہ صدوق مشہور ہیں بخاری ومسلم میں ان کی روایتوں سے احتجاج کیا گیا ہے، بڑے بڑے ائمہ حدیث جیسے عبد الرحمٰن بن مہدی ابن سلام ابوداؤد طیالسی وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے، امام احمد عجلی ابن حبان وغیرہ نے ان کو ثقہ کہا ہے، عقیلی نے محمد بن عبد اللہ بن مسلم کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ (ج ۴ ص ۸۸)

جب کہ ان کے صدوق وثقہ ہونے پر اتفاق عام ہے، بخاری ومسلم اور سنن اربعہ میں ان کی روایات موجود ہیں

اسی طرح عقیلی نے محمد بن عمر کو بھی ضعیف قرار دیا ہے (ج ۴ ص ۱۰۹) جب کہ ان کی توثیق پر اتفاق عام ہے بخاری ومسلم اور سنن اربعہ میں ان کی حدیثیں ہیں

عقیلی نے محمد بن عجلان المدینی کو بھی ضعیف قرار دیا ہے (ج ۴ ص ۱۱۸) حالانکہ یہ جلیل القدر اور عظیم المرتبت محدث تھے ان سے روایت کرنے والوں میں امام مالک امام شعبہ یحییٰ بن سعید القطان جیسے ائمہ حدیث ہیں سنن اربعہ میں ان کی روایت موجود ہے۔

عقیلی نے محمد بن فضیل بن غزوان کو بھی ضعفاء میں ذکر کیا ہے (ج ۴ ص ۱۱۸) جب کہ ان کا ثقہ ہونا متفق علیہ بات ہے بخاری، مسلم، اور سنن اربعہ میں ان کی روایت موجود ہے۔

اس طرح نہ معلوم کتنے ثقہ محدثین اور صحاح ستہ کے راویوں کو عقیلی نے اپنی کتاب الضعفاء میں ذکر کر کے ان کی مقدس شخصیوں کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے اگر انہوں نے حضرت امام اعظم کو بھی اپنی اس کتاب میں ذکر کیا ہے تو ثقہ کو غیر ثقہ قرار دینا غیر مجروح کو مجروح قرار دینا یہ عقیلی کا کام ہی رہا ہے، ان ثقہ راویوں کا کچھ نہیں بگڑا البتہ اس سے خود عقیلی کی اپنی شخصیت مجروح ہوگئی۔

عقیلی نے جب ابن المدینی بخاری کے استاذ تک کو نہیں چھوڑا تو وہ ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کو کب بخشنے والے تھے، امام ذہبی ابن المدینی کو عقیلی کی مجروح اور ضعیف قرار دینے کی حرکت پر برافروختہ ہو کر عقیلی سے یوں مخاطب ہوئے ہیں۔

فمالک عقل یا عقیلی اتدری فیمن تتکلم کانک لاتدری ان کل واحد من ہؤلاء اوثق منک بطبقات بل اوثق من ثقات کثیر من لم توردھم فی کتابک

(المیزان ج ۳ ص ۱۴)

یعنی اے عقیلی کیا تجھے عقل نہیں ہے کہ تو کس کو مجروح قرار دے رہا ہے، گویا تو یہ بھی نہیں جانتا کہ ان میں سے ہر ایک تجھ سے کئی درجہ بڑھ کر ثقہ ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ثقہ ہیں جن کا تو نے اپنی کتاب میں ثقہ جان کر ذکر نہیں کیا ہے

تعجب ہے کہ امام ابوحنیفہ کے معاندین عقیلی کی جرح کو امام ابوحنیفہ کے بارے میں تو بڑی خوشی سے نقل کرتے ہیں مگر عقیلی نے جن دوسرے بخاری ومسلم کے راویوں پر کلام کیا ہے اسے وہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، یہ ہے ان دشمنان ابوحنیفہ کے انصاف کی بات۔

عقیلی کی کتاب الضعفاء کے محقق ومحشی امام ابوحنیفہ کے بارے میں عقیلی کی جرحوں کے بارے میں رقمطراز ہیں،

ولایفوتنی ان اذکر ان ابن عبدالبر ردبعض الجرح فی انتقأہ انصافاًبعض الثقات الذین ضعفھم العقیلی وکان ابن الدخیل راویۃ العقیلی فالف جزء فی فضائل ابی حنیفۃ ردا علی العقیلی حیث اطال لسانہ فی فقیہ الملۃ واصحابہ البورۃ شان الجھلۃ الاغرار وتبرأ ومماخطنہ یمین العقیلی ممایجا فی الحقیقۃ

یعنی یہاں مجھے یہ کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ عقیلی کی بعض ثقات کے بارے میں جوجرحیں ہیں جن کی بناپراس نے ان کوضعیف قرار دیاہےاس کواظہارانصاف کے طور پر حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب الانتقاء میں رد کردیاہےاور عقیلی کے راوی ابن دخیل نے امام ابوحنیفہ کے فضائل میں ایک رسالہ تالیف کیاہے،جس میں اس نے عقیلی کارد کیاہے،اسلئے کہ اس نے امت کے فقیہ امام ابوحنیفہ اور ان کے نیک وصالح شاگردوں کے بارے میں اپنی زبان کولمبا کیاہے،جس کاحقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے عقلی کایہ عمل جاہل بیوقوفوں کاہے،جوحقیقت کے بالکل خلاف ہے،اس رسالہ کوابن الدخیل سے مکہ میں حکم بن المنذرالبلوطی اندلسی نے سنااور بلوطی سے حافظ ابن عبدالبر نے سناپھر انہوں نے اپنی کتاب الانتقاء میں امام ابوحنیفہ کے ترجمہ میں اس کتاب کااکثر حصہ نقل کیاہے۔

یعنی عقیلی نے امام ابوحنیفہ کے بارے میں جوبکواسیں کی ہیں اس کارد خود اس کے خاص شاگردوں نے ہی کردیاتھااور عقیلی کایہ عمل ان کے نزدیک جاہلوں اور بیوقوفوں کاعمل قرارپایااورانہوں نے اس کی بکواسوں کوحقیقت سے دور بتلایا۔

بہرحال کہنایہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے بارے میں جن کی امامت وثقاہت اور علمی تبحر اور فضائل ومناقب زبان زدعام ہیں کسی کی جرح کوقبول نہیں کیاجائے گا،چاہے وہ اپنے وقت کاکتنابڑاہی عالم ہواس لئے کہ بقول حافظ ابن حجر امام ابوحنیفہ پر جرح کرنے والے دوہی طرح کے لوگ ہیں یاتوان کے علم وفضل اور خداداد مقبولیت ومحبوبیت کی وجہ سے ان پر حسد کرنے والے ہیں یاان کے مقام ومرتبہ سے جاہل ہیں

حافظ ابراہیم سیالکوٹی مشہور غیرمقلد عالم ہیں وہ تاریخ اہلحدیث میں فرماتے ہیں حافظ ذہبی کے بعد خاتمۃ الحفاظ ابن حجر کوبھی دیکھئے علوم حدیثیہ وتاریخیہ میں ان کے تبحر وفضل وکمال اور احوال رجال سے پوری آگاہی کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں،آپ تہذیب التہذیب جواصل میں امام ذہبی کی کتاب تہذیب کی تہذیب ہے امام ابوحنیفہ کے ترجمہ میں آپ کی دینداری اور نیک اعتقادی اور صلاحیت عمل میں کوئی خرابی اور کسر بیانی نہیں کرتے بلکہ بزرگان دین سے ان کی ازحد تعریف نقل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

الناس فی ابی حنیفہ حاسدوجاھل یعنی حضرت امام ابوحنیفہ کے متعلق بری رائے رکھنے والے لوگ کچھ تو حاسد ہیں اور کچھ جاہل ہین سبحان اللہ کیسے اختصار سے دوحرفوں میں معاملہ صاف کردیاہے(ص ۶۰) سیالکوٹی صاحب مزید حافظ ابن حجر کی یہ بات لکھتے ہیں

حافظ صاحب ممدوح (یعنی ابن حجر) لکھتے ہیں کہ قاضی احمد بن عبدہ قاضی رے نے اپنے باپ سے نقل کیاہے کہ ہم ابن عائشہ کے پاس بیٹھے تھے کہ اس نے امام ابوحنیفہ کی ایک حدیث بیان کرکے کہاکہ تم لوگ اگر آپ کوپاتے توضرور آپ کوچاہنے لگتے پس تمہاری اوران کی مثال ایسی ہے جیسے یہ شعر کہاگیاہے۔

اقلواعلیھم ویلکم لا ابالکم ،

من اللوم اوسدو االکان الذی سدوا

یعنی لوگوتمہارا براہوتمہارے باپ مرجائیں ان پر ملامت کی زبان کوکوتاہ کرو، ورنہ اس مکان کوپر کروجس کوانہوں نے پر کیا تھا،یعنی ویسے بن کردکھاؤ۔سبحان اللہ کیسے عجیب پیرائے میں اعلیٰ درجہ کی تعریف کی ہے(ص ٦٠)

معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ اوران کے ممتاز تلامذہ کے بارے میں کسی کی جرح کا کوئی اعتبارنہیں ہےاوران جرحوں کی بنایا تو مذہبی منافرت ہے یا حسدوجہل کا جذبہ،حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے،اورامام ابوحنیفہؒ اوران کے شاگردوں کے بارے میں محدثین کی طرف جومنسوب حکایتیں ہیں وہ سب دشمنان ابوحنیفہ کی گڑھی ہوئی باتیں،اورسراسر کذب واختراع ہیں جن ائمہ کی طرف ان باتوں کوامام کے حق میں منسوب کیا گیا ہےان کا دامن اس طرح کی باتوں سے قطعاًپاک ہے۔

ابن ابی حاتم نے بھی اپنی کتاب کتاب الجرح والتعدیل میں امام ابوحنیفہ پرزبان تنقید کھولی ہےمگران کی اس کتاب کا سارامادہ امام بخاری کی کتاب تاریخ کبیر سے چرایا ہواہے،اور چرایا ہوااس لئے کہہ رہاہوں کہ انہوں نے کہیں یہ اشارہ نہیں کیا ہے کہ انہوں نے اپنی یہ کتاب امام بخاری کی کتاب کوسامنے رکھ کرتیار کی ہے۔

خطیب کہتے ہیں کہ انہ اخذ مادۃ التاریخ الکبیر للبخاری فعمل منھا کتاب الجرح والتعدیل ونسبہ الی نفسہ ۔

یعنی ابن حاتم نے امام بخاری کی کتاب تاریخ کبیر سے سارامادہ لےکراپنی کتاب الجرح والتعدیل تیارکی ہےاوراس کتاب کواپنی طرف منسوب کیا ہے،پھرخطیب لکھتے ہیں ومن العجب ان ابن ابی حاتم اغارعلی کتاب البخاری ونقلہ الی کتابہ فی الجرح والتعدیل یعنی عجیب بات ہے کہ ابن ابی حاتم نے بخاری کی کتاب پرڈاکہ ڈالااوراس کواپنی کتاب الجرح والتعدیل میں نقل کیا ہے۔

اورلطف کی بات یہ ہے کہ بخاری کی تاریخ کبیر میں جن اسماء کا ذکر ہےان کواکٹھا کیااوران کے بارے میں اپنے باپ ابوحاتم اور امام ابوزرعہ سے معلومات حاصل کرکے پھرامام بخاری پراعتراض کیااوران کی غلطیوں کوجمع کیا،اوراپنی ان تمام حرکتوں پرکسی طرح کا کوئی عذربھی پیش نہیں کیا(١)

الموضح للخطیب (ص ٧، ١٨ زالخطیب واثرہ ص ٣٥٨)

جس کی دیانت وامانت کا یہ حال ہووہ خودکتنابڑامجروح شخص ہوگااوراس کی جرح کسی کے بارے میں کب قابل قبول ہوگی،افسوس ایسے مجروح اورغیرثقہ اورغیرامین لوگوں کوبھی حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ جیسے امام فقہ وحدیث پرزبان طعن درازکریں اوران کومجروح قراردیں جن کی امانت ودیانت وامامت وعدالت مشہورزمانہ ہےاورجن کا علم اقطارعالم میں پھیلا ہوا ہےاورجمہورنے جس کواپنا مقتدیٰ بنایا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی شان میں سب سے زیادہ بکواس کرنے میں جس شخصیت کوبہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے،وہ خطیب بغدادی

ہیں

انہوں نے اپنی تاریخ کی تیرہویں جلد میں حضرت امام اعظم اوران کے تلامذہ کی برائیوں کوذکر کرنے میں بڑی درازنفسی سے کام لیا ہےان کی تاریخ میں سب سے طویل ترجمہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کا ہے ص ۳۲۳ سے لیکر ۴۵۴ تک یعنی سوصفحات سے بھی زائدمیں یہ ترجمہ پھیلا ہوا ہے شروع میں ائمہ دین سے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں توثیق اور تعریف کے کلمات نقل کئے پھران کے قلم کا رخ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی برائی بیان کرنے کیطرف جومڑا تو اس وقت رکا جب ان کے ترکش کا آخری تیر اس خواب پر ختم ہوا، میں ناظرین کی عبرت اور خطیب کوحضرت امام ابوحنیفہ سے جوبغض وعداوت رہی ہے اس کو بتلانے کے لیے یہاں وہ خواب نقل کرتا ہوں خطیب اپنی سند سے بشر بن ابی الازہر کا یہ خواب نقل کرتے ہیں بشر سے یہ خواب سننے والے حضرت ابن المدینی ہیں، حضرت ابن المدینی فرماتے ہیں میں نے بشر بن ابی الازہر سے سنا ہے کہ انہوں نے کہا۔

رایت فی المنا م جنازة علیها ثو ب اسودو حو له قیسون فقلت جنازة من هذه فقالو جنا زة ابی حنیفة حد ثت ابا یو سف فقال لا تحدث به احد ا

تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۵۴

میں نے خواب دیکھا کہ ایک جنازہ ہے جس پر کالا کپڑا پڑا ہوا ہے اور اس کے آس پاس نصاریٰ کے علماء ہیں میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے تو لوگوں نے کہا کہ یہ ابوحنیفہ کا جنازہ ہے بشر کہتے ہیں کہ میں نے اس خواب ابو یوسف سے بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ اس کو کسی سے بیان مت کرنا۔

فقیہ ملت، فقہاء امت کے سردار امام اعظم کے بارے میں خطیب کے ذہن میں کتنی گندگی بھری تھی اس کا اندازہ اس خواب سے ناظرین لگائیں جس پر خطیب نے امام اعظم کے ترجمہ کو ختم کیا ہے کون ابوحنیفہ جن کے بارے میں مشہور مورخ محمد بن اسحٰق بن ندیم المتوفی ۳۸۵ھ اپنی فہرست میں فرماتے ہیں والعلم براً وبحرا وشرقاً و غر باً بعد اً وقر باً تدوینه رضی الله عنه ص ۲۹۹ فہرست ابن ندیم یعنی علم بر و بحر مشرق ومغرب دور اور نزدیک جتنا بھی ہے یہ سب امام ابوحنیفہؒ (اللہ ان سے راضی ہو) ہی کا مدون کردہ ہے اور جن کے بارے میں حافظ ابن کثیر الشافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

الا مـا م فـقیـه الـعـراق احد ائمة الاسلا م والسادة الا علا م احدار کا ن العلما ء احد الا ئمة الا ربعة واصحا ب المذاهب المتبوعة۔ البدایۃ ج ۱۰ ص ۱۰۷

یعنی حضرت ابوحنیفہؒ امام تھے عراق کے فقیہ تھے اسلام کے اماموں میں سے ایک تھے اور اونچے درجہ کے سرداروں میں سے ایک تھے علماء کے ارکان میں سے ایک رکن تھے ائمہ اربعہ میں سے ایک تھے اور ان میں سے تھے جن کے مذہب کی اتباع کیجاتی ہے یہ ایک شافعی امام وقت کی شہادت ہے کسی حنفی کی نہیں۔

دکتور محمد بن الطحان خطیب کی اس حرکت نازیبا کے بارے میں فرماتے ہیں کیا وہ روایتیں جن کو خطیب نے امام ابوحنیفہ کی برائی بیان

کرنے میں ذکر کی ہیں اور جو تقریباً اس تاریخ کے ساٹھ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں کم تھیں کہ خطیب کو امام ابوحنیفہ کے مثالب کی تکمیل کے لئے شیطانی خوابوں کا سہارا لینے کے لئے مجبور ہونا پڑا پھر فرماتے ہیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اچھا خواب تو ذکر کیا جائے مگر برے خواب کا لوگوں سے تذکرہ نہ کیا جائے اور برا خواب دیکھنے والا صرف یہ کرے کہ اللہ کے ذریعہ شیطان سے پناہ مانگے اور بائیں جانب تین دفعہ تھوک دے تا کہ اس خواب کا نقصان اس کو نہ پہنچے۔

تو بفرض محال اگر یہ خواب سچا ہی رہا ہو تو اگر خواب دیکھنے والے نے حدیث کی مخالفت کی تھی تو خطیب کو کیا ہو گیا تھا کہ اس کو عام کرنے اور پھیلانے کا کارنامہ انہوں نے انجام دیا، شاید خطیب نے اس کو اچھا خواب سمجھا ہے اسی لئے اس کو اپنی تاریخ میں ذکر کیا اور لوگوں میں عام کیا اس طرح اس نے اللہ کی رضا حاصل کرنے اور سنت کا ثواب حاصل کرنے کو سوچا۔ (۱)

حقیقت میں خطیب نے امام ابوحنیفہ کا ترجمہ اس خواب پر ختم کر کے بتلا دیا کہ اس کے دل میں امام اعظم سے کتنا بغض بھرا ہے۔ جو شخص اتنا گیا گزرا ہو جو اس طرح کا خواب بھی امام اعظم جیسی جلیل القدر وعظیم المرتبت شخصیت کے بارے میں نقل کرنے سے خدا کا خوف نہ کھائے وہ امام اعظم کے بارے میں جتنا بھی افتراء کرے کم ہے، اگر خطیب میں انصاف پسندی کی ذرا بھی بو ہوتی تو وہ اس خواب پر جس کو خود خطیب نے اور حافظ ابن عبدالبر وغیرہ نے نقل کیا ہے حضرت امام ابوحنیفہ کا ترجمہ ختم کرتے، خطیب ہی اپنی سند سے محمویہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے محمد بن الحسن کو خواب میں دیکھا میں نے کہا کہ آپ کے ساتھ کیا

(۱) الحافظ الخطیب البغدادی و اثر ہ فی علوم الحدیث (ص ۳۴۴۔۳۴۵)

معاملہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ اللہ نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے تجھ کو علم کا ظرف اس لئے نہیں بنایا تھا کہ میں تجھ کو سزا دوں میں نے کہا ابو یوسف پر کیا گزری تو انہوں نے کہا کہ مجھ سے اوپر ہیں تو میں نے کہا کہ ابوحنیفہ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ ابو یوسف سے کئی طبقات (کئی درجے) اوپر ہیں اور بعض روایت میں ہے کہ وہ اعلیٰ علیین میں ہیں۔

مثالب ابی حنیفہ بیان کرنے میں خطیب بغدادی عجیب وغریب تضاد کا شکار ہوئے ہیں یعنی امام ابوحنیفہ کی برائیاں بیان کرنے میں انہوں نے بیشتر جگہ انہیں راویوں کا سہارا لیا ہے جن کی تضعیف خود انہوں نے کی ہے اور ان کو نا قابل اعتبار قرار دیا ہے، مگر یہی نا قابل اعتبار لوگ مثالب امام ابوحنیفہ بیان کرتے وقت خطیب کے نزدیک قابل اعتبار ہو گئے ہیں اور ضعیف راویوں کی روایتیں خطیب کے نزدیک محفوظ روایتیں بن گئی ہیں۔

دکتور محمد طحان فرماتے ہیں۔

کیف یصف الخطیب المثالب بالمحفوظ وفی اسانید تلک الروایات رجال تکلم الخطیب نفسه علیهم بالجرح والتضعیف فی کتاب التاریخ ذاته (ص ۳۰۸ الخطیب واثرہ فی علوم الحدیث)

یعنی خطیب مثالب اور مطاعن والی روایتوں کو کس طرح محفوظ بتلاتے ہیں جبکہ ان روایتوں کو انہوں نے ایسی سندوں سے بیان کیا ہے جن میں ایسے لوگ ہیں جن پر خود خطیب نے اس کتاب میں جرح کی ہے اور ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔

پھر فرماتے ہیں

جو شخص امام ابوحنیفہ کی عیب جوئی و برائی بیان کرنے میں ایسے راویوں کی روایتیں ذکر کرتا ہے جن پر وہ خود کلام کر چکا ہے اور ان کو ضعیف قرار دے چکا ہے، اور پھر انہیں ضعیف راویوں کی روایتوں کو وہ محفوظ کہے اور ان پر اعتماد کریں وہ شخص خود اپنے ہی کو اعتراض اور طعن کا نشانہ بناتا ہے (ص ۳۰۸ ایضاً)

خطیب بغدادی کی جب یہ تاریخ مصر میں چھپ رہی تھی تو اس وقت کی مصری حکومت (۱) نے جامعہ از ہر کے علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دی کہ اس تاریخ میں امام ابوحنیفہ کے تذکرہ میں خطیب نے جن روایتوں کے سہارے امام ابوحنیفہ کو مجروح ومطعون کرنے کی کوشش کی ہے ان روایتوں کا جائزہ لیں اور ان کی جانچ پڑتال کریں چنانچہ جب علماء از ہر نے ان روایتوں کا جائزہ لیا تو ان کا تبصرۃ خطیب کے بارے میں یہ تھا۔

''اس کتاب کا پڑھنے والا یہ محسوس کرے گا کہ خطیب نے امام ابوحنیفہ کو بدنام کرنے اور ان کی قدر و منزلت گھٹانے میں بہت اسراف سے کام لیا ہے خطیب نے امام ابوحنیفہ کی برائی بیان کرنے میں جن روایتوں پر اعتماد کیا ہے۔ ہم نے ان سب کی چھان بین کی تو ان سب رواتیوں کو واہی اور کمزور سند والی پایا یہ روایتیں معنوی طور پر ایک دوسرے کے متعارض بھی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی تعصب کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے، خطیب کا مذہبی تعصب ان روایتوں میں نمایاں ہے۔''

بہت سے جلیل القدر اور ذی مرتبت عالموں نے انصاف پسندی سے کام لیا ہے اور انہوں نے امام اعظم کی بھرپور تعریف کی ہے اور بہت سے ثقہ علما سے امام اعظم کے بارے میں ایسے تعریفی کلمات منقول ہیں خطیب کی ان جرحوں کی دھجیاں اڑا دیتے ہیں جن

(۱) اس کے پہلے اڈیشن کی تیرہویں جلد کی جس میں امام اعظم کا ترجمہ تھا ضبط کرلیا تھا اور اس کا دوسرا اڈیشن جامعہ از ہر کے علما کی نظر ثانی کے بعد چھپا

کو خطیب نے محفوظ کیا ہے، اگر تم ان علما کی باتوں کو جاننا چاہتے ہو تو حافظ ابن عبدالبر کی الانتقاء خوارزمی کی جامع المسانید، حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ ملک معظم کی السہم الخطیب سید مرتضیٰ زبیدی کی الجواہر المنیفہ وغیرہ کتابوں کا مطالعہ کرو۔

امام ابوحنیفہ کی جلالت قدر، زہد و ورع اور علم میں ان کا درجہ طبعیت کی عمدگی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو ان کا مضبوطی سے تھامنا یہ باتیں مشہور زمانہ ہیں، امام ابوحنیفہ کی وہ صفات ہیں جو ان کے قابل اعتماد شاگردوں اور دوسرے ثقہ اہل علم کی ایک جماعت سے بطور شہرت کے پہنچی ہیں، اس لئے کہ حضرت ابوحنیفہ کی شان کو خطیب کی یہ ضعیف اور کمزور روایتیں بٹہ نہیں لگا سکتی ہیں دیکھو کہ حافظ ابن عبدالبر نے الانتقاء میں امام سفیان ثوری سے کیا نقل کیا ہے۔

امام ثوری حضرت ابوحنیفہ کے بارے میں فرماتے ہیں

كان ابوحنيفة شديد الاخذ للعلم ذابا عن حرم الله ان تستحل ياخذ بما صح عنده من الاحاديث التى كان يحملها الثقات وبالآخر من فعل رسول الله ﷺ وبما ادرك عليه علماء الكوفة ثم فتنع قوم يغفر الله لنا ولهم (حاشیہ تاریخ بغداد ص ۳۱۹ ج ۱۳)

یعنی حضرت ابوحنیفہؒ بہت زیادہ علم حاصل کرنے والے تھے، اللہ کی حرمتوں کی مدافعت میں لگے رہنے والے تھے تاکہ اسے حلال نہ سمجھ لیا جائے، وہ انہیں حدیث کو اختیار کرتے تھے جو ان کے نزدیک صحیح ہوتی اور جسے ثقہ راوی روایت کرتے، امام ابوحنیفہ حضور ﷺ کے آخری فعل اور علما کوفہ کے جو طریقے تھے اسی کو اختیار کرتے تھے
پھر بھی کچھ لوگوں نے امام پر طعن وتشنیع کیا ہے، اللہ ہم کو اور ان کو معاف کرے۔

اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ خطیب نے امام ابوحنیفہ کے ایک دشمن کی زبان سے انہیں امام سفیان سے وہ گندی بات نقل کی ہے کہ اسلام میں امام ابوحنیفہ سے زیادہ کوئی منحوس پیدا نہیں ہوا اور آپ حافظ ابن عبدالبر سے جن کا علمی مرتبہ سب کو معلوم ہے یہ بھی سن رہے ہیں کہ امام ابوحنیفہ سنت رسول ﷺ اور آپ کی صحیح احادیث کے بہت حریص تھے اور آپ کے مذہب وفقہ کی بنیاد صحیح حدیث پر ہے، اور دینی غیرت کا عالم یہ تھا کہ اللہ نے جس چیز کو حرام کیا ہے اسے کوئی حلال سمجھ لے امام ابوحنیفہؒ اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے حسد وجہل کی وجہ سے جن لوگوں نے ایسے امام پر طعن وتشنیع کیا ہے وہ ان کا ایسا برا عمل ہے کہ امام ثوری ان کے لئے بخشش کی دعا کرتے ہیں۔
بہر حال ان حقائق سے معلوم ہوا کہ ہمارے جن دوستوں نے امام ابوحنیفہ پر اعتراضات کرنے کے لئے اور اپنی عاقبت خراب کرنے کے لئے خطیب بغدادی کا سہارا لیا ہے ان کا آشیانہ بہت ہی زیادہ شاخ نازک پر قائم ہے۔
آپ خطیب بغدادی کے تناقض کی دو ایک مثال بھی ملاحظہ فرمائیں تاکہ خطیب نے امام ابوحنیفہ کے مثالب میں جو روایتیں نقل کی ہیں ان کی حقیقت آپ پر مزید واشگاف ہو،

(۱) محمد بن حبویہ النخاس کی روایت سے خطیب نقل کرتے ہیں کہ امام وکیع نے فرمایا کہ میں نے سفیان ثوری سے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم مومن ہیں اور ہمارے نزدیک سارے اہل قبلہ مومن ہیں، اور ہمارا اللہ کے یہاں کیا حال ہے ہم یہ نہیں جانتے (کہ ہم مومن ہیں یا نہیں) پھر امام وکیع فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ فرماتے تھے کہ جو سفیان کے قول کو اختیار کرے گا وہ ہمارے نزدیک اپنے ایمان میں شک کرنے والا ہوگا، ہم یہاں بھی قطعی طور پر ایمان والے ہیں اور اللہ کے یہاں بھی ہم ایمان والے ہیں، امام وکیع فرماتے ہیں کہ ہم تو سفیان کا قول اختیار کرتے ہیں، امام ابوحنیفہ کی بات ہمارے نزدیک جرأت کی بات ہے۔

یہ روایت خطیب محمد بن حبویہ سے نقل کرتے ہیں اس کو ابوالعباس خزاز کہا جاتا ہے اس کے بارے میں خود خطیب کا یہ بیان ہے کہ یہ ناقابل اعتبار راوی ہے، خطیب کی اس پر جرح ان کلمات سے ہے

كان منساهلا فيما يرويه يحدث عن كتاب ليس عليه سماعه

یعنی یہ شخص حدیث کے بیان کرنے میں بہت ڈھیلا ڈھالا تھا یہ ان کتابوں سے بھی روایتیں بیان کرتا تھا جو اس کی سنی ہوئی نہ ہوتی تھیں (دیکھو رقم ۱۱۳۹) ایسے بے اعتبار شخص سے جس کی بے اعتباری پر خود خطیب شہادت مہیا کرتے ہیں امام ابوحنیفہ کی برائی میں امام وکیع جو امام کے قول پر فتویٰ دینے والے محدث تھے کی زبان سے امام کی شان میں برائی نقل کرتے ہیں

پھر یہ بھی دیکھئے کہ امام ابوحنیفہ کا یہ قول جو خطیب کی نگاہ میں اللہ کی شان میں جرأت ہے عین صواب ہے، اس لئے کہ اپنے ایمان کے بارے میں کسی کو اگر ذرا بھی شک ہو تو وہ پکا مومن ہی کب شمار ہوگا؟ اللہ پر ایمان کے ساتھ شک کی کیا گنجائش ہے؟ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت سفیان ثوری نے بعد میں اس شک والے قول سے رجوع کر کے حضرت امام ابوحنیفہ کا قول اختیار کر لیا تھا، جامعہ از ہر کے علما کی کمیٹی نے خوارزمی کے حوالہ سے سفیان کے رجوع والی بات اس جگہ پر اپنے حاشیہ میں نقل کی ہے، اور اپنے حاشیہ میں یہ لکھا ہے کہ یہ قول تنہا امام ابوحنیفہ کا نہیں ہے بلکہ بہت سے علما اسی کے قائل ہیں کہ ایمان میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے (ص ۳۷۱،۳۷۲ ج ۱۳)

(۲) متعدد رواتیں خطیب نے حارث بن عمیر کی سند سے روایت کی ہیں، یہ حارث پکے نمبر کا جھوٹا تھا، ذہبی فرماتے ہیں کہ ابن خزیمہ نے اس کو جھوٹا قرار دیا ہے۔ حاکم کا بیان ہے کہ یہ جعفر صادق سے موضوع اور گڑھی ہوئی رواتیں بیان کرتا تھا، ابن صادق کہتے ہیں کہ ثقہ اور پختہ کار لوگوں سے موضوع رواتیں نقل کرتا تھا۔

(۳) بعض رواتیں خطیب نے محمد بن محمد باغندی سے روایت کی ہیں، جن کے بارے میں محدثین فرماتے ہیں کہ یہ شخص بہت زیادہ تد لیس کرنے والا تھا اور جو باتیں اس کی سنی ہوئی نہیں ہوتی تھیں اس کو بیان کرتا تھا، یہ حدیثوں کا چور بھی تھا یعنی دوسروں کی حدیث کو اپنی حدیث بتلاتا تھا اور اس کی روایت کرتا تھا، ابراہیم اصبہانی اس کو کذاب کہتے ہیں یعنی یہ شخص بہت بڑا جھوٹا تھا اس کے بارے میں خود خطیب نے اس طرح کی جرحیں نقل کی ہیں (دیکھو نمبر ۱۲۸۵) ایسے کذابوں کی روایت کو خطیب امام ابوحنیفہ کے حق میں محفوظ کہتے ہیں۔

(۴) بعض روایات میں عباد بن کثیر ہے جس کے بارے میں حافظ ذہبی فرماتے ہیں ثقہ نہیں تھا اور نہ اس کی کوئی حقیقت تھی۔

ان روایتوں کی طرف اشارہ کر کے جن میں اس طرح کے کذاب روای ہیں دکتور محمد بن طحان فرماتے ہیں ھــکــذا یــکــو ن المحفوظ وفی السند کذا بو ن وغیر ثقات .

یعنی محفوظ رواتیں ایسی ہی ہوتی ہیں جن کی سند میں اس طرح کے جھوٹے اور غیر ثقہ راوی ہوں (ص ۳۱۴)

(۵) بعض روایات کی سندوں میں عبد السلام بن عبد الرحمٰن واصبی اور شریک بن عبد اللہ جیسے روای ہیں ان کو خود خطیب نے مجروح اور ضعیف قرار دیا ہے (۴۸۳۸)

شریک نے امام ابوحنیفہ پر یہ افتراء کیا کہ وہ کہتے تھے کہ نماز کا تعلق دین سے نہیں ہے حالانکہ صحیح روایت میں ہے کہ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ نماز ایمان کا جز نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ نماز چھوڑنے سے آدمی کا ایمان ہی چلا جائے اور وہ کافر ہو جائے اگر چہ نماز امام کے نزدیک شریعت کے اہم ارکان میں سے ہے

(دیکھو حاشیہ ص ۳۷۵ اور ۳۷۶)

(٦) ایک روایت خطیب نے یہ نقل کی ہے کہ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں تھے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالی عنہ اور حضرت آدم علیہ السلام کا یمان ابلیس کے ایمان کی طرح ہے، اس کی سند میں محبوب بن موسی الانطا کی اور ابواسحٰق فزاری ہے یہ دونوں نا قابل اعتبار اور منکر الحدیث روای ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ کے بارے میں خطیب ہر طرح کی بات نقل کرتے ہیں چاہے وہ کتنی ہی خلاف عقل کیوں نہ ہو، ایک ادنی درجہ کا مسلمان بھی وہ بات نہیں کہہ سکتا جو امام ابوحنیفہ کی زبان سے کذاب راویوں کی سند سے خطیب نے نقل کی ہے کیا خطیب کو اتنا پتہ بھی نہیں ہے کہ ابوحنیفہ کے نزدیک کسی بھی دینی حکم کا ادنیٰ سا بھی استخفاف باعث کفر ہے اور اس سے ان کے نزدیک انسان دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے وہ ابوحنیفہ حضرت ابوبکر اور حضرت آدم کے ایمان کو ابلیس کے ایمان کے برابر قرار دیں گے! غرض خطیب جو کچھ بھی نہ کر گزریں کچھ تعجب نہیں ہے کہ ان کے دل میں امام ابوحنیفہ کے خلاف بغض عناد بھرا ہوا تھا۔

(٦) بعض روایات کی سندوں میں محمد بن موسی بربری ہے، جس کے بارے میں خود خطیب کا کہنا ہے کہ اس کو صرف دو حدیثیں یاد تھیں اس میں ایک حدیث الطیر ہے جس کے موضوع ہونے پر محدثین کا اجماع ہے دیکھو نمبر ۱۳۲۶۔

(۷) بعض روایات کی سند میں حسن بن الحسین الدوماء النعال ہے جس کے بارے میں خطیب خود کہتے ہیں کہ اس نے اپنا معاملہ خود ہی خراب کر رکھا تھا بہت سی وہ باتیں جو اس کی سنی ہوئی نہیں تھیں ان کو بھی اس نے اپنی مسموعات میں شامل کرلیا تھا ذہبی فرماتے ہیں کہ یعنی اس نے ان کو گڑھ لیا تھا۔

خطیب نے ایک حرکت یہ کی ہے کہ امام ابوحنیفہ کو جہمی ثابت کرنے پر زور دیا ہے اور اس کے لیے انہوں امانت و دیانت کو بالکل بالا ئے طاق رکھ کر ہر طرح کی رطب دیا بس اور جھوٹی من گھڑت روایتوں کو ذکر کیا ہے۔ جبکہ خود خطیب ہی نے حضرت امام ابو یوسف سے امام ابوحنیفہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے

قال ابو حنیفہ صنفا ن من شر النا س بخر اسان الجھمیة والمشبھة یعنی حضرت امام ابوحنیفہ فرماتے تھے کہ خراسان کا دو گروہ لوگوں میں سب سے بدترین گروہ ہے ایک جہمی فرقہ دوسرا مشبہ کا فرقہ، نیز خطیب ہی عبدالحمید بن عبدالرحمٰن حمانی سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ جہم بن صفوان کو کافر کہتے تھے اس کے باوجود خطیب نے امام ابوحنیفہ پر ان کے شاگرد رشید امام ابو یوسف کے واسطہ سے جہمی ہونے کا الزام تھوپا ہے گویا خطیب نے شرم وحیا کو بالکل بالائے طاق رکھ دیا ہے کیا خطیب کو امام ابوحنیفہ کی کتاب الفقہ الا کبر کا بھی مطالعہ کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا جس میں انہوں نے فرقہ جہمیہ اور تمام باطل فرقوں کا زبردست رد کیا ہے۔

اسی طرح بہت سی روایتوں سے امام ابوحنیفہ کی مرجی اور رأس المرجہ ثابت کیا ہے۔ یہ تمام روایتیں باطل سندوں سے ہیں، علامہ زاہد الکوثری نے خطیب کی ایک ایک روایت کا بھرپور جائزہ لے کر باطل ہونا ثابت کیا ہے۔

البتہ یاد رہے کہ ارجاء کی دو قسم ہے ایک ارجاء سنی اور دوسری ارجاء بدعی سنی ارجا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اعمال میں کوتاہی سے انسان ایمان اور اسلام سے نہیں نکلتا ہے، مگر اس کو گناہ ہوتا ہے اور بدعی ارجاء یہ ہے کہ اعمال کو گناہ اور ثواب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا ہے

،ارجاء کی پہلی قسم تمام اہل سنت کا مذہب ہے(۱) محفوظ ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا ہے۔

اور دوسری قسم یعنی عمل کی کوتاہی سے انسان گناہ گار بھی نہ ہو یہ اہل باطل کا مسلک ہے۔امام ابوحنیفہ پر ارجاء کاالزام رکھنے والے اس فرق کو یاتو سمجھ نہیں پائے ہیں یا سمجھ کر نادان بنتے ہیں،اور جس ارجاء کے امام صاحب قائل نہیں ہیں خوامخواہ کا وہی ارجاء ان کے سر تھوپتے ہیں۔

حافظ ابن عبدالبر نے امام پر اس طرح کے تمام الزامات کا انکار کر کے صاف صاف اپنی کتاب الانتقاء میں لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مسلک وہی تھا جو کہ تمام اہلسنت والجماعت کا مسلک تھا(الانتقاء ص ۱۶۵)

بعض باتیں تو خطیب بغدادی کی بہت ہی عجیب وغریب ہیں جن سے ان کی دیانت وثقاہت سخت مجروح ہو جاتی ہے،مثلاً انہوں نے ایک روایت نقل کی ہے کہ سلمہ بن عمرو قاضی نے بر سر منبر کہا کہ لارحم اللہ اباحنیفة فانہ اول من زعم ان القرآن مخلوق ۔یعنی اللہ امام ابوحنیفہ پر رحم نہ کرے یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قرآن کو مخلوق قرار دیا،اصل میں مارحم اللہ اباحنیفة نہیں تھا بلکہ مارحم اللہ ابافلان تھا جیسا کہ تاریخ ابن عساکر میں موجود ہے خطیب بغدادی کی روایت میں اس کو مارحم اللہ ابا حنیفة بنا

---

(۱) خواہ اس کا بخاری جیسے لوگ زبان سے اقرار نہ کریں مگر عملاً واعتقاداُوہ بھی اس کے قائل ہیں کہ عمل کے نہ ہونے سے ایمان نہیں جاتا ہے سنجیدہ علما غیر مقلدین کا بھی یہی مذہب ہے،حافظ ابراہیم سیالکوٹی تحریر فرماتے ہیں بعض مصنفین نے سیدنا امام ابوحنیفہ کو بھی رجال مرجہ میں سے شمار کیا ہے حالانکہ آپ اہلسنت کے امام ہیں اور آپ کی زندگی اعلیٰ درجہ کے تقویٰ اور تورع پر گزری جس سے کسی کو بھی انکار نہیں تاریخ اہل حدیث ص ۱۵۶ اگر عمل کی کوتاہی کی وجہ سے آدمی کو ایمان سے خارج قرار دیا جائے جیسا کہ خارجیوں کا مذہب ہے تو پھر کوئی مسلمان مومن کہلانے کا مستحق بہت مشکل سے ہوگا اسلئے کہ عمل میں کوتاہی سے کوئی

دیا گیا۔خطیب کو یہ کہاں سے معلوم ہو گیا کہ ابافلان وہ ابوحنیفہ ہی ہیں پھر یہ کہ ملل ومذاہب کے بیان میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں سب میں یہ ہے کہ قرآن کے مخلوق ہونے کا قول سب سے پہلے جعد بن درہم نے ایجاد کیا ہے،پھر اس مذہب کو جہم بن صفوان نے خوب پھیلایا اسی وجہ سے اس فرقہ کے لوگوں کو جہمیہ کہا جاتا ہے،پھر اس کو آگے بڑھانے میں بشر بن غیاث کا ہاتھ تھا۔حافظ لاکائی نے اپنی کتاب شرح السنہ میں لکھا ہے کہ اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ ان اول من قال القرآن مخلوق الجعد بن درھم فی سنة نیف وعشرین ومأة یعنی سب پہلے القرآن مخلوق کہنے والا شخص جعد بن درہم ہے جس نے اس قول کا ۱۲۰ھ میں اختراع کیا(خطیب واثرہ فی علوم الحدیث ص ۳۲۲)القرآن مخلوق والی بات کو بھی متعدد سندوں سے خطیب نے ذکر کیا ہے اور سب میں نا قابل اعتبار راوی ہیں ڈاکٹر محمود طحان نے ایک ایک روایت کی حقیقت کو واضح کر دیا ہے(دیکھو ص ۳۲۲ وبعدہا)

ان چند باتوں سے تاریخ خطیب میں مذکور ان تمام روایتوں کی حقیقت واضح ہو جاتے ہے جو امام ابوحنیفہ کے مثالب کو بیان کرتی

ہیں، اور خطیب نے جن کو مزالے لے کر ساٹھ سے زیادہ صفحوں میں نقل کیا ہے خطیب کی ان روایتوں کی حقیقت کو جاننے کے لئے جامعہ الملک الامام سعود کے استاذ الشیخ محمود الطحان کی کتاب کا مطالعہ کافی ہوگا، نیز اگر کسی کو میسر ہو تو تانیب الخطیب بھی دیکھ لے، علامہ زاہد کوثری نے ایک ایک روایت کا بخیہ ادھیڑ دیا ہے، چونکہ علامہ کوثری کا نام سنتے ہی غیر مقلدوں کو بخار آنے لگتا ہے، اس وجہ سے میں نے تعمداً ان کتابوں سے کچھ نقل نہیں کیا ہے مگر حق یہ ہے کہ یہ کتاب تحقیقات کا ایک شاہکار ہے اور خطیب کی کتاب کا اس سے بہتر اور کوئی دوسرا جواب نہیں ہے۔

افسوس ان ہی باطل روایتوں کے سہارے سلفیت کے جراثیم میں مبتلا فرقہ آج کے اس دور میں امام ابوحنیفہ پر اعتراض کرتا ہے اور ان کو اسلام سے خارج قرار دیتا ہے ان کو بدعتی بتلاتا ہے ان کی فقہ کو قیاسات ورائے کا مجموعہ قرار دیتا ہے، یہ فرقہ اپنے شیش محل سے حنفیت کے آہنی قلعہ پر بمباری کرنے کا خواب دیکھتا ہے۔

خطیب کی دیانت کا حال تو یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی تعریف میں انہوں نے جو روایتیں ذکر کی ہیں اس کو وہ غیر محفوظ قرار دیتے ہیں خواہ اس کی سند کتنی بھی مضبوط ہو، اور امام ابوحنیفہ کے مثالب کی روایتوں کو وہ محفوظ قرار دیتے ہیں چاہے ان کے راوی کذاب ہی کیوں نہ ہو ں۔ جب وہ امام ابوحنیفہ کے مناقب والی روایتیں ذکر کرتے ہیں تو اس کے راویوں پر بھی کلام کرتے ہیں اور جب ان کے مثالب والی روایتیں لاتے ہیں تو خاموشی سے گزر جاتے ہیں اور یہ نہیں بتلاتے کہ ان روایتوں میں فلاں فلاں راوی ضعیف کمزور اور غیر ثقہ ہے مثلاً انہوں نے یہ روایت ذکر کی کہ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ میری امت میں ایک شخص ہوگا جس کا نام نعمان ہوگا اور اس کی کنیت ابوحنیفہ ہوگی وہ میری امت کا چراغ ہے وہ میری امت کا چراغ ہے۔

اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد چونکہ امام ابوحنیفہؒ کی اس میں تعریف تھی تو خطیب اس پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ هو حديث موضوع تفرد بروايته البورقى وقد شرحنا فيما تقدم امره وبينا حاله

یعنی یہ موضوع روایت ہے اس کا روایت کرنے والا تنہا بورقی ہے اور ہم نے گزشتہ صفحات میں اس کا حال بیان کر دیا ہے (یعنی وہ نا قابل اعتبار راوی ہے)

اس طرح یحیٰی بن معین سے پوچھا گیا کہ کیا سفیان ثوری نے امام ابوحنیفہ سے روایت کی ہے تو انہوں نے کہا کہ ہاں اور پھر فرمایا کہ امام ابوحنیفہ حدیث وفقہ میں بہت زیادہ سچے تھے اور اللہ کے دین کے بارے میں بڑے امانت دار تھے تو یحیٰی بن معین کی یہ تعریف خطیب کو امام کے حق میں پسند نہیں آئی اور انہوں نے اس روایت پر اس طرح جرح کی کہ اس کی سند میں احمد بن عطیہ ہے جو ثقہ نہیں تھا۔

مگر جب امام ابوحنیفہ کی معائب ومثالب والی روایتیں ذکر کرتے ہیں تو خواہ وہ کتنی بھی جھوٹی روایتیں ہوں اس کے کذب اور دروغ کی طرف ادنیٰ اشارہ بھی نہیں کرتے ہیں کیا اسی کا نام دیانت وامانت ہے اور کیا اس کے بعد بھی خطیب کی شخصیت امام حنیفہ کے حق میں قابل اعتبار ہو سکتی ہے؟ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں۔

اب ایک بات عرض کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ائمہ حدیث اور کبار اہل علم کا یہ فیصلہ ہے کہ جس کی امامت حدیث وفقہ میں مسلم ہو اور جس

پرامت کا عام اعتماد ہواور جس کا ورع زہد وتقویٰ مشہور زمانہ ہو جس سے کذب و دروغ گوئی کا کبھی کوئی ثبوت نہ پایا گیا ہو اس پر کسی کی بھی جرح خواہ وہ اپنے وقت کا امام المحدثین اور امیر المومنین فی الحدیث ہی کیوں نہ ہو مقبول نہیں ہو سکتی اور اس جرح کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔حافظ ابن عبدالبر اسی بات کو اس طرح کہتے ہیں۔

والصحیح فی ھذا الباب من صحت عدالته وثبتت فی العلم امامته وبانت ثقته وعنایته بالعلم لم یلتفت فیه الی قول احدالا ان یاتی فی جرحته ببینة عادلة تصح بها جرحته علی طریق الشهادات (جامع بیان العلم)

یعنی جرح وتعدیل کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ جس کی عدالت صحیح طور پر ثابت ہو اور اس کی امامت فی العلم ثابت ہو اور اس کا ثقہ ہونا ظاہر ہو اور یہ معلوم ہو کہ اس کی علم کی طرف توجہ رہی ہے اس کے بارے میں کسی کے قول کا اعتبار نہ ہوگا الا یہ کہ وہ شخص کوئی صحیح جرح پیش کرے جس سے اس شخص کا مجروح ہونا شہادت کے طریق پر ثابت ہو جائے، یعنی اس کا قول شرعی شہادت کے معیار پر پورا اترے۔

پھر حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں۔

لایقبل فیمن اتخذه جمهور من المسلمین اماماً فی الدین قول احد من الطاعنین

یعنی جمہور مسلمین نے جس کو دین میں اپنا امام بنایا ہو اس کے بارے میں طعنہ کرنے والوں کی کوئی بات قابل قبول نہ ہوگی۔

دکتور طحان حافظ ابن عبدالبر کا یہ کلام نقل کر کے فرماتے ہیں

فابو حنیفة الذی ثبتت فی الدین امامته واشتهرت بین المسلمین عدالته وامانته وانتشرفی الاقطارعلمه ونزاهة واتبع فقهه اکثر المسلمین علی مدی القرون الی ھذا الیوم لایقبل فیه قول احد من الطاعنین ولایلتفت الی حسد الحاسدین (ص ۳۴۱ خطیب واثرہ)

تو امام ابوحنیفہ جن کی امامت دین میں ثابت ہے اور جن کی عدالت وامانت مسلمانوں کے درمیان مشہور ہے اور جن کا علم دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور جن کی فقہ کی پیروی کرنے والے صدیوں سے آج تک مسلمانوں کا اکثریتی طبقہ رہا ہے پس اس جیسے امام کے بارے میں کسی کی بھی جرح قبول نہیں کی جائیگی اور نہ حاسدوں کے حسد کی طرف متوجہ ہوا جائیگا

خطیب کے بارے میں دکتور طحان اپنی کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں بلکہ اسی پر اپنی کتاب کو ختم کرتے ہیں۔

خطیب نے امام ابوحنیفہ کے بارے میں جن کی امامت پر مسلمانوں کا اجماع ہے اس امام کے بارے میں تمام رطب ویابس کو جمع کر دیا ہے بیشک وہ اس بارے میں خطا کار ہیں وہ اس بارے میں انصاف کے راستہ سے ہٹے ہوئے اور تعصب کی راہ اختیار کرنے والے ہیں خطیب نے امام ابوحنیفہ کے بارے میں ان کی عیب جوئی کے لئے جو روایتیں نقل کی ہیں سب کی سب واہی اور کمزور سندوں والی ہیں (۱) (ص ۴۹۱)

(۱) الدکتور طحان یہ ایک غیر حنفی عالم ہیں اس وجہ سے ان کے خیالات کو بڑی اہمیت ہے انہوں نے جامعہ ازہر سے خطیب بغدادی پر پی ایچ

ڈی کی ہے ان کی پی ایچ ڈی کا یہی مقالہ جو جامعہ ازہر کے دو فاضل اساتذہ کی نگرانی میں تیار ہوا، پانچ سو صفحات سے زیادہ ایک ضخیم کتاب الخطیب البغدادی واثرہ فی علوم الحدیث کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ پھر یہ جامعہ الملک الامام سعود ریاض میں استاذ رہے ہیں خطیب کے بارے میں اتنی محقق و مفصل کتاب میرے علم میں کوئی دوسری نہیں ہے۔

ناظرین اس کو بھی دھیان میں رکھیں کہ خطیب کے قلم کا نشانہ صرف امام ابوحنیفہ ہی نہیں بنے ہیں بلکہ اکابر امت اور اجلا فقہاء ومحدثین ان کے قلم کا نشانہ بنے ہیں بلکہ ان کے قلم سے کم ہی فضلائے امت محفوظ رہے ہیں، امام مالک کو خطیب نے قلیل الحفظ قرار دیا ہے، امام حسن بصری و امام ابن سیرین کو قدریہ فرقہ میں شمار کیا ہے، مالک بن دینار کو ضعیف قرار دیا ہے سبط ابن جوزی فرماتے ہیں۔

لم یسلم منہ الا القلیل

یعنی خطیب کے قلم سے بہت ہی کم لوگ محفوظ رہے، خطیب حنابلہ کے بھی سخت دشمن رہے ہیں، اپنی اس تاریخ میں حنابلہ علماء ومحدثین کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اس کا اندازہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہوگا،

اب آخر میں اپنی بات ختم کرنے سے پہلے ان غیر مقلدین سے میں عرض کرنا چاہتا ہوں جو خطیب بغدادی کی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ہر رطب و یابس روایتوں اور قصوں کو بڑی وسعت ظرفی سے قبول کرتے ہیں اور ان جھوٹی باتوں سے اپنا ضمیر روشن کرتے اور اپنے ایمان و دینداری کو جلا دیتے ہیں، میں ان سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خطیب بغدادی کے قلم نے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو بھی نہیں چھوڑا ہے خطیب نے اپنی موضح اوہام الجمع والتفریق میں امام بخاری کی چوہتر غلطیوں کو پکڑا ہے جس سے امام بخاری کی شخصیت سخت مجروح ہوگئی ہے اور ان کے حافظہ اور تاریخ میں انکی مہارت وتبحر کے جو قصے مشہور ہیں سب پر پانی پھر گیا ہے براہ کرم غیر مقلدین حق و دیانت اور انصاف کے ساتھ کبھی اسکی طرف بھی توجہ فرمائیں واللہ الحمد اولا و آخرا وصلی اللہ علی النبی الامی الف الف تحیۃ وسلام .

محمد ابوبکر غازی پوری

مذاہب اربعہ سب برحق ہیں

گرامی قدر حضرات الاستاذ دامت براکاتہم؛

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بحمد اللہ خیریت سے ہوں اور بارگاہ وایزدی میں جناب والا کی خیریت کے لیے دست بدعا ہوں۔

حضرت والا کے سفر برطانیہ سے یہاں کے عوام وخواص بہت متاثر ہوئے مجالس میں آپ کا ذکر آتا ہے اور لوگ یاد کرتے ہیں۔

ایک طویل عرصہ کے بعد حضرت سے ملاقات کا موقع ملا شاگردی کا زمانہ تو غفلت اور کم فہمی کا تھا، اب ملاقات سے آپ کی قدر ومنزلت اور محبت میں اضافہ ہوا ایک مجلس میں حضرت نے اس مسئلہ پر وضاحت سے روشنی ڈالی تھی کہ ائمہ اربعہ میں چاروں کا مسلک ہے اس کی آنجناب نے عمدہ وضاحت فرمائی تھی مگر افسوس کہ وہ مجلس ٹیپ نہ ہوسکی، اس لیے اگر زمزم میں ایک تحریر اس پر وضاحت سے آجائے تو انشا اللہ ناظرین کے لیے بہت مفید ہوگا۔ امید ہے کہ اپنے قیمتی اوقات میں سے کوئی وقت نکال کر اس کی وضاحت فرمادیں گے اللہ کرے زمزم جاری رہے اور اس کا فیض عام رہے۔

مرغوب احمد لاجپوری ڈیوزبری ۲۳ اگست ۲۰۰۲ء

زمزم!

عزیزم سلمہ اللہ دعاخیر، آپ سے فون پر جس روز بات ہوئی تھی اس کے دو تین روز بعد ہی آپ کا خط بھی مل گیا تھا۔

سفر برطانیہ اس اعتبار سے میرے لیے بھی یادگار سفر بن گیا کہ آپ حضرات سے ایک عرصہ کے بعد ملاقات ہورہی تھی، میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، جب میں نے اپنے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد کو برطانیہ کے مختلف شہروں میں دین کے کام میں لگا ہوا پایا اور الحمد للہ ہر ایک نے اس دیار غیر میں اپنا ایک مقام بنالیا ہے سب کو دین کی فکر ہے تعلیم دعوت کے کام میں ہر یک لگا ہوا ہے، بے دینی اور بدتہذیبی کے ماحول میں سب کو اسلام کی فطری اور روشن تعلیم کو پھیلانے کا ولولہ ہے باطل سے مقابلہ کا جذبہ ہے ایک طرف الحادو عریانیت فحشاء منکرا ت کا بہنے والا سیلاب اور حکومت کی طرف سے اس کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی ہے تو دوسری طرف اسلام کے فرزند اور مجاہدین بھی اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کا عزم رکھے ہوئے ہیں اللھم انصرھم ولا تنصر علیھم۔

غیر مقلدین حضرات لوگوں میں وسوسہ پیدا کرنے کے لیے اور کم پڑھے لکھے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ چا روں مذاہب حق کیسے ہوسکتے ہیں حق تو ایک ہونا ہے، چاروں مذاہب میں مسائل کے درمیان بسا اوقات حلال حرام کا اختلاف ہوتا ہے جا ئز اور ناجائز کا اختلاف ہوتا ہے تو دونوں طرح کے مسلکوں کو حق کیسے کہا جائے گا۔

یہ شبہ اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ ان لوگوں نے حق کے معنی اور اس کی حقیقت پر غور نہیں کیا، اگر انہوں نے حق کے معنی میں اور اس کی

حقیقت پر غور کیا ہوتا تو یہ شبہ پیدا نہ ہوتا، کلمہ حق کا اطلاق دو معنوں میں ہوتا ہے کبھی تو حق کا مطلب یہ ہوتا کہ ہے کہ جو با واقعہ میں جیسی ہو اسی کے مطابق اگر کام ہو جائے یا کوئی خبر دے تو وہ کام اور وہ خبر حق کہلاتی ہے مثلاً کسی نے کہا فلاں جنگل میں آگ لگ گئی فلاں آدمی نے زہر کھا یا مگر مرا نہیں تو اگر ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہے کہ فلاں جنگل میں آگ لگی تھی یا فلاں آدمی نے زہر کھایا اور مرا نہیں تو جس نے آگ لگنے اور زہر کھانے والے کے بچ جانے کی اطلاع دی تھی کہا جائے گا کہ وہ خبر حق تھی۔

اسی طرح اگر کسی نے کہا کہ میں جمعہ پڑھ کے آیا ہوں تو اگر اس نے واقعی جمعہ کے روز جمعہ پڑھا ہے تو اس کا یہ عمل حق ہو گا۔

حق کے اس معنی کی تعبیر عربی میں اس طرح کی جاتی ہے الحق ھوالامر والکلام المطابق للواقع یعنی حق کا ایک مطلب یہ ہونا کہ کوئی بات یا کوئی خبر واقع اور نفس الامر کے مطابق ہو۔

اور کسی خبر یا کسی کلام کے حق ہونے کا ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کلام یا خبر شریعت کے حکم اور قانون کے کے مطابق ہو، خواہ نفس الامر اور واقع اس کی موافقت کر رہا ہو یا نہیں جو کام شریعت کے حکم کے مطابق ہو گا وہ حق ہو گا واقع کے مطابق ہو یا غیر مطابق یہاں واقع اور نفس الامر کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ قانون اور شرعیت اور حکم شریعت کو دیکھا جائے گا

مثلاً شریعت کا حکم یہ ہے کہ قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھی جائے لیکن اگر کوئی مسافر صحرا اور بادیہ میں ہو اور اسے قبلہ کا پتہ نہ ہو تو شریعت کا حکم ایسے شخص کے لیے ہے کہ سوچ بچار سے قبلہ کی سمت کا تعین کر کے نماز پڑھے اب اگر اس کی نماز قبلہ رخ نہ بھی ہو تو بھی اس کی نماز صحیح اور درست ہو گی اسلیے کہ اس نے جو شریعت کا حکم تھا اسے پورا کیا، اس کے ذمہ قبلہ مشتبہ ہونے کی شکل میں تحری کرنا تھا سو اس نے تحری (سوچ بچار) کر کے نماز پڑھی اس لیے اگر اس کا رخ نماز میں قبلہ کی طرف نہیں بھی تھا تو بھی اس کی نماز شرعاً حق اور درست ہے

فضا میں بدلی ہے، رمضان یا عید کی رویت عام طور پر ثابت نہ ہو پائی، اب اگر دو آدمی شہادت دیں کہ چاند ہو گیا ہے قاضی اور مفتی دیکھے گا کہ شہادت دینے والے شریعت کے قانون شہادت پر پورے اتر رہے ہیں کہ نہیں اگر پورے اتریں گے تو وہ رویت کا فیصلہ کر دے گا، اور اگر ان کی شہادت شریعت کے معیار کے مطابق نہ ہو گی تو قاضی کا فیصلہ عدم رویت کا ہو گا، اور یہی فیصلہ حق ہو گا، خواہ واقع اور نفس الامر میں چاند طلوع ہو گیا ہو۔

ایک جگہ شرعی شہادت فراہم ہو گئی ہے وہاں چاند کی رویت کا فیصلہ ہو گا اور دوسرے شہر میں چاند کی رویت کی شہادت حاصل نہ ہو سکی ہے، وہاں کا قاضی اور مفتی عدم رویت کا فیصلہ کریگا اور دونوں فیصلے ایک دوسرے کی ضد اور خلاف ہونے کے باوجود حق ہونگے اس لیے کہ دونوں فیصلہ شریعت کے حکم کی روشنی میں ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو۔

ایک شخص نے زنا کیا اور واقعی زنا کیا مگر اس کے زنا پر چار شاہدوں کی شرعی شہادت مہیا نہ ہو سکی ہے اس پر حد زنا لاگو نہ ہو گی اور نہ اس کو از روے قانون زانی کہنا درست ہو گا، بلکہ قاضی کے فیصلہ کے بعد اس کو جو زانی کہے گا وہ مجرم ہے اور اسپر حد قذف جاری ہو گی۔

حالانکہ وہ نفس الامر اور واقع میں زانی ہے، مگر یہاں نفس الامر اور واقع کا اعتبار نہ ہو گا، بلکہ شریعت کا حکم جاری ہو گا۔

چاروں مذاہب کو جو حق کہا جاتا ہے اس کی بنیاد بھی حق کے اسی دوسرے معنی پر ہے مجتہد کے ذمہ شریعت نے یہ ذمہ داری سونپی ہے

کہ وہ مسائل شرعیہ کے حل کرنے میں اپنی اجتہادی صلاحیت سے کام لے، اب اگر اس کا اجتہاد درست سمت میں ہے تو وہ بھی حق ہے اور اگر اس نے اپنے اجتہاد میں غلطی کی تو اس کی غلطی بھی حق ہے اور اس غلطی پر بھی وہ اللہ کی طرف سے ایک اجر کا مستحق ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اگر اجتہاد کرنے والے نے صواب کو پالیا تو اس کو اجر دو ہے اگر اس سے اجتہاد میں غلطی ہوگئی ہے تو بھی ایک اجر کا وہ مستحق ہے، اگر مجتہد غلطی کرنے پر بھی راہ حق وصواب سے شریعت کی نگاہ میں دور ہوتا تو شرعی طور پر وہ اجر کا مستحق کیوں ہوتا؟

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا مفتی اور معلم بنا کر بھیجا تھا تو ان سے پوچھا تھا کہ تم فیصلہ کس طرح کروگے تو انہوں نے عرض کیا تھا کہ کتاب اللہ سے، فرمایا اگر کتاب اللہ میں وہ حکم نہ ملا تو کیا کروگے تو انہوں نے کہا سنت رسول اللہ سے فیصلہ کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ حکم نہ ملا تو کیا کروگے تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اجتہد برائی میں اپنی رائے کا استعمال کروں گا۔ اجتہاد کروں گا۔ حضرت معاذ کے اس جواب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا خوش کیا کہ بلا اختیار آپ کی زبان پر اللہ کی حمد جاری ہوگئی اور آپ ﷺ نے فرمایا الحمد لله الذين وفق رسول رسول الله بمايرضى الله ورسوله ،اللہ کی تعریف ہے جس نے اپنے رسول کے قاصد کو صحیح بات کی توفیق عنایت فرمائی۔

آپ غور کریں کہ رائے سے جو بھی فیصلہ ہوگا اس میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال ہے، واقع کے مطابق ہوسکتا ہے اور واقع کے خلاف بھی ہوسکتا ہے مگر مجتہد کی ذمہ داری صرف اجتہاد کی ہے نفس الامر اور واقع کو وہ پا ہی لے، یہ اس کی ذمہ داری نہیں ہے، اس کا کام صرف منشاء شریعت پر عمل کرنا ہے اس بنا پر ہر مجتہد موفق ہوا کرتا ہے، ہر مجتہد کا فیصلہ حق ہوا کرتا ہے، خواہ ان کا فیصلہ ایک دوسرے سے ٹکراتا ہی کیوں نہ ہو۔

اور یہی وجہ ہے کہ امت کا فیصلہ ہے کہ مذاہب اربعہ اور تمام مجتہدین اہل حق ہیں ہم کہتے ہیں اور تمام مسلمانوں کا یہ مذہب وعقیدہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام برحق تھے ان کی شریعتیں برحق تھیں، حالانکہ گزشتہ شریعتوں کے احکام مختلف تھے کسی نبی کی شریعت میں سگی بہن سے نکاح جائز تھا، کسی کے یہاں یہ نکاح حرام تھا کسی مذہب میں بیویوں کے رکھنے کی مطلقا آزادی تھی کسی عدد کی تعیین وتخصیص نہیں تھی ۔کسی مذہب میں شراب جائز تھی، کسی مذہب میں غیر اللہ کو تحیۃً سجدہ کرنا جائز تھا۔

خود ہمارے مذہب میں شروع میں شراب حلال تھی، بعد میں حرام ہوئی وہ حکم بھی برحق تھا، اور یہ حکم بھی برحق ہے پہلے چار رکعت والی نماز دو کعت فرض تھی اب چار رکعت فرض ہے یہ حکم بھی حق ہے وہ حکم بھی حق تھا پہلے مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے اب کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی جاتی ہے پہلا حکم بھی برحق اور وہ نماز بھی صحیح دوسرا حکم بھی برحق یہ نماز بھی صحیح۔

غرض ان سارے اختلافات کے باوجود سارے انبیاء برحق تھے، ساری شریعتیں برحق تھیں سارے احکام برحق تھے، اس لیے کہ ان کی بنیاد اطاعت الہی اور امر الہی پر تھی۔

اسی طرح مجتہدین کا اور ان کا اختلافات کا مسئلہ ہے، چونکہ ہر مجتہد مرضی حق کا تابع ہوتا ہے حکم شریعت کا پابند ہوتا ہے، اس کا اجتہاد رضائے حق کے لیے ہوتا ہے اور شریعت کی اجازت اور حکم سے ہوتا ہے اسلیے ہر مجتہد برحق اور اس کا فیصلہ حق ہوگا۔

اور یہی وجہ ہے کہ امت کا فیصلہ ہے کہ تمام مذاہب اربعہ حق اور تمام ائمہ اہل حق ہیں کہیں آپ نے یہ نہیں سنا ہوگا کہ کسی شافعی نے امام ابوحنیفہ کو کہا ہو کہ وہ حق پر نہیں تھے کسی حنفی نے شافعی کو کہا ہو کہ وہ حق پر نہیں کسی مالکی نے امام احمد کے بارے میں یا کسی حنبلی نے امام مالک کے بارے میں یہ کہا ہو کہ یہ اہل حق نہیں تھے سب حق پر تھے اور ہر ایک اجتہاد برحق تھا، اور ان کے تمام اجتہادی مسائل برحق ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ اہل سنت اور اہل حق کا دائرہ انہیں مذاہب اربعہ میں اب منحصر ہے، ان مذاہب اربعہ سے جو خارج ہے وہ اہلسنت کے دائرہ سے خارج ہے۔

اب اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب تمام مذاہب ہی حق پر ہیں تو کسی ایک مذہب ہی کی تقلید کیوں ضروری ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ کوئی بوالہوس دین اور شریعت کو کھیل نہ بنالے، یہ زمانہ تقوی اور دینداری کا نہیں ہے اخلاص وللّٰہیت کا نہیں ہے، اگر غیر مقلدیت کی راہ کھودی جائے اور ایک امام کی تقلید سے پابندی ختم کردی جائے تو دین کا اہل اغراض اور اہل ہوا تماشا بنالیں گے، وقت ضرورت مخلصین للّٰہ کو اجازت ہے کہ دوسرے مذہب پر بھی عمل کرسکتے ہیں اور کراسکتے ہیں، مگر یہ اجازت عام طور پر سب کو نہیں دی جاسکتی ہے، یہ سطریں ایک ہی نشست میں لکھی گئی ہیں خدا کرے آپ اور دوسرں کے لیے مفید ہوں،

محمد ابوبکر غازی پوری

ایک ہی مسئلہ میں فقہاء احناف کے مختلف اقوال ہوں تو کس پر عمل ہوگا؟

مکرمی ومحترمی حضرت مدیر زمزم دام مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

چند ہفتے قبل بمبئی کا سفر ہوا تھا، وہاں جگہ جگہ زمزم کا چرچا تھا چند گھنٹے غیر مقلدین کی ایک مسجد میں رہنے کا اتفاق ہوا، زمزم کا نیا شمارہ نمبر ۳ ج ۴) وہاں کچھ لوگوں کے ہاتھ میں تھا پڑھ رہے تھے اور آپس ہی میں خوب الجھ رہے تھے ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ زمزم نے غیر مقلدین کے ذہنوں کو بھی جھنجھوڑنا شروع کر دیا ہے۔

مجھ سے ایک صاحب نے پوچھا کہ احناف کی فقہ میں ایک ہی مسئلہ میں تین تین قول ملتا ہے مثلاً امام صاحب کا قول کچھ ہوتا ہے اور امام ابو یوسف کا قول کچھ ہوتا ہے اور امام محمد کا قول کچھ ہوتا ہے اب کوئی کس پر عمل کرے؟ برائے کرم اس بارے میں کچھ تحریر فرمائیں۔

والسلام خادم نصر الدین اعظمی پونہ

زمزم!

اس طرح کے سوالات غیر مقلدین فقہ حنفی سے بدظن وبدگمان کرنے کے لیے کرتے ہیں فقہ حنفی میں جہاں ایک ہی مسئلہ میں دو تین قول ملتے ہیں وہیں کسی ایک قول کے بارے میں لکھا ہوتا ہے کہ اس پر فتویٰ ہے جس کو فقہ کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ یہ قول مفتی بہ ہے بس اختلاف کی شکل میں اسی قول پر عمل کیا جائے گا جو مفتی بہ ہوگا۔

مرض ایک ہوتا ہے اور ڈاکٹروں کا نسخہ الگ الگ ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ ایک ہی مرض میں ڈاکٹروں کی الگ الگ رائے ہے کوئی علاج کرانے سے بھاگتا نہیں ہے، جس ڈاکٹر کے نسخہ پر زیادہ اعتماد ہوتا ہے مریض اس کے مطابق علاج کراتا ہے۔

جو مسائل اجتہادی ہوں گے ان میں فکر ونظر کا اختلاف ہوگا سب کی رائے ایک نہیں ہوسکتی البتہ ماہرین شریعت اور اصحاب علم غور وفکر کے بعد کسی ایک کو ترجیح دیں گے تو ہم جیسے لوگوں کو ان کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے اسی قول کو اختیار کرنا ہوگا۔

فقہ حنفی میں اس بات کا بطور خصوص التزام کیا گیا ہے کہ مفتی بہ اقوال اور غیر مفتیٰ بہ اقوال کی صراحت کر دی گئی ہے اسی وجہ سے فقہ حنفی پر عمل کرنے میں کسی قسم کی ذہنی الجھن پیش نہیں آتی ہے۔

یہ تو آپ کے سوال کا جواب ہو گیا مگر میں سمجھتا ہوں کہ غیر مقلدین جب اس طرح کے سوالات کرتے ہیں تو ان کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھو خود احناف فقہاء میں ایک ہی مسئلہ میں کتنا اختلاف ہے اور فقہ کی کتابیں اس طرح کے اختلاف سے بھری ہیں تو اب ایسی فقہ کا کیا اعتبار، کیوں نہ براہ راست کتاب وسنت سے مسئلے معلوم کر لئے جائیں یعنی غیر مقلدین اس قسم کے سوالات قائم کر کے عوام میں فقہ اور فقہاء سے بدگمانی پیدا کرتے ہیں۔

لیکن ان مسکینوں کو پتہ نہیں ہے کہ فقہ میں جتنا اختلاف ہے اس سے کہیں زیادہ اختلاف حدیث میں ہے، اگر آدمی ماہرین کا فیصلہ نہ قبول کرے صرف اختلاف دیکھ کر گھبرا جائے تو ہزاروں حدیثوں کو چھوڑنا پڑے گا، فقہاء کا اختلاف تو نظری چیزوں میں ہوتا ہے یعنی ایسی جگھوں پر جہاں غور فکر اور عقل ورائے کی ضرورت پڑتی ہے اور فکر ورائے والی چیزوں میں اختلاف کا پیدا ہونا فطری بات ہے مگر محدثین جو احادیث نقل کرتے ہیں اور جن سے احادیث کرتے ہیں ان کا تعلق صرف نقل روایت سے ہوتا ہے رائے اور عقل کا دخل نہیں ہوتا ہے اس کے باوجود محدثین کے اقوال اور ان کی احادیث میں اتنا اختلاف ہوتا ہے کہ احادیث اور ان سے متعلقہ فنون کیا کتابیں مثلا اسماء الرجال اصول حدیث وغیرہ کی کتابیں اختلاف کا جنگل نظر آتی ہیں مگر غیر مقلدین کو فقہا کا اختلاف تو قابل اعتراض نظر آتا ہے لیکن محدثین کے اختلافات کا جنگل ان کو نظر نہیں آتا مثلا اسی بات کو لیجئے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف انتقال کے وقت کتنے سال کی تھی؟ تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ کی عمر ساٹھ سال کی تھی (توفاہ اللہ علی راس ستین سنہ) اور حضرت انسؓ ہی کی دوسری حدیث میں ہے کہ آپ کی عمر ترسٹھ سال کی تھی، توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو ابن ثلاث وستین سنۃ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف باسٹھ سال کچھ مہینہ کی تھی، وتوفی وھو ابن ثنتین وستین سنۃ واشھر.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ساٹھ سال کی تھی وتوفی وھو ابن ستین سنۃ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پینسٹھ سال کی تھی، (توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو ابن خمس وستین سنۃ).

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی بھی ایک روایت اس طرح کی ہے اور انہیں سے ایک روایت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریف عمر ترسٹھ سال کی تھی قبض وھو ابن ثلاث وستین سنۃ (۱)

غرض آنخضوا کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے بارے میں کوئی ایک قطعی بات نہیں ہے کہ آپ کی عمر وفات کے وقت کتنے سال کی تھی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے ساٹھ سال بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے باسٹھ سال بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ باسٹھ سال کچھ مہینے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ترسٹھ سال اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف پینسٹھ سال کی تھی۔

کہا جاتا ہے اور صحیح کہا جاتا ہے کہ محدثین نے احادیث کے بارے میں بڑی چھانٹ بھٹک کی ہے اس بڑی چھانٹ بھٹک کا نتیجہ ناظرین دیکھ رہے ہیں کہ محدثین یہ بھی نہیں طے کر پا رہے ہیں کہ آنخضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف وفات کے وقت کتنی تھی کیا اب ان اختلافات سے گھبرا کر احادیث کی کتابوں سے بدگمانی قائم کر لی جائے اور محدثین کے بارے میں سوء ظنی کو کام میں لایا جائے اور احادیث کا انکار کر دیا جائے؟

براہ کرم غیر مقلدین فرمائیں تو سہی کہ آخر کیا کیا جائے۔

ایسی شکل میں عقل سلیم کا فیصلہ ہوگا کہ دیکھو ماہرین کا کیا فیصلہ ہے وہ کیا کہتے ہیں اب فن حدیث کے ماہروں کا جو فیصلہ ہوگا اس کو قبول کیا جائے گا یہاں ایرے غیرے نتھو خیرے کی بات نہیں چلے گی، تو اب سنئے کہ علم حدیث کے ماہروں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے بارے میں کیا فیصلہ فرمایا ہے اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر وفات کے وقت ترسٹھ سال کی تھی حافظ ابن عبدالبر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

(۱) تفصیل کے لیے حافظ ابن عبدالبر کی کتاب التمہید جلد ثالث ملاحظہ فرمائیں

عن عائشہ :قالت توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو ابن ثلاث وستین .

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ترسٹھ سال کی تھی۔

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں ھذا صح شئی جاء فی ھذا الباب یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے بارے میں یہ سب سے صحیح بات ہے۔ التمہید ص ۲۵ ج ۳

جس طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے بارے میں مختلف احادیث کے پیش نظر مختلف باتیں سامنے آئیں اور متعدد اقوال پیدا ہوئے مگر ان متعدد متعارض اور مختلف اقوال کو دیکھ کر منکرین حدیث کے سوا) کسی نے حدیث کا انکار نہیں کیا اور ماہرین کے فیصلہ پر اعتماد کیا اور ایک صحیح تر قول کو تسلیم کیا، اسی طرح کا اختلاف فقہ اور فقہاء کا ہوتا ہے ان کے اختلافات کی بنیاد کبھی تو قیاس ورائے کے الگ الگ ہونے پر ہوتی ہے اور کبھی ان کے اختلاف کی وجہ متعارض اور مختلف احادیث کا ہونا ہی ہوتا ہے تو جس طرح متعارض ومختلف احادیث کے مابین ماہرین محدثین کا فیصلہ ہی قبول کیا جائے گا، اسی طرح متعارض اقوال فقہیہ میں سے اس قول کو ترجیح دی جائے گی جس کے بارے میں فقہ کے ماہرین فیصلہ کردیں گے کہ یہ قول صحیح تر ہے اسی پر فتوٰی ہے اور میں نے عرض کیا کہ فقہائے احناف نے فقہ حنفی کے بارے میں یہ کام بڑی خوبی سے انجام دیا ہے اس وجہ سے مسائل فقہیہ پر عمل کرنے میں قطعا کوئی دشوری اور پریشانی نہیں ہے جو قول مفتی بہ ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا۔

سہو ونسیان انسان کا خاصہ ہے
اس سے کوئی فرد بشر مستثنیٰ نہیں

مکرمی حضرت مولانا غازی پوری زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج سامی بندہ بخیر ہے، امید ہے کہ جناب والا بھی بحمدہ تعالی ہر طرح خیریت سے ہوں گے غیر مقلدین حضرات عام طور پر یہ تاثر دیتے ہیں کہ بخاری شریف میں کوئی ایک حدیث ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں شک وشبہ کیا جاسکے قرآن کے بعد وہ دنیا کی صحیح ترین کتاب ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی قوت حفظ ایسی تھی کہ ان کی کسی حدیث میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے اور یہ کہ ان کا فقہ میں بھی مقام بہت بلند تھا اس لیے بخاری کو تمام کتابوں پر سبقت حاصل ہے اور امام بخاری کو تمام محدثین پر سبقت حاصل ہے اور بھی اس بارے میں ان کی بہت مبالغہ آرائیاں ہیں، ان باتوں کی حقیقت کیا ہے براہ کرم اس پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔

والسلام نظام الدین قاسمی بہرائچ

زمزم!

آپ کے اس خط میں کئی سوالات ہیں۔

(۱) بخاری شریف میں کوئی ایک حدیث ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں شک وشبہ کیا جاسکے۔

(۲) قرآن کے بعد وہ دنیا کی صحیح ترین کتاب ہے۔

(۳) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی قوت حفظ ایسی تھی کہ ان کی کسی حدیث میں غلطی کا امکان نہیں۔

(۴) امام بخاری کو تمام محدثین پر سبقت حاصل ہے۔

(۵) امام بخاری کا فقہ میں بھی بہت بلند مقام ہے۔

ان تمام باتوں پر تو خط کے جواب میں تفصیلی گفتگو نہیں کی جاسکتی ہے اس لیے مختصر ترتیب وار جواب ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) یہ کہنا کہ بخاری شریف میں کوئی حدیث ایسی نہیں کہ جس کے بارے میں شک وشبہ کیا جاسکے محض مبالغہ ہے امام دارقطنی نے بخاری کی بہت سے حدیثوں پر شک وشبہ کا اظہار کیا ہے ان کے بعض اعتراضات تو اتنے قوی ہیں کہ حافظ ابن حجر جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بہت بڑے عقیدتمند اور بہت بڑے مدافع ہیں وہ بھی ان اعتراضات کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کا جواب نہیں ہوسکا، فرماتے ہیں

منہا ما الجواب عنہ غیر متخصص (مقدمہ فتح الباری ص ۳۴۶)

امام دارقطنی کے ان اعتراضات کو حافظ ابن حجر نے نقل کر کے اس کا تفصیل سے جواب بھی نقل کیا ہے مگر بعض اشکالات کے بارے میں ان کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا اور جس نے جواب دیا ہے اس نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے ان کے

الفاظ عبارت بالا کے علاوہ یہ بھی ہیں والیسیر منہ فی الجواب عنہ تعسف

یعنی کچھ اشکالات ایسے بھی ہیں جن کے جواب میں انصاف کو کام میں نہیں لایا گیا ہے

(مقدمہ ص ۳۸۳)

یہ تو ابن حجر کا خود اعتراف ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ امام دارقطنی کے اشکالات کے جو جوابات دیئے گئے ہیں بہت سے جوابات محل نظر ہیں تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے

(۲) یہ صحیح ہے کہ امام بخاری کے بارے میں جمہور امت کا یہی فیصلہ ہے کہ قرآن کے بعد اصح ترین کتاب ہے، امام بخاری نے حدیث کی چھان بین میں بڑی محنت صرف کی ہے اور لاکھوں حدیثوں کے ذخیرہ سے اس کتاب کا انتخاب کیا ہے جس میں صرف چار ہزار کے آس پاس احادیث ان کے معیار کے مطابق قرار پائیں بخاری شریف میں مکررات کے ساتھ بقول ابن صلاح سات ہزار دو سو پچہتر حدثیں ہیں

-

(مقدمہ فتح الباری ص ۴۶۵)

لاکھوں حدثیوں کے ذخیرہ سے صرف چار ہزار حدیثوں کے انتخاب میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتنی دیدہ وری کا ثبوت دیا ہو گا اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں مگر بشر کا کوئی کام خواہ وہ کوئی بھی ہو کبھی مکمل نہیں ہو سکا ہے غلطی سہو ونسیان سے کسی انسان کا کام خالی نہیں ہو سکتا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی اس سے مستثنی نہیں ہیں۔

(۳) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کی قوت حفظ ایسی تھی کہ ان کی کسی حدیث میں غلطی کا امکان نہیں، یہ بھی مبالغہ ہے ابھی اوپر معلوم ہوا کہ امام دارقطنی نے ان کی بہت سی احادیث پر اعتراض کیا ہے ان کے بعض اعتراضات کا تعلق امام بخاری کے اوہام سے ہے امام بخاری جس زمانے میں تھے اس زمانہ میں عام طور پر محدثین کی قوت حفظ بہت زیادہ ہوا کرتی تھی امام بخاری بھی اسی صف کے آدمی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امام بخاری سہو ونسیان اور غلطی سے بالکل مبرا تھے، یہ صرف خدا کی ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، انما انا بشر انسی کما تنسون بخاری

یعنی میں بھی بشر ہی ہوں جس طرح تم لوگ بھولتے ہو میں بھی بھولتا ہوں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سہو ونسیان طاری ہو سکتا ہے تو امام بخاری یا کسی دوسرے محدث کی حقیت کیا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ذکر کرتے ہیں

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اعتکف المؤذن للصبح وبدا الصبح صلی رکعتین خفیفتین قبل ان تقام الصلوۃ .

امام بخاری نے اعتکف کا لفظ ذکر کیا ہے جو ان کا سہو ہے یہاں سکت کا لفظ ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں والحق ان لفظ اعتکف محرف من لفظ سکت یعنی حق یہ ہے کہ اعتکف کا لفظ سکت سے محرف ہے (فتح الباری ج ۲ ص ۱۰۲)

خطیب بغدادی نے امام بخاری کے بہت سے اوہام کو اپنی کتاب المتفق والمفترق میں ذکر کیا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت ومحبت اور ان کی عظمت شان وجلالت علم اور احادیث کے بارے میں ان کی خدمات ہمیں مجبو رکر رہی ہیں کہ میں بات کو صرف اسی ایک مثال پر ختم کردوں۔

(۴) یہ کہنا کہ امام بخاری کو تمام محدثین پر سبقت حاصل ہے ان کے زمانہ کے لحاظ سے تو درست ہے لیکن اگر کوئی اس کا یہ مطلب لیتا ہے کہ امام بخاری سے متقدم جو محدثین تھے ان تمام پر بھی امام بخاری کو سبقت حاصل ہے بالکل غلط ہے امام بخاری کو ابن شہاب زہری یا امام مالک پر کون مقدم کرے گا حضرت امام احمد بن حنبل کا جو حدیث میں درجہ تھا امام بخاری کا وہ درجہ نہیں تھا اسی طرح سینکڑوں محدثین ہیں جن کو امام بخاری پر تقدم حاصل ہے ہاں امام بخاری اپنے زمانہ میں بلاشبہ امیر المومنین فی الحدیث تھے اور ان کے زمانہ میں کم ہی لوگ تھے جو ان کی مثال تھے۔

(۵) یہ کہنا کہ امام بخاری کا فقہ میں بھی بہت بلند مقام تھا، اگر اس فقہ سے مراد فقہ اصطلاحی ہے یعنی مجتہدین کی وہ قوت دراکہ اور نور بصیرت اور ملکہ استنباط جن سے کتاب وسنت سے مسائل کے استخراج میں کام لیا جاتا ہے اور نصوص کے نہ ہونے کی شکل میں حمل النظیر علی النظیر کا عمل کام میں لایا جاتا ہے جس کا نام قیاس ہے تو امام بخاری کا اس فقہ میں کوئی قابل ذکر مقام نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ مسائل خلافیہ میں ائمہ اربعہ کے ساتھ دوسرے فقہاء ومحدثین کا تو کتابوں میں ذکر ملتا ہے اور ان کا مذہب بیان کیا جاتا ہے مگر امام بخاری کی رائے یا ان کے اقوال کا کہیں ذکر نہیں ملتا ابن تیمیہ کا فتاویٰ اٹھا کر آپ دیکھ لیں ابن تیمیہ مسائل فقہیہ کے بیان میں کہیں کہیں اہل حدیث اور محدثین کا عمومی انداز میں نام تو لیتے ہیں لیکن بطور خاص امام بخاری کا کہیں ذکر نہیں کرتے، نہ اختلافی مسائل میں ان کا کوئی قول اور مذہب ذکر تے ہیں جو لوگ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو محدث سے فقیہ بنانے کی بھی کوشش کرتے ہیں وہ خود امام بخاری کے ساتھ انصاف نہیں کرتے فقہ امام بخاری کا فن اور علم نہیں تھا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ساری توجہ فن حدیث کی طرف تھی فقہاء کے درس اور ان کے حلقوں میں ان کو بیٹھنے کا موقع نہیں ملا تھا، نہ ان کی طبعیت کا میلان اس طرف تھا انہوں نے فقہ کی جو کچھ تعلیم بھی حاصل کی تھی وہ اپنے استاذ حمیدی سے حاصل کی تھی اور یہ اسی طرح کی بات ہے کہ کوئی پرواز کا فن سیکھنے کے لیے ڈاکٹر کے پاس جائے حمیدی محدث تھے فقیہ نہیں تھے کہ ان سے فقہ کا فن حاصل کیا جاتا۔

فقہ کا فن بڑا دقیق فن ہے اس میں مجتہد کو بہت سے علوم میں مہارت حاصل کرنی ہوتی ہے استاذ خاص کی تربیت وتعلیم کے علاوہ خدا کی طرف سے فقیہ کے ذہن ومزاج کی ساخت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ شریعت کے اسرار حکم تک اس کی رسائی ہوتی ہے اس کی پہنچ منشاء شر یعت تک ہوتی ہے نیز فقہ میں قیاس ورائے کا بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے اور محدثین کو قیاس ورائے سے بہت کم مناسبت رہی ہے اس وجہ سے امام بخاری کا عظیم القدر محدث ہونا تو تسلیم اور حدیث مین انکی فقہی بصیرت بھی تسلیم مگر ان کا فقیہ بایں معنی ہونا کہ وہ بھی ائمہ اربعہ یا ان کے مجتہدین تلامذہ کے صف کے آدمی تھے کوئی عقلمند اور صاحب بصیرت اور کتاب وسنت پر نظر رکھنے والا اور فقہ کے علم کا ماہر تسلیم نہیں کر سکتا اور اس سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے رتبہ اور مقام میں کوئی فرق نہیں آتا اس لیے کہ اللہ نے سب کو ہر کام کے لیے نہیں پیدا کیا ہے امام

بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہی بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے لاکھوں حدیثوں میں سے منتخب مجموعہ تیار کر دیا ہے جس کو امت میں تلقی وقبول عام حاصل ہوا اور احادیث کی موجودہ کتابوں میں سے امت نے اس کو سب سے صحیح کتاب قرار دیا۔

وکفی لہ فخر بذالک

والسلام محمد ابوبکر غازی پوری

محمد ابوبکر غازی پوری

کیا کسی فقیہ ومحدث کو ساری سنتوں کا علم تھا؟

مکرمی مولانا زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ مزاج گرامی

امید کہ مزاج اقدس بخیر ہوگا زمزم کا نیا شمارہ ملا رفع یدین والی بحث خوب ہی نہیں خوب تر ہے اللہ آپ کو صحت وعافیت کے ساتھ رکھے آپ جس انداز سے حق اور اہل حق کی ترجمانی کا کام انجام دے رہے ہیں اس کی قدر انشاء اللہ اہل علم کو بعد میں ہوگی،

ایک سوال یہ ہے کہ کیا کسی محدث یا فقیہ کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اس کو ساری احادیث اور ساری سنتوں کا علم تھا اگر کوئی محدث ایسا گزرا ہو تو براہ کرم اس کے نام سے آگاہ کریں والسلام

نظام الدین قاسمی

گونڈہ۔یوپی

زمزم

زمزم کے بارے میں قارئین زمزم کے تاثرات جان کر خوشی ہوتی ہے قارئین کی قدر دانیوں نے ہی حوصلہ دے رکھا ہے ورنہ حالات اتنے سخت ہیں اور مسائل اتنے گونا گوں ہیں کہ اب طبیعت میں جوش وولولہ باقی نہیں رہ گیا ہے طالبان کے زوال کے بعد طبیعت پر بہت اثر ہے اگر بعض بہت ہی مخصوص محبین واکابر کا زمزم کے جاری رکھنے کا اصرار نہ ہوتا تو میں نے تو زمزم کے بارے میں کچھ اور ہی فیصلہ کرلیا تھا دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اخلاص اور صدق نیت کے ساتھ کام کرنے کی توفیق عنایت فرمائے آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی محدث یا فقیہ کے بار میں اہل علم نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ اسے ساری سنتوں یا ساری حدیث کا انفرادی طور پر علم تھا یہ صحیح ہے کہ مجموعی طور پر حدیث اور سنت کا ساری ذخیرہ محفوظ ہے کسی محدث یا فقیہ سے کوئی حدیث رہ گئی تو اس کا علم دوسرے کو تھا، اس طرح پر تمام سنتیں اور تمام احادیث محفوظ ہیں مگر یہ کوئی دعویٰ کرے کہ فلاں محدث یا فلاں فقیہ کو تمام احادیث اور تمام سنتوں کا علم تھا یہ دعویٰ کرنا غلط ہوگا اور کسی محدث یا فقیہ کے بارے میں اس دعویٰ کو ثابت کرنا محال ہوگا۔

میں نے جو یہ عرض کیا ہے یہ اہل علم کے اقوال اور انہیں کے فیصلہ سے ماخوذ ہے یہ میری کوئی اپنی ذاتی رائے نہیں ہے۔

امام شافعیؒ اپنی بے نظیر تصنیف الرسالہ میں فرماتے ہیں

لانعلم رجلا جمع السنن فلم یذہب منہا علیہ شیٔ فاذاجمع علم عامۃ اہل العلم بہا اتی علی السنن

(ص ۴۲)

ہمیں معلوم نہیں ہے کہ کسی آدمی نے تمام سنتوں کو اس طرح محفوظ کیا ہو کہ اس سے کچھ سنتیں رہ نہ گئی ہوں البتہ اگر عام اہل علم کی بات کی جائے تو صحیح ہے کہ سب کے علم سے کوئی سنت باقی نہیں رہی۔

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں

الاحاطة ممتنعة علی کل احد (الاستذکار ج ۱ ص ۳۶)

یعنی تمام سنتوں کا احاطہ کرنا کسی کے لئے بھی محال ہے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں

من اعتقد ان کل حدیث صحیح قد بلغ کل واحد من الائمة او اماماً معینا فهو مخطئ خطاء فاحشا قبیحاً (رفع الملام ص ۱۷)

یعنی اگر کوئی یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ ہر امام کو ہر صحیح حدیث پہنچی ہے یا کسی خاص امام کو ہر صحیح حدیث پہنچی ہے تو وہ بڑی سخت غلطی پر ہے۔

اہل علم کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ کسی امام یا محدث کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ اسے تمام احادیث اور سنتوں کا علم تھا صحیح نہیں نہ کسی امام اور محدث نے یہ دعویٰ خود اپنے بارے میں کیا ہے۔

ائمہ فقہ کے درمیان اختلاف کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ بعض احادیث کسی کے پاس تھیں اور کسی کے پاس نہیں تھیں جن کے پاس وہ احادیث تھیں انہوں نے ان احادیث کی روشنی میں مسئلہ فقہ معلوم کیا اور جن کے پاس وہ احادیث نہیں تھیں انہوں نے اس مسئلہ میں اپنے قول کی بنیاد کسی اور چیز کر بنایا اس وجہ سے اختلاف کا پیدا ہونا لازم تھا۔

البتہ جو منصب اجتہاد پر ہوتا ہے اس کے لئے بیشتر سنتوں کا علم حاصل ہونا ضروری ہے بلا اس کے وہ اجتہاد کا اہل نہیں ہوسکتا اس وجہ سے ائمہ اجتہاد اور مجتہدین کو بیشتر سنتوں اور حادیث کو علم ہونا ضروری ہے ان حضرات کی نگاہ سے بہت کم احادیث اور سنتیں اوجھل ہوتی ہیں بالخصوص ائمہ اربعہ رحمہم اللہ اسی میدان کے شہسوار تھے امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں

ولایقولن قائل من لم یعرف الاحادیث کلها لم یکن مجتهداً لانه ان اشترط فی المجتهد علمه لجمیع ماقاله النبی ﷺ وفعله فیمایتعلق بالاحکام فلیس فی ا لامة علی هذا مجتهد واماغایة العلم ان یعلم جمهور ذلک ومعظمه بحیث لایخطی علیه الا القلیل والنادر وهذا قداتفق لجمیع الائمة رضی الله عنهم (رفع الالملام ص ۱۹)

کوئی ہرگز یہ نہ کہے کہ جس کو تمام احادیث کا علم نہ ہو گا وہ مجتہد نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اگر مجتہد ہونے کے لئے تمام فعلی وقولی احادیث کے علم ہونے کی شرط لگادی جائے تو امت میں اس طرح کا کوئی مجتہد ہی نہیں ہے۔ مجتہد کے لئے زیادہ سے زیادہ یہ بات ہے کہ اسے بیشتر سنتوں کا علم ہو اور کم اور شاذ و نادر طور پر اس سے کچھ سنتیں رہ گئی ہوں اور یہ بات تمام ائمہ رضی اللہ عنہم کو حاصل تھیں۔

امید ہے کہ مذکورہ بالا سطور سے آپ کو اطمینان حاصل ہو جائے گا اور آپ اپنے سوال کا جواب پالیں گے

والسلام

محمد ابوبکر غازیپوری

نوٹ: میں نے عبارتوں کے جو حوالے دیئے ہیں اس کے لئے شیخ محمد عوامہ کی کتاب اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الائمة الفقهاء رضی الله عنهم دیکھئے۔

جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈہ کے بارے میں

راہ اعتدال

مکرمی حضرت مولانا غازی پوری صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

زمزم میں شائع ہونے والے خطوط اوران کے جوابات سے ہم نے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور کتنے ہی اشکالات واقع ہوئے ہیں اللہ آپ کو جزائے خیر دے اور زمزم کا افادہ عام کرے۔

حضرت! جھاڑ، پھونک اور تعویذ گنڈہ کے بارے میں دل میں بہت خلجان ہے کچھ لوگ اس کو ناجائز بلکہ شرک کہتے ہیں اور کچھ لوگ اس پر عمل پیرا ہیں ہمارے تمام اکابر سے بھی جھاڑ پھونک کرنا ثابت ہے براہ کرم اس سلسلہ میں جو صحیح بات ہو اس سے آگاہ فرمائیں۔

والسلام

حبیب اللہ انصاری

رسڑا، بلیا، یوپی۔

زمزم:

کوئی ایسا عمل جو اکابر واسلاف میں جن کی زندگی تقویٰ وطہارت اور اتباع سنت میں گزری ہو، رائج ہو اور اس پر ان کا عمل بھی ثابت ہو تو اس کے بارے میں شرک وحرام اور ناجائز کا حکم لگانے سے پہلے بہت سوچ وفکر اور احتیاط کی ضرورت ہے۔

آج ہم سے یہی احتیاط والی بات ختم ہوگئی ہے کسی سے سن لیا کہ فلاں بات حرام اور شرک ہے تو تذبذب میں پڑ گئے اور حقیقت جانے بغیر اکابر واسلاف کے عمل سے بدگمانی پیدا کرلی۔

اسی زمانہ میں بعض غیر محتاط مدعیان علم کے غیر محتاط رویہ اور ان کی فتویٰ بازی نے بہت سی جائز اور مشروع چیزوں کو بھی ناجائز اور نامشروع بنادیا ہے اور عوام کو اسلاف اور بزرگوں سے بدظن کرنے میں ان کے اس غیر محتاط رویہ کا بڑا عمل ودخل ہے

جھاڑ پھونک ودعا وتعویذ کے بارے میں بھی آج بڑے زور وشور کا پروپیگنڈہ ہے کہ یہ عمل غیر اسلامی ہے بلکہ بعض لوگوں نے چند احادیث کو سامنے رکھ کر اس کو شرک تک کہہ دیا ہے میرے نزدیک جھاڑ پھونک اور دعا وتعویذ کو مطلقاً حرام اور شرک بتلانا بہت بڑی جرأت کی بات ہے بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ ایسے لوگوں کا ایمان اور اسلام ہی خطرہ میں ہے اس وجہ سے کہ جو عمل رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو اور آپ ﷺ نے اس کو قولاً وفعلاً مشروع قرار دیا ہو اور صحابہ کرام کا بھی اس پر عمل رہا ہو اور وہی عمل منتقل ہوکر کے اسلاف میں رائج ہوا ہو ایسے ثابت شدہ اعمال شرعیہ پر شرک وبدعت اور حرام ہونے کا حکم لگانا ایمان واسلام کے منافی بات ہے۔

بلاشبہ بعض احادیث میں جھاڑ پھونک سے ممانعت وارد ہے لیکن اسی کے ساتھ بعض احادیث سے اس کا جواز بھی ثابت ہے

ممانعت والی احادیث تو آپ کے سامنے ہے اب آپ جواز والی احادیث بھی سن لیں۔

(۱) ترمذی شریف میں حضرت عمیر مولی ابی اللحم کی ایک حدیث ہے جس کو امام ترمذی نے حسن صحیح قرار دیا ہے۔اس حدیث کے آخر میں حضرت عمیر فرماتے ہیں کہ

عرضت علیه رقیة کنت ارقی بها المجانین فامرنی بطرح بعضها وحبس بعضها

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے جھاڑ پھونک کے وہ کلمات سنائے جن کے ذریعہ سے میں پاگلوں کا علاج کیا کرتا تھا تو آپ ﷺ نے ان کلمات میں سے کچھ نکالنے کا حکم دیا اور کچھ کو باقی رکھا۔

اگر جھاڑ پھونک مطلقاً ناجائز ہوتا تو آپ ﷺ حضرت عمیرؓ مولی ابی اللحم کو منع فرمادیتے کہ جھاڑ پھونک اسلام میں جائز نہیں ہے بلکہ یہ شرکیہ عمل

ہے اس سے باز رہو مگر آپ نے ان کو منع نہیں فرمایا بلکہ ان کے رقیہ یعنی جھاڑ پھونک کے کلمات کی اصلاح فرمائی اور ان کو جھاڑ پھونک کی اجازت دی۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں۔

وفیه دلیل علی جواز الرقیة من غیر القرآن والسنة بشرط ان تکون خالیة عن کلمات شرکیة وعما منع عنه الشریعة (تحفة الاحوذی ج۲ ص ۳۸۰)

یعنی اس حدیث میں اس کی دلیل ہے کہ جھاڑ پھونک قرآن وسنت کے علاوہ سے بھی جائز ہے بشرطیکہ وہ کلمات شرکیہ سے خالی ہو اور اسی طرح خلاف شرع باتوں سے بھی خالی ہو۔

معلوم ہوا کہ جو لوگ مطلقاً جھاڑ پھونک کو ناجائز کہتے ہیں ان کا عمل خود فرمودۂ حدیث کے خلاف ہے۔

(۲) ترمذی شریف ہی میں ہے کہ جبریل امین آنحضور ﷺ کے پاس تشریف لائے اور آپ سے پوچھا کہ کیا آپ کو تکلیف ہے آپ نے فرمایا ہاں میں بیمار ہوں تو حضرت جبریل امین نے ان کلمات سے آپ کو جھاڑ پھونکا۔

بسم الله ارقیک من کل شر یوذیک من شر کل نفس وفاسدة بسم الله ارقیک والله یشفیک (تحفة الاحوذی ج۲ ص ۱۲۶)

اس کو رقیہ جبریل کہا جاتا ہے

(۳) ترمذی شریف میں ہے کہ عبدالعزیز بن صہیب فرماتے ہیں کہ میں اور ثابت بنانی حضرت انس بن مالک کے پاس گئے ثابت نے فرمایا کہ اے ابوحمزہ (حضرت انس کی کنیت ہے) مجھے تکلیف ہے تو حضرت انس نے فرمایا کہ کیا میں تم کو انہیں کلمات سے دم نہ کردوں جن سے رسول اکرم ﷺ مریضوں کو دم کیا کرتے تھے پھر حضرت انسؓ ان کو ان کلمات سے دم کیا۔

اللهم رب الناس مذهب الباس اشف انت الشافی لاشافی الا انت شفاء لایغادرسقما(تحفة ج۲ص۱۲٦)

اس کورقیۃ النبی کہا جاتا ہے یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں اس سے بھی معلوم ہوا کہ اسلاف میں یہ بھی معمول تھا کہ اللہ والوں کے پاس لوگ جھاڑ پھونک کرانے کے لئے جایا بھی کرتے تھے۔

(۴) مؤطا امام مالک میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے پاس حضرت جعفر ابن ابی طالب کے دونوں صاحبزادے آئے تو آپ نے ان کو بہت دبلا پتلا دیکھا تو دایہ سے کہا کہ یہ بچے کیوں بہت لاغر ہیں تو دایہ نے کہا کہ حضور ان کو نظر بہت لگتی ہے اور میں نے ان کی جھاڑ پھونک اس لئے نہیں کرائی کہ معلوم نہیں کہ یہ عمل آپ کی طبیعت کے موافق ہوگا یا مخالف تو آپ ﷺ نے فرمایا استرقوا لهما یعنی ان کو جھاڑ پھونک کراؤ (التمہید ج۲ص۲٦٦)

(۵) اسماء بنت عمیس نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا کہ جعفر کے بچوں کو نظر لگا کرتی ہے کیا میں ان کے لئے جھاڑ پھونک کراؤں تو آپ ﷺ نے فرمایا نعم یعنی ہاں کراؤ۔ (ایضاً ص ۲٦۷)

(٦) انہیں سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ جعفر کے بچوں کو نظر لگتی ہے تو کیا میں ان کو دم کردوں تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کیسے دم کروگی؟ تو انہوں نے آپ ﷺ کو دم والے کلمات سنائے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کلمات سے ان کو دم کرو (ص ۲٦۸ ج۲)

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں:

وفی هذا لحدیث اباحة الرقی للعین وفی ذلک دلیل علی الرقی مما یستدفع فیه انواع من البلاء اذا اذن رسول الله ﷺ وقضیٰ به (ص ۲٦۸ ج۲)

یعنی اس حدیث میں نظر لگنے سے دم کرانے کے جواز پر دلیل ہے۔ اور اس حدیث میں اس کی بھی دلیل ہے کہ جھاڑ پھونک سے قسم قسم کی پریشانیاں اور بیماریوں سے حفاظت چاہی جاتی ہے اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے اور اس پر عمل کیا ہے۔

غرض ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مطلقاً جھاڑ پھونک کا انکار کرنا خود رسول اکرم ﷺ کے عمل اور آپ کے حکم کے خلاف ہے اب یہ کتنی خطرناک بات ہے کہ جس عمل کو رسول اللہ ﷺ مشروع فرمائیں اور اس کو کرنے کی شریعت میں اجازت ہو اس کو حرام اور شرک قرار دینے کی کوئی جرأت کرڈالے۔

اور چونکہ جھاڑ پھونک ایک مشروع عمل ہے اسی وجہ سے ہر زمانہ میں مسلمانوں کا اس پر عمل رہا ہے اور جن لوگوں نے اس پر کبھی نکیر کی تو ان کی

مسلمان والی عرفیت ہی پر حرف نشان لگ گیا کہ وہ معروف معنی میں مسلمان ہیں بھی یا نہیں حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں

فمن زعم انہ لا معنی للرقیۃ والاستعاذۃ ومنع التداوی والمعالجۃ ونحو ذلک ممایلتمس بہ العافیۃ من اللہ فقد خرج من عرف المسلمین وخالف طریقھم (التمھید ج۵ ص ۲۷۸)

یعنی جس کا زعم یہ ہے کہ جھاڑ پھونک اور تعویذ کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور علاج تک کو اس نے منع کر دیا ہے وہ مسلمان کی عادات عرف سے باہر ہے اور ان کے راستہ کا مخالف ہے۔

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں۔

وعلی اباحۃ التداوی والاسترقاء جمھور العلماء (ج۵ ص ۲۷۹)

یعنی دوا علاج اور جھاڑ پھونک کے جواز کے قائلین جمہور علماء اسلام ہیں

غرض میری سمجھ میں یہ بالکل نہیں آتا کہ جس کے جواز پر عمل رسول اور قول رسول سے دلیل موجود ہے اور جس پر صحابہ کرامؓ اور اس کے بعد کے

تمام ادوار میں مسلمانوں کا عمل رہا ہو اس عمل کو مطلقاً ناجائز کہنا کہاں سے روا ہے اور یہ ایمان کی بات ہے کہ عدم ایمان کی علامت ہے اللہ تعالیٰ ہم کو سوءِ فہم سے محفوظ رکھے۔

اب جب کہ ان احادیث سے جھاڑ پھونک کا جواز ثابت ہے تو اب یہ دیکھنا ہے کہ جن بعض احادیث میں جھاڑ پھونک سے منع کیا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔

مثلاً ابوداؤد شریف میں یہ روایت ہے **ان الرقی والتمائم والتولۃ شرک** جو لوگ جھاڑ پھونک کو ناجائز ہیں عموماً ان کی زبان پر یہ حدیث ہوتی ہے اور عوام کو ایک مشروع عمل سے بدظن کرنے کے لئے اس حدیث کا ترجمہ سنا سنا کر ان کا ذہن خراب کیا جاتا ہے اور اسلاف واکابر کے خلاف ان کے ذہنوں میں غلط قسم کے خیالات کی پرورش کی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جھاڑ پھونک کا عمل دو طرح کا ہوتا ہے ایک قسم کا عمل جائز ہے اور دوسرے قسم کا عمل ناجائز ہے جس جھاڑ پھونک سے منع کیا گیا اس سے مراد ایسے کلمات سے دم کرنا اور جھاڑ پھونک کرنا ہے جو خلاف شرع ہوں جس جھاڑ پھونک اور گنڈہ تعویذ میں شرکیہ کلمات کا استعمال ہو یا غیر اللہ سے استعانت طلب ہو اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں اور

جن احادیث میں ممانعت آئی ہے ان سے مراد اسی قسم کی جھاڑ پھونک اور دعا تعویذ ہے خود اللہ کے رسول کے فرمان سے یہ فرق ثابت ہے آپ کا فرمان تھا

لاباس بالرقی مالم یکن فیہ شرک (التمھید ص ۲۷۲ ج۲)

یعنی ایسے جھاڑ پھونک میں کوئی حرج نہیں ہے جس میں شرکیہ کلمات نہ ہوں اوپر گزر چکا ہے کہ غیر مقلدین کے مشہور معروف عالم مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب بھی کتاب وسنت کے علاوہ کلمات سے بھی جھاڑ پھونک کے حدیث کی روشنی ہی میں جواز کے قائل ہیں

پس ممانعت کا تعلق ایسے جھاڑ پھونک سے ہے جس میں ناجائز اور حرام امور کی آمیزش ہو ممانعت والی احادیث کا تعلق بھی اسی قسم کے جھاڑ پھونک سے ہے اور جن احادیث سے جھاڑ پھونک کا عمل مشروع اور جائز ثابت ہوتا ہے ان کا تعلق اس جھاڑ پھونک سے ہے جو ناجائز امور سے خالی ہوں، دونوں طرح کی احادیث اپنی جگہ پر درست اور دونوں کا محمل الگ الگ ہے۔

شیخ ابن باز رحمۃ اللہ علیہ جھاڑ پھونک کے سخت مخالف ہیں مگر ان کو

بھی جرأت نہ ہوسکی کہ بالکلیہ جھاڑ پھونک کا انکار کردیں فرماتے ہیں

قالوا وجب علی جمیع المسلمین الحذر من هذه الرقية واشباهها من الرقى المشتملة على الشرك والاكتفاء بالرقى وبالتعوذات الشرعية (مجموع فتاویٰ ص ۲۱۴ ج ۱)

یعنی مسلمانوں پرواجب ہے کہ شرک پر مشتمل دعا تعویذ سے پرہیز کریں اور شرعی دعا تعویذ پر اکتفاء کریں

غرض مطلقاً دعا تعویذ کا انکار کرنا شریعت سے ناواقفی کی دلیل ہے اس بارے میں راہ اعتدال یہ ہے کہ کتاب وسنت کے ماہرین اور تقویٰ وطہارت سے متصف اور اتباع سنت سے سرشار لوگوں پر آدمی اعتماد کرے اور جھاڑ پھونک اور جھاڑ پھونک انہیں سے کرائے بدعتی خرافاتی اور کافر ومشرک سے دعا تعویذ کرانا جائز نہیں ہے۔

اب تک کی گفتگو تو صرف جھاڑ پھونک سے متعلق تھی بعض لوگ جسم کے کسی حصہ میں تعویذ باندھتے یا لٹکاتے بھی ہیں اس کا کیا حکم ہے شیخ ابن باز تو مطلقاً اس کو حرام قرار دیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے کہ من تعلق تمیمة فقد اشرک یعنی جس نے تعویذ لٹکائی اس نے شرک کیا اور

چونکہ اس حدیث میں مطلقاً تعویذ لٹکانے کو شرک کہا گیا ہے اس وجہ سے شیخ ابن باز کے خیال کے مطابق قرآن اور غیر قرآنی مشروع اور غیر مشروع ہر طرح کی تعویذات کا لٹکانا حرام ہوگا شیخ ابن باز نے اپنے مجموع فتاویٰ جلد دوم ص ۳۸۳ وص ۳۸۴ پر مفصل گفتگو کی ہے۔

مگر میرے نزدیک شیخ ابن باز کا فیصلہ فقہ وبصیرت کا ائینہ نہیں ہے یہ محض ان کی ظاہر پرستی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب شریعت میں رسول اکرم ﷺ کے قول وعمل سے جھاڑ پھونک مشروع ثابت ہوا تو اب اس کا استعمال بجز اس کے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہو ناجائز اور اور حرام کیسے ہوگا؟ کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ کتاب وسنت سے ثابت کوئی دعا منہ سے پڑنا تو جائز ہو اور اس کا کاغذ پر لکھنا جائز ہو اور اس لکھے ہوئے دعائیہ کلمات کو گلے میں لٹکانا یا بازو پر باندھنا شرک ہو؟

دعا تعویذ کو گلے اور بازو میں لٹکانا بھی ہمیشہ سے مسلمانوں کا طریق وعمل رہا ہے اور اسلاف اس کی اجازت دیتے رہے ہیں اس لئے یہاں بھی مطلقاً تعویذ کو باندھنے یا لٹکانے کو ناجائز اور حرام نہیں کہے جائیگا بلکہ رسول اکرم ﷺ کی اس حدیث کا صحیح مورد تلاش کرنا ہوگا ماہرین شرع کے عمل کو

دیکھ کر اس کا صحیح معنی جاننے کی کوشش کی جائے گی۔

دعا وتعویذ کی مشروعیت خواہ جھاڑ پھونک کی شکل میں ہو خواہ کاغذ پر لکھ کر پلانے یا باندھنے کی شکل میں ہو یہ محض ایک ذریعہ علاج ہے یہ کوئی تعبدی عمل نہیں ہے اس لئے جس طرح عام جسمانی علاج میں جائز مختلف طرقہائے علاج کو منع نہیں کیا جاسکتا جب کہ ان کو محض ایک ذریعہ اور وسیلہ سمجھا جائے اور شافی مطلق ہونے کا عقیدہ خداوند قدوس کے لئے رکھا جائے اسی طرح اگر تعویذ اور گنڈہ کے استعمال سے خواہ باندھنے کی شکل میں ہو یا لٹکانے کی شکل میں انسان کا عقیدہ نہیں بگڑتا ہے اور باندھنے بندھوانے والا اس کو محض ذریعہ علاج سمجھتا ہے نفع اور نقصان کا اصل مالک اللہ ہی کو سمجھتا ہے تو اس طرح کا تعویذ گنڈہ عقل وشرع کی روشنی میں جائز ہوگا البتہ اگر آدمی یہ سمجھے کہ بذات خود یہ طریقہ علاج مؤثر ہے اور دعا وتعویذ ہی کو نافع اور ضار سمجھے تو جس طرح سے اس دوا کا استعمال کرنا حرام ہوگا یا اس ڈاکٹر سے علاج کرانا حرام ہوگا جس کے بارے میں کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ فی الواقع یہی دوا اور یہی ڈاکٹر شافی امراض ہے اسی طرح تعویذ وگنڈہ کا بھی استعمال کرنا جائز نہ ہوگا بلکہ حرام اور شرک ہوگا حدیث میں جس تعویذ کے لٹکانے کو شرک قرار دیا گیا ہے اس سے مراد اسی قسم کا تعویذ ہے جس کے بارے میں آدمی کا عقیدہ

فاسد ہوجائے اور اللہ کی ذات سے اعتماد اٹھ کر اسی دعا وتعویذ پر ہوجائے اگر آدمی کسی صحیح العقیدہ عالم دین اور شیوخ طریقت سے دعا وتعویذ کر رہا ہے خواہ جھاڑ پھونک کی شکل میں یا باندھنے اور لٹکانے کی شکل میں اور اس سے اس کے دین وایمان پر کوئی حرف نہیں آرہا ہے اور نہ اس کا عقیدہ بگڑتا ہے تو اس طرح کی دعا وتعویذ سے منع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے خواہ اس کا استعمال کسی بھی شکل میں ہو۔

محمد ابوبکر غازی پوری

امام بخاری مقلد تھے یا غیر مقلد

مکرمی حضرت مولانا محمد ابوبکر غازی پوری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں براہ کرم س کا جواب ضرور دیں اور یہ سمجھ کر کہ میں اہلحدیث یا سلفی ہوں سوال کو نظر انداز نہ کریں۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا سن پیدائش ۱۹۴ھ ہے اور ان کا وفات ۲۵۶ھ ہے امام بخاری کے زمانہ میں ائمہ اربعہ کے مذاہب موجود تھے تو امام بخاری نے ان میں سے کسی امام کی تقلید کیوں نہیں کی براہ کرم وضاحت فرمائیں کہ امام بخاری مقلد تھے کہ غیر مقلد امید ہے جواب باصواب عنایت فرمائیں گے۔

ایم نثار احمد سلفی گجرات

زمزم:

ہمیں آپ جیسے متلاشیان حق کے سوالات کے جوابات دینے سے بہت خوشی ہوتی ہے، سلفی یا اہلحدیث ہونا کوئی عیب نہیں ہے عیب کی بات یہ ہے کہ آدمی اہلحدیث اور سلفی نام رکھ کر ائمہ دین اور اسلاف امت کی شان میں گستاخی کرنے لگے آپ ماشاء اللہ سنجیدہ ہیں آپ کی تحریر کا انداز بتلارہا

ہے کہ آپ کا تعلق کسی اچھے اور شریف گھرانے سے ہے اگر آپ ہی جیسی روش پر تمام اہلحدیث ہو جائیں تو ہم کھلے دل سے ان کا خیر مقدم کر یں گے۔

البتہ ہمیں یہ قطعاً برداشت نہیں ہے کہ اہلحدیث اور سلفی نام رکھنے کے بعد آدمی شریفوں کی سطح سے نیچے اتر آئے اور ائمہ دین فقہائے امت اور اولیاء اللہ اور اسلاف کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنائے ان کی شان میں سخن بیہودہ بکے ہماری لڑائی اسی نوع کے اہلحدیثوں سے ہے۔

آپ کا یہ فرمانا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ائمہ اربعہ میں سے کسی کی تقلید کیوں نہیں کی اور یہ کہ وہ مقلد نہیں تھے بلکہ غیر مقلد تھے یہ آپ کی ناواقفی اور مطالعہ کی کمی کی بات ہے

آپ ہی کے بڑوں نے امام بخاری رحمہ اللہ کو مقلد لکھا ہے نواب صدیق حسن خان صاحب نے امام بخاری کو شافعی بتلایا ہے ۔(ابجد العلوم ص ۸۱۰)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی ان کو شافعی قرار دیا ہے (کشاف ترجمہ انصاف ص ٦٧) طبقات الشافعیہ میں بھی امام سبکی نے

ان کو شافعی لکھا ہے۔

کچھ لوگ امام بخاری کو حنبلی قرار دیتے ہیں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا یہی رجحان ہے فرماتے ہیں

وائمة الحدیث کالبخاری ومسلم الترمذی والنسائی وغیر ھم ایضاً من اتباعھم وممن یاخذ العلم و الفقه عنھما (فتاویٰ جلد ۲۵ ص ۲۳۲)

یعنی ائمہ حدیث جیسے بخاری مسلم ترمذی نسائی اور ان کے علاوہ کچھ دوسرے محدثین بھی امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ کے متبعین ہیں ان کا شمار بھی انہیں لوگوں میں سے ہے جنھوں نے ان دونوں سے فقہ اور حدیث کا علم حاصل کیا۔

امام ابن قیم نے بھی امام بخاری کو حنبلی بتلایا ہے (اعلام الموقعین ج ا ص ۲۲۶)

بہر حال امام بخاری خواہ امام شافعی کے متبع و مقلد ہوں خواہ امام احمد رحمہ اللہ کے متبع اور مقلد ہوں وہ تھے مقلد ہی کسی نے ان کو غیر مقلد نہیں قرار دیا اسلئے امام بخاری کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ غیر مقلد تھے بلا تحقیق بات ہوگی اور اگر زور وزبردستی سے ان کو مقلد نہیں بلکہ مجتہد قرار دیا جائے تو ایسے مجتہد تھے وہ کہ ان کی فقہی مسلک کو امت نے قبول نہیں کیا اور نہ اسلام کی تاریخ میں امام بخاری کا کوئی متبع و مقلد نظر آتا ہے امام ترمذی رحمہ اللہ علیہ امام بخاری کے خاص شاگرد تھے وہ حدیث کے سلسلہ میں تو بخاری کی رائے اور ان کا قول نقل کرتے ہیں مگر فقہی مذہب کے بیان میں ان کا کہیں ذکر نہیں کرتے یعنی خود امام ترمذی کی نگاہ میں بخاری رحمہ اللہ صرف محدث تھے فقہ میں ان کا الگ سے کوئی مذہب نہیں تھا بلکہ وہ یا تو امام شافعی کا قول اختیار کرتے ہیں یا امام احمد بن حنبل کا البتہ علم حدیث میں وہ مجتہد تھے اور ائمہ حدیث میں ان کا مقام بلند تھا۔

اور اب آخر میں بطور لطیفہ یہ بھی سن لیجئے کہ اگر آپ ان کو غیر مقلد بھی قرار دیں گے تو وہ اس زمانے والے غیر مقلد نہیں تھے اس لئے کہ اس زمانہ کے غیر مقلدوں کا مذہب یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہوگی اور امام بخاری کے یہاں ایک مجلس کی تین طلاق تین ہی شمار ہوگی آج کے غیر مقلدوں کا مذہب یہ ہے کہ حالت حیض میں جو طلاق دی جائے گی وہ واقع نہ ہوگی امام بخاری رحمہ اللہ کے یہاں واقع ہوجائے گی آج کل کے غیر مقلدین ایک ہاتھ سے مصافحہ کرتے ہیں اور امام بخاری دو ہاتھ سے مصافحہ کرنے کے قائل تھے آج کل کے غیر مقلدین تہجد اور تراویح کو ایک بتلاتے ہیں امام بخاری کے یہاں تہجد الگ اور تراویح الگ نماز تھی آج کل کے غیر مقلدین آٹھ رکعت تراویح پڑھتے ہیں امام بخاری آٹھ رکعت تراویح کے قائل نہیں تھے آج کل کے غیر مقلدین قبروں سے تبرک حاصل کرنے کو حرام کہتے ہیں اور امام بخاری رحمہ اللہ علیہ قبروں سے تبرک حاصل کرنے کے قائل تھے چنانچہ انہوں نے اپنی تاریخ کے لکھنے کی ابتداء آنحضور اکرم ﷺ کی قبر کے پاس بیٹھ کر کی امام بخاری خود فرماتے ہیں

ثم صنفت التاریخ فی المدینة عند قبر النبی ﷺ (مقدمة فتح الباری ص ۴۷۸)

یعنی میں نے اپنی تاریخ کی تصنیف کی ابتداء مدینہ منورہ میں آنحضورﷺ کی قبر کے پاس کی۔

آج کل کے غیر مقلدین بزرگوں کے تبرکات سے فائدہ اٹھانے کو حرام سمجھتے ہیں امام بخاری رحمہ اللہ علیہ کے یہاں بزرگوں کے تبرکات سے برکت حاصل کرنا جائز تھا حافظ ابن حجر لکھتے ہیں **و کان معه شئ من شعر النبی ﷺ فجعله فی ملبوسه** یعنی امام بخاری کے پاس آنحضورﷺ کا کچھ بال تھا وہ اسے اپنے لباس میں رکھتے تھے۔

غرض امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ غیر مقلد بھی ہونگے تو وہ آج والے غیر مقلد نہیں تھے ان کا مذہب آج کے غیر مقلدوں سے بالکل الگ تھا۔

محمد ابوبکر غازی پوری

کیا ابن تیمیہ تقلید کے منکر تھے؟

مکرمی حضرت مولا نامدیر زمزم مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبر کاتہٗ

طالب خیر بعافیت ہے، رد غیر مقلدیت میں آپ کی کتابیں پڑھنے کی توفیق حاصل ہوئی اور اب پابندی سے زمزم کا مطالعہ کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے ہمارے اطراف میں بہت سے لوگ غیر مقلدین کے پروپیگنڈہ سے متاثر تھے آپ کی کتابیں اور زمزم کے مطالعہ کے بعد الحمدللہ ثم الحمدللہ غیر مقلدیت کی حقیقت سے آگاہی ہوئی اور متاثرین کا تاثر
زائل ہوا لمحہ فکریہ اور سبیل الرسول پر ایک نظر بڑی دلچسپ کتابیں ہیں۔ ڈائری کا بھی جواب نہیں آئینہ غیر مقلدیت سے غیر مقلدین کے عقائد کا علم ہوا اللہ تعالیٰ آپ کو باصحت وبا عافیت اور حاسدوں کے حسد اور شر پسندوں کی شرارت سے ہر طرح حفاظت فرمائے۔

حضرت والا شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بارے میں غیر مقلدین کا کہنا ہے کہ وہ تقلید کے منکر تھے اور ان کا مذہب وعقیدہ بھی وہی تھا جو ہم اہلحدیثوں (غیر مقلدوں) کا ہے اس دعویٰ میں کتنی صداقت ہے براہ کرم اس سے آگاہ کریں

والسلام خاکسار

محی الدین چمپارن (بہار)

زمزم:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ تقلید کے منکر تھے انتہائی درجہ جہالت کی بات ہے کوئی غیر مقلد اس کو دلائل سے ثابت نہیں کرسکتا ان کے فتاویٰ کی تیس سے زائد بھی جلدیں گواہ ہیں کہ وہ شرعی وفقہی مسائل کے بیان میں ائمہ اربعہ کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں اور ان کے مذہب پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھتے ہیں یہ ضرور ہے کہ وہ کسی
ایک مذہب کے مقلد نظر نہیں آتے مگر مطلق تقلید کا انکار ان سے ثابت نہیں کیا جاسکتا فقہی مسائل میں عام طور پر وہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کا قول اختیار کرتے ہیں اور اس کا ان کو حق ہیں اس وجہ سے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ علم وفضل کے اس مقام پر تھے کہ وہ کسی ایک امام کی تقلید نہ کریں البتہ چونکہ وہ خود مجتہد مطلق نہیں تھے اس وجہ سے عام مسائل میں وہ اجتہاد سے بچتے تھے اور جہاں انہوں نے اجتہاد کرنے کی ہمت کی امت مسلمہ نے ان کا اجتہاد رد کر دیا مثلاً انہوں نے ائمہ اربعہ کے خلاف یہ اجتہاد کیا کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہی شمار ہوگی تو امت نے سوائے چند آزاد فکروں کے ان کا یہ اجتہاد رد کر دیا اور ابن تیمیہ کا یہ قول شاذ قرار پایا اسی طرح انہوں نے آنحضور اکرم ﷺ کے روضہ مبارک کی زیارت کی نیت سے سفر کرنے کو حرام قرار دیا تو امت نے اسکو بھی رد کر دیا اور ابن تیمیہ کا یہ قول نہایت قبیح قول قرار پایا حافظ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں

وھی من البشع المسائل المنقولۃ عن ابن تیمیۃ (ص ٦٦ ج ٣)

یعنی ابن تیمیہ سے جو(شاذ مسائل) منقول ہیں ان میں یہ قبیح ترین مسئلہ ہے، پھر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں

فانھا من افضل الا عما ل واجل القربا ت المو صلة الی ذی الجلا ل وان مشرو عیتھا محل اجما ع بلا نز ا ع . ایضا

یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس کی زیارت افضل اعمال میں سے ہے اور عظیم تر ثواب کا کام ہے یہ وہ عمل ہے کہ جو اللہ تعالیٰ تک بندوں کے پہنچانے کا ذریعہ ہے قبر شریف کی زیارت کا مسئلہ بلا کسی اختلاف کے اجماعی ہے۔

بہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ عموماً فقہی وشرعی مسائل میں ائمہ اربعہ کے دائرہ سے باہر نہیں نکلتے تھے اور انہیں کے اقوال میں سے کسی قول کو اختیار کرتے تھے اور اسی پر فتویٰ دیتے تھے، اور جب انہوں نے کہیں خود اجتہاد کرنے کی جرات کی تو وہ راہ صواب سے دور ہو گئے اور امت نے ان کے قول کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اندازہ لگایئے کہ اجتہاد کے دم خم کا دعویٰ کرنا کتنا مشکل ہے مجتہد ہونا بچوں کا کھیل نہیں ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو بھی یہ مقام حاصل نہیں تھا ہماری اور آپ کی کیا حقیقت ہے، ذا لک فضل اللہ یو تیہ من یشا ء ۔

غیر مقلدین حضرات ابن تیمیہ سے جو محبت کا دم بھرتے ہیں اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ جو ابن تیمیہ کے شاذ مسائل ہیں جن کو امت مسلمہ نے بالاتفاق در کر دیا ہے، یہ غیر مقلدین ائمہ اربعہ اور تمام فقہاء محدثین جو ضد میں انہیں مسائل میں ابن تیمیہ کو اپنا مقتدیٰ اور پیشوا بنائے ہوئے ہیں مثلاً غیر مقلدین کا بھی یہی مذہب کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہو گی، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت کی نیت سے سفر کرنا حرام ہے، ابن تیمیہ کا مسلک ہے کہ اللہ کے لیے جہت ہے غیر مقلدین کا بھی یہی مذہب ہے حالانکہ جمہور امت مسلمہ اس کے قائل نہیں ہیں اسی طرح کے ابن تیمیہ کے جو شاذ اور مردود مسائل ہیں غیر مقلدین کی ان مسائل میں ابن تیمیہ سے موافقت ہے ورنہ دین وشریعت کے بیشتر مسائل میں ابن تیمیہ کی راہ الگ ہے اور غیر مقلدین کی راہ الگ ہے خط کے جواب میں اس کو بہت تفصیل سے تو نہیں لکھا جا سکتا چند باتیں پیش خدمت ہیں جن سے معلوم ہو گا کہ شرعی مسائل میں ابن تیمیہ اور غیر مقلدین کا راستہ الگ الگ ہے اور غیر مقلدین کا یہ دعویٰ کہ وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے مسلک وعقیدہ پر ہیں بالکل غلط باطل اور بے بنیاد ہے دیکھئے۔

(۱) شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے نزدیک جمعہ میں اذان عثمانی سنت ہے اور اس کا منکر سنت صحابہ کا منکر ہے اور یہ اذان غیر مقلدین کے مذہب میں شرعی اور مسنون اذان نہیں ہے۔

(۲) شیخ الاسلام کے نزدیک بیس رکعت تراویح بھی مسنون بلکہ حضرت عمرؓ کے زمانے سے وہی مسنون ہے، اس لئے کہ بیس رکعت پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہو گیا تھا جب کہ غیر مقلدین کو بیس رکعت تراویح سے سخت چڑھ ہے۔

(۳) شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے نزدیک مقتدی پر جہری نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا جائز نہیں بلکہ خاموش رہنا اور کان لگا کر امام کی قرأت کو سننا واجب ہے اور غیر مقلدین کے مذہب میں جہری نماز میں بھی مقتدی پر سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔

(۴) شیخ الاسلام کے نزدیک ضرورۃ نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والوں کی نماز ہوگی اور غیر مقلدین مطلقا اس کو جائز کہتے ہیں۔

(۵) شیخ الاسلام کے نزدیک امامت کا حقدار اعلم ہے اور غیر مقلدین کے نزدیک ہر حال میں امامت کا حقدار قرآن زیادہ پڑھنے والا ہے۔

(۶) شیخ الاسلام کے نزدیک خلفائے راشدین کا عمل مسنون ہے جب کہ غیر مقلدین اس کے منکر ہیں۔

(۷) غیر مقلدین کا مذہب ہے کہ شادی کے بعد صرف خلوت صحیحہ سے مہر واجب نہ ہوگی اور ابن تیمیہ کا مذہب ہے کہ شوہر پر پوری مہر واجب ہو جائے گی۔

(۸) غیر مقلدین کا مذہب ہے ہر شخص کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور ابن تیمیہ کا مذہب ہے کہ صرف اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی جس کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کو بلا نماز دفن کر دیا گیا ہے۔

(۹) غیر مقلدین کا مذہب ہے کہ صرف دو آدمی سے ہی (ایک امام ایک مقتدی) جمعہ ہو جائے گا شیخ الاسلام کا مذہب اس کے خلاف ہے۔

(۱۰) غیر مقلدین کی کتاب عرف الجادی میں لکھا ہے کہ شراب کا سرکہ اگر خود بن گیا ہو تو جائز ہے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اس کو جائز نہیں کہتے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ خط میں زیادہ تفصیل نہیں کی جاسکتی ہے بہر حال تلک عشرۃ کاملۃ کو سامنے رکھ کر میں نے یہ دس مثالیں دی ہیں ان سے اندازہ لگائیے کہ غیر مقلدین کا یہ دعویٰ کتنا غلط ہے کہ انکا عقیدہ و مذہب وہی ہے جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا ہے۔

فقط والسلام محمد ابوبکر غازی پوری

احقر نوالدین نور اللہ الاعظمی عرض کرتا ہے کہ مولانا غازی پوری نے غیر مقلدین اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے مابین عقیدہ و مذہب کے اختلاف کی جو مثالیں دی ہیں ان میں حوالوں کا اہتمام نہیں کیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دسوں مثالوں کے حوالے ابن تیمیہ کے کلام سے درج کر دیئے جائیں مثالوں میں نمبرات کی ترتیب سے حوالوں کی ترتیب درج ہے۔

(۱) دیکھو کنز الحقائق ص ۲۶ اور ابن تیمیہ فرماتے ہیں جب حضرت عثمان نے اس اذان کو بطور سنت جاری کیا اور اس پر سارے مسلمانوں نے اتفاق کر لیا تو یہ آذان شرعی ہوگئی۔ (منہاج السنۃ ص ۱۹۳ ج ۴)

(۲) شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں لوگوں کا رمضان میں تراویح کے عدد کے بارے میں اختلاف ہے سو یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ لوگوں کو بیس رکعت تراویح پڑھاتے تھے اور تین رکعت وتر تو بہت سے علماء نے اسی کو سنت قرار دیا ہے اس لئے کہ ابی بن کعبؓ نے بیس رکعت تراویح مہاجرین اور انصار کے بیچ پڑھائی اور اس پر کسی نے انکار نہیں کیا۔ (فتا وی ج ۲۳ص ۱۱۳)

(۳) قرآن کی قطعی دلیل قائم ہے کہ نماز میں مقتدی کو کان لگا سننا اور خا موش رہنا واجب ہے (فتاوی ج ۲۳ص ۲۷۲)

(۴) دیکھو فتاوی شیخ الاسلام (ج ۲۳ص ۲۴۸)

(۵) شیخ الاسلافرماتے ہیں اگر دو آدمی ہوں اور دونوں دیندار ہوں تو ان میں سے جو کتاب سنت کا واقف کار زیادہ ہو گا امت کے لیے متعین طور پر اسی کو مقدم کیا جائے گا۔ (فتاوی ج ۲۳ص ۲۴۱)

(۶) ابن تیمیہ فرماتے ہیں

فسنة الخلفائے الر اشدین ھی مما امر الله به ورسوله علیه ادله شـرعیة کثیـرة(فتـاویٰ ج۴ص ۱۰۷)

یعنی خلفائے راشدین کی سنت وہ چیز ہے جس کا حکم خدا اور سول نے دیا ہے اور اس پر بہت سے شرعی دلائل قائم ہیں۔

(۷) نواب صاحب بھوپالی فرماتے ہیں نیست دلیل بر وجو ب مهر کا مل بمجر د خلو ت ـو تمسك بغیر دلیل حلا ل نیست عرف الجا وی ص۱۰٦)

یعنی اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ محض خلوت کی وجہ سے کامل مہر واجب ہو گی اور بلا دلیل بات سے استدلال کرنا اور تمسک کرنا یہ حلال نہیں ہے۔

اور ابن تیمیہ فرماتے ہیں

بل علیه کمال المھر کما قال زرار ة قضی الخلفائے الرا شد ون ولا عمة مھدویون (فتاویٰ ج۲۳ ص ۱۹۷)

یعنی شوہر پر کامل مہر واجب ہو گی جیسا کہ خلفائے الرشیدین اور ائمہ نے اسی پر فیصلہ کیا ہے۔

(۸) ابن قیم شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے نقل کرتے ہیں سچ بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایسے شہر میں فوت ہو جہاں اس کا جنازہ نہیں پڑھا گیا تو اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی .... البتہ جن کا نماز جنازہ پڑھا جا چکا اس کی غائبانہ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی ،(جلد ۱ص ۵۲۰ زادلمعاد)

(۹) دیکھو فتاوی جلد ۲۴ص ۱۷۸

(۱۰) عرف الجاوی میں ہے سر که سا ختن خمر نا رواست اگر از کو د سر که گر دجا ئز باشد ص ۱۰ یعنی شراب کا سر که بنانا جائز نہیں لیکن اگر شراب خود سر کہ ہو جائے تو جائز ہو گا۔

اور ابن تیمیہ فرماتے ہیں

قیل لا یجو ز بحا ل هذا وهذ هو الصحیح

(فتاویٰ ج ۲۱ ص ۴۸۳)

یعنی شراب کے سر کہ کہ سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ وہ کسی صورت میں جائز نہیں اور یہی صحیح ہے۔

نورالدین نوراللہ الاعظمی

احادیث بخاری شریف
پرعمل کے بارے میں

مکرمی مولانا محمد ابو بکر صاحب غازی پوری مدظلہ

سلام مسنون!

بخاری شریف کے بارے میں آتا ہے کہ وہ سب سے صحیح احادیث کی کتاب ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ احناف بخاری شریف کی بہت سی احادیث پر عمل نہیں کرتے اس کی وجہ کیا ہے؟ اہلحدیث حضرات عوام کو گمراہ کرتے ہیں کہ حنفیوں کا بخاری پر عمل نہیں ہے ہم ان کو کیا جواب دیں آپ اس کا جواب مرحمت فرمائیں

والسلام

شیخ احمد کرلا ویسٹ بمبئی

زمزم!

آپ فرماتے ہیں کہ اہلحدیث حضرات عوام کو گمراہ کرتے ہیں کہ حنفیوں کا عمل بخاری پر نہیں ہے، میرے بھائی گمراہ کرنا شیطان کا کام ہے اس سے آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں جب محسوس ہو کہ کوئی شیطان گمراہ کرر ہا ہے تو لاحول پڑھ دیں لاحول پڑھنے سے شیطان بھا گتا ہے۔

غیر مقلدین کا جواب دینا بہت آسان ہے آپ ان سے پوچھیں کہ کیا ان کا عمل بخاری شریف کی تمام احادیث پر ہے؟ وہ جواب میں ہاں یا نہ نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ خود ان کا عمل بخاری کی تمام احادیث پر نہیں ہے،

تو پھر یہ الزام کہ احناف بخاری شریف کی تمام احادیث پر عمل نہیں کرتے خود غیر مقلدین کے جواب سے جاتا رہے گا۔

میں چند مثالیں لکھتا ہوں آپ کسی غیر مقلد سے معلوم کریں کہ بخاری کی ان احادیث پر عمل کیوں نہیں ہے؟

(۱) بخاری شریف کی روایت ہے الغسل یوم الجمعة واجب علی کل محتلم یعنی جمعہ کے روز ہر بالغ پر غسل کرنا واجب ہے (حدیث میں جمعہ کے لیے نہیں بلکہ جمعہ کے دن ہر بالغ پر خواہ مرد ہو یا عورت غسل واجب ہونا مذکور ہے)

کیا غیر مقلدین کا اس حدیث پر عمل ہے اور ان کا یہی مذہب ہے کہ جمعہ کے روز ہر بالغ پر غسل ضروری ہے خواہ مرد ہو خواہ عورت۔

(۲) بخاری شریف کی روایت ہے اذا اشتد الحر فا بردوا با الصلوٰۃ یعنی جب سخت گرمی کا زمانہ ہو تو ظہر کی نماز ٹھنڈی کر کے پڑھو، آنحضور ﷺ کا فرمان تو یہ ہے اور غیر مقلدین کا عمل یہ ہے کہ وہ مئی جون میں بھی زوال کے فوراً بعد نماز پڑھتے ہیں۔

(۳) بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے فرماتی ہیں،

رکعتان لم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ید عھما سراً و لا علا نیۃً رکعتا ن قبل الصبح ور کعتا ن بعد العصر .

یعنی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعتیں کسی حال میں بھی نہیں چھوڑتے تھے، صبح کی نماز سے پہلے کی دو رکعت اور عصر کی نماز کے بعد دو رکعت۔

کیا جن کو آپ اہلحدیث کہہ رہے ہیں ان کا اس حدیث پر عمل ہے؟

(۴) بخاری شریف میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے پہلے سونے کو اور عشاء کی نماز کے بعد بات کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔

کا ن یکر ہ النوم قبلھا و الحدیث بعد ھا .

کیا بخاری کی اس حدیث پر کسی غیر مقلد کا عمل ہے اور عشاء بعد بات کرنا اس کے نزدیک حرام ہے؟

(۵) بخاری کی حدیث ہے روایت کرنے والے مالک بن حویرث ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ

اذاحضرت الصلو ۃ فا ذناو اقیما ثم لیو مکما اکبر

کما

یعنی جب نماز کا وقت آئے (اور دو آدمی ہوں) تو تم دونوں آذان کہو تم دونوں اقامت کہو پھر جو بڑا ہو وہ امامت کرے۔

کیا غیر مقلدین کا یہی مذہب ہے کہ دو مصلی ہونے کی صورت میں دونوں اذان کہے دونوں اقامت بھی کہیں گے اور امام عمر میں جو بڑا ہو گا وہی ہو گا۔

(۶) بخاری شریف میں ہے

اذا قمت الی الصلو ۃ فکبر ثم اقرا ما تیسرا معک من القرآن یعنی جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تکبیر کہو پھر قرآن میں سے جو تمہیں یاد ہو پڑھو۔

آنحضور ﷺ تو فرمائیں کہ تمہیں جو قرآن یاد ہو وہ پڑھو اور غیر مقلدین کہتے ہیں کہ نہیں سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی کیا اسی کا نام بخاری کی حدیث پر عمل ہے۔

(۷) بخاری شریف میں ہے کہ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ن یقرأ فی الظھر فی الا ولین با م الکتا ب وسورتین

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور دو سورتیں پڑھتے تھے اور غیر مقلدین کہتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ پڑھنا تو فرض ہے مگر دونوں سورتوں کا پڑھنا فرض نہیں ہے بخاری کی اس حدیث میں جب یہ تفصیل نہیں ہے تو غیر مقلدین نے اپنی طرف سے

یہ تفصیل کیوں کی، کیا اسی کا نام بخاری کی حدیث پر عمل کرنا ہے۔

(۸) بخاری شریف میں ہے المصا فحۃ با لید ین یعنی مصافحہ دونوں ہاتھ سے کرنا ہے اور امام بخاری نے دونوں ہاتھ سے مصافحہ والی حدیث بھی پیش کی ہے مگر غیر مقلدین کہتے ہیں کہ نہیں مصافحہ ایک ہاتھ سے ہوگا۔

(۹) بخاری شریف میں ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق تین ہی ہوگی اور اس مسئلہ کو بخاری نے متعدد حدیثوں سے ثابت کیا ہے مگر غیر مقلدین بخاری شریف کی ان تمام روایتوں کو نہیں مانتے پھر بھی کہیں کے ہم بخاری والے ہیں۔

(۱۰) امام بخاری نے باب قائم کیا ہے با ب وجو ب القراۃ للا ما م والما موم یعنی اس کا بیان کہ مقتدی اور امام کو قرأت کرنی ضروری ہے اور پھر حدیث ذکر کرتے ہیں

لا صلو ۃ لمن لم یقرأ بفا تحۃ الکتا ب

یعنی اس کی نماز نہیں جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی۔

بخاری اس حدیث سے مطلقا قرأت کی فرضیت ثابت کرتے ہیں اور غیر مقلدین کہتے ہیں کہ نہیں اس حدیث سے صرف سورۃ فاتحہ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے آپ غیر مقلدین سے پوچھیں کہ امام بخاری سے یہ ان کی موافقت ہے یا مخالفت (۱)

(۱) غیر مقلدین بخاری کی ان احادیث کے بارے میں یا تو تاویل کی راہ اختیار کریں گے یا صاف صاف کہہ دیں گے کہ ہم امام بخاری کے مقلد نہیں ہیں مگر عوام کو بھڑکانے کے لیے احناف کے بارے میں کہیں گے کہ ان کا عمل بخاری پر نہیں ہے یہ ہے ان حضرات کا انصاف

بات اصل یہ ہے کہ غیر مقلدین بخاری کا نام لے کر صرف عوام کو بھڑکاتے ہیں یہ حضرات عوام کو صحیح صورت حال سے باخبر نہیں کرتے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ امام بخاری ہوں یا کوئی اور محدث اس کے نز
دیک جو حدیث قابل ذکر نظر آئی اس نے اس کو اپنی کتابوں میں درج کرلیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حدیث کے نام پر جو چیز بھی حدیث کی کتابوں میں مذکور ہوگئی ہے اس پر عمل کرنا یا اس کے ظاہر پر عمل کرنا ضروری ہے احادیث پر عمل کرنے کے لیے بہت سی چیروں کو دیکھنا ہوتا ہے اور یہ کام فقہا کا ہے اسی وجہ سے کبھی کوئی حدیث خواہ بخاری ہی میں کیوں نہ ہو فقہاء کے نزدیک عملا قابل قبول نہیں ہوتی ہے یا اس کے ظاہر پر عمل کرنا انکے نزدیک ضروری یا جائز نہیں ہوتا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ان کو ان کی شرطوں کے مطابق جو حدیث مل گئی اور اس کی صحت کا ان کو اطمینان ہوا

انہوں نے بخاری میں اس کو لکھ لیا امام بخاری صرف سند کو دیکھتے ہیں فقہاء سند کے علاوہ حدیث پر عمل کرنے کے لئے اور بہت سی چیزوں کا لحاظ کرتے ہیں، صرف سند کا لحاظ کرنے سے کبھی کبھی بڑی پیچیدہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے مثلا دیکھئے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ذکر کرتے ہیں۔

قال جائت امر أة من الا نصا ری الی النبی صلی

الله علیه وسلم فخلا بها فقال ان کن لا حب النا س الی .

حضرت انس فرماتے ہیں کہ انصار کی ایک عورت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی تو آنحضورﷺ اس کے ساتھ تنہائی میں ہوئے پھر آپ نے فرمایا اے عورت تم لوگ لوگوں میں سب سے زیادہ مجھے محبوب ہو۔

چونکہ یہ حدیث امام بخاری کے شرطوں کے مطابق صحیح تھی اس وجہ سے انہوں نے اس کو ذکر کر دیا آپ غور فرمائیں کہ اگر اس حدیث کے صرف ظاہر ہی کو دیکھا جائے تو اس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے۔اور آدمی اس حدیث کو بنیاد بنا کر اجنبیہ عورت کیساتھ تنہائی میں رہنے کو جائز قرار دے گا، جب کہ یہ قطعاحرام ہے اس طرح کے نازک موقع پر فقہاء سامنے آتے ہیں اور وہ جو مطلب بیان کریں گے اس پر عمل کرنا ہوگا بخاری کی ظاہری حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا

اسی طرح بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے سلسلہ میں تین طرح کی حدیثیں ذکر کی ہیں ۶۰ سال والی حدیث ۶۳ سال والی حدیث ۶۵ سال والی حدیث چونکہ یہ تینوں حدیثیں ان کی شرطوں کے مطابق تھیں انہوں نے اس کو ذکر کر دیا مگر اس سے جو پیچیدگی پیدا ہوئی

امام بخاری کو اس کا احساس نہیں ہوا اب آپ سوچیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ تینوں باتیں صحیح ہوں ہرگز نہیں ان تینوں میں ایک ہی بات صحیح ہوگی

۔

میں نے ان دو مثالوں سے یہ بتلایا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح بخاری میں کسی حدیث کا ہونا یہ اس کی دلیل تو ہے کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے مگر یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جو حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہو اس پر عمل بھی ضروری ہو یا حدیث میں جو بات ہے وہ فی الواقع بھی صحیح ہو اس کا احساس محدثین کو بھی ہوا اسی وجہ سے انہوں دو قاعدے بتائے ایک یہ کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہو وہ متن کے اعتبار سے بھی صحیح ہو دوسرا قاعدہ یہ بنایا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہو وہ متن کے اعتبار سے بھی ضعیف ہو یعنی نہ یہ ضروری ہے کہ ہر صحیح حدیث قابل عمل ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر ضعیف حدیث قابل رد ہے۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ نے دین کی جو سمجھ اور جو دین کا شعور عطا فرمایا تھا اس کا ادراک ہمارے اور آپ کے بس کی بات نہیں ہے امام شافعی رحمۃ اللہ نے یوں ہی نہیں فرمایا تھا کہ سارے لوگ فقہ امام ابو حنیفہ کے محتاج ہیں حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے کسی فقہی

مسئلہ کے سلسلہ میں صرف صحیح حدیث پر مدار نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اس کے ساتھ بہت سی چیزوں کو بھی دیکھتے تھے اور پھر ان تمام چیزوں کی رعایت کے ساتھ فقہی مسائل میں بہت جچی تلی رائے ظاہر کرتے تھے،

آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ سے اولی کیا ہے؟ اس میں سب کا اتفاق ہے کہ آمین زور سے بھی کہی جاسکتی ہے اور آہستہ سے بھی مگر اولویت میں اختلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ آہستہ آمین کہنے کو اولی قرار دیتے ہیں جب کہ بخاری رحمۃ اللہ کا مذہب جہر کا ہے یعنی ان کے یہاں اولی یہ ہے کہ آمین امام اور مقتدی زور سے کہیں، امام بخاری نے اس بارے میں جو حدیث پیش کی ہے وہ یہ ہے۔

اذاا من الا مام فامنو فا نه من وافق تا مينه تا مين الملا ئكة غفر له ما تقد م من ذ نبه اذقال الا م غير مغضو ب عليهم ولا لضا لين فقو لو آ مين فا نه من وافق قوله قو ل الملا ئكة غفرله ما تقد م من ذ نبه .

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو اسلئے کہ جس کی آ
مین ملائکہ کی آمین سے موافقت کریگی اسکی گزشتہ کی گناہیں معاف ہو جائیں گی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب امام غیر المغضوب علیہم والا الضالین کہے تو تم آمین کہو اسلئے کہ جس کا آمین کہنا ملائکہ کے آمین کہنے سے موافق ہوگا اس کی گزشتہ تمام گناہیں معاف ہو جائیں گی۔

یہ دونوں حدیثیں ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں اور یہ اصلا دو حدیث نہیں ہیں بلکہ فی الاصل ایک ہی حدیث ہے صرف بعض الفاظ کا تغیر ہے محدثین کے یہاں اس طرح کے تغیرات سے ایک حدیث کئی حدیث بن جاتی ہے آپ پہلی حدیث میں غور فرمائیں تو اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم مروی ہے کہ جب امام آمین کہے اس وقت تم بھی یعنی مقتدی آمین کہیں جبکہ دوسری روایت میں ہے کہ جب امام ولا الضالین کہے تو اس وقت مقتدی آمین کہے دونوں روایت میں مقتدی کے آمین کہنے کی جگہ الگ الگ بتلائی گئی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ اس ختلاف کے باجود دونوں روایت پر عمل ہو سکے گا۔

محدثین کے یہاں اس طرح کے تغیرات سے ایک حدیث کئی حدیث بن جاتی ہے اب آخر میں یہ بھی جان لیجئے کہ غیر مقلدین کا عمل جہا
ں بخاری شریف کی بہت سی حدیث کے خلاف ہے اسی طرح بہت سے مسائل میں بخاری کا مذہب الگ ہے اور غیر مقلدین کا مذہب الگ ہے مثلا۔

(۱) جو طلاق حیض کی حالت میں دی جائے بخاری کے مذہب میں وہ واقع ہو جاتی ہے غیر مقلدین کہتے ہیں کہ جو زمانہ حیض میں طلاق دی جائے گی وہ واقع نہیں ہوگی۔

(۲) امام بخاری کا مذہب ہے کہ بسم اللہ ہر سورت کا جز نہیں ہے غیر مقلدین کہتے ہیں کہ بسم اللہ ہر سورت کا جز ہے۔

(۳) بخاری کا مذہب ہے کہ آدمی احرام کی حالت میں نکاح کر سکتا ہے غیر مقلدین کا مذہب کہ نہیں کر سکتا۔

(۴) امام بخاری کا مذہب ہے کہ حج اور عمرہ کا احرام میقات سے باندھنا چاہیے میقات سے پہلے باندھنا جائز نہیں غیر مقلدین کے نزدیک جائز ہے۔

(۵) امام بخاری کا مذہب ہے کہ روزانہ ایک ختم قرآن کرنا جائز ہے بخاری کا اس پر عمل تھا اور غیر مقلدین کا مذہب ہے کہ تین دن سے کم میں قرآن کا ختم کرنا مکروہ ہے نواب وحیدالزمان غیر مقلد فرماتے ہیں کہ اہلحدیث نے
اس کو مکروہ جانا ہے اور یہ ادب کے خلاف بھی ہے یعنی امام بخاری غیر مقلدین کے بقول ایک دن میں قرآن ختم کر کے قرآن کی بے ادبی کیا کرتے تھے۔

(۶) امام بخاری کے مذہب میں نمازی کے آگے سے ہر جگہ گزرنا منع ہے اور غیر مقلدین کا مذہب یہ ہے کہ بیت اللہ میں نمازی کے آگے سے گزرنا جائز ہے۔

(۷) امام بخاری کے نزدیک اونٹ کے باڑہ میں نماز پڑھنا جائز ہے اور اہلحدیث کے یہاں حرام ہے۔

(۸) امام بخاری کے مذہب میں وضو کے اعضا کا پے در پے دھونا واجب نہیں غیر مقلدین کے یہاں واجب ہے

(۹) امام بخاری کے مذہب میں غسل جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا واجب نہیں اور غیر مقلدین کے یہاں واجب ہے۔

(۱۰) امام بخاری کے یہاں منی ناپاک ہے اور غیر مقلدین کے یہاں منی پاک ہے ان دس مثالوں سے آپ اندازہ لگائیے کہ غیر مقلدین کا یہ کہنا کہ ان کا مذہب بخاری کے مذہب کے مطابق ہوتا کتنا غلط ہے غیر مقلدین کا عمل نہ تو بخاری کی تمام احادیث پر ہے جیسا کہ پہلے کی دس مثالوں سے
واضح ہوا اور نہ غیر مقلدین کا عمل بخاری کے مذہب کے مطابق ہر جگہ ہوتا ہے۔

اور چونکہ اس آخری دس مثالوں میں امام بخاری نے اپنا مذہب بخاری میں ذکر کردہ احادیث کی روشنی ہی میں اختیار کیا ہے اس وجہ سے ان تمام احادیث کے بھی انکار کا غیر مقلدین پر الزام عائد ہوگا۔

غیر مقلدین کا کام ناواقف عوام کو صرف بھڑکانا ہوتا ہے بیچارے جو ناواقف ہوتے ہیں ان کی باتوں میں آجاتے ہیں غیر مقلدین دھوکہ دے کر حنفی مذہب سے بیزار کرنے کو دین کی بڑی خدمت سمجھتے ہیں بس اللہ سے ان کے لئے ہدایت کی دعا کرتے رہیے۔

میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ الحمدللہ احناف کا عمل صحیح حدیثوں پر ہوتا ہے احناف کی کتابوں کو پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ احناف سے زیادہ احادیث کی رعایت کرنے والا کوئی دوسرا نہیں، البتہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ بخاری یا کسی اور کتاب کی احادیث کا جو مطلب غیر مقلدین سمجھیں وہی مطلب احناف کی بھی سمجھ میں آئے۔

غیر مقلدین کی پوری قوت آج کل صرف اس پر خرچ ہو رہی ہے کہ وہ لوگوں کو احناف کے خلاف بدظن کریں آپ جیسے لوگوں کے لیے ضروری

ہے کہ ان کی باتوں کو سن کر متاثر نہ ہوں بلکہ اہل علم سے معلومات حاصل کریں

والسلام محمد ابو بکر غازی پوری

کیا صحابہ کرام کا ہر فرد فقیہ تھا؟

مکرمی ومحترمی مولانا محمد ابوبکر صاحب غازی پوری زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

زمزم پرچہ سے جس طرح حقائق کھل کر سامنے آرہے ہیں اس سے ہمارے دل ودماغ کو کافی سے زیادہ تازگی مل رہی ہے، آپ کا طرز تحریر

اور سوالات کے جواب کا انداز ہمارے ایمان کو تازگی بخشتا ہے، اور اسلاف سے عقیدت ومحبت سے روح فرحت پاتی ہے، فقہ حنفی کے بارے میں غیر مقلدین کے پروپیگنڈوں کی حقیقت کھل رہی ہے۔

غیر مقلدین کے پرچوں میں یہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ احناف کی کتابوں میں حضرت ابو ہریرہؓ کو فقیہ تسلیم نہیں کیا گیا ہے اور صحابہ کے درمیان فقیہ صحابی اور غیر فقیہ صحابی کی تقسیم کی گئی ہے؟ براہ کرم اس پر روشنی ڈالیں۔ والسلام

محمد نصیر الدین انصاری اعظم گڑھ

زمزم!

غیر مقلدین پروپیگنڈہ کے فن کے ماہر ہیں، اور اس وقت وہ سخت احساس کمتری کے شکار ہیں، اور جب آدمی میں احساس کمتری پیدا ہو جائے تو وہ جھوٹ بولتا ہے، اور اپنا قد اونچا کرنے کے لئے خلاف واقعہ بات کا سہارا لیتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ احادیث رسول کے سب سے زیادہ روایت کرنے والے صحابی ہیں سنت کے شیدائی تھے عموماً ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہیں، اس وجہ سے کچھ لوگوں نے ان کو غیر فقیہ کہہ دیا جس نے کہا غلط کہا، خود

ہمارے علماء نے ایسے لوگوں کی سخت تردید کی ہے۔ البتہ یہ کہ آنحضور اکرم ﷺ کے ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام میں کا ہر فرد فقیہ تھا، یہ بھی مبالغہ ہے، خود غیر مقلدین کو یہ تسلیم نہیں ہے۔

مولانا عبد السلام مبارکپوری مشہور غیر مقلد عالم ہیں، ان کی کتاب سیرۃ البخاری بھی بہت مشہور کتاب ہے، اسمیں وہ لکھتے ہیں۔

''یہ بات حیرت سے دیکھی جائے گی کہ اصحاب رسول اللہ ﷺ اس کثرت سے تھے کیونکہ ان کی تعداد ایک لاکھ کئی ہزار تک پہنچی ہے، باوجود اس کے ان میں صاحب فتویٰ فقیہ ایک سو کئی تھے'' (ص ۲۱۷)

یعنی مولانا عبد السلام صاحب کے بقول ایک لاکھ کئی ہزار صحابہ میں سے صرف سو سے کچھ ہی زائد فقیہ وصاحب فتویٰ تھے بقیہ صحابہ کرامؓ اس منصب کے حامل نہیں تھے

مولانا عبد السلام مزید لکھتے ہیں:

''اس طرح گویا ہر ایک صحابی آنحضورﷺ کی حدیثوں کا بڑا حصہ یاد رکھتا اور اس کو روایت کرتا لوگوں کو سکھاتا اس کے مطابق فتویٰ دیتا اور اس خدمت کو اپنے فرائض سے جانتا، اس پر بھی چند ہی صحابہ فقیہ اور مجتہد کے لقب سے شہرت پذیر ہوئے جو لاکھوں کی تعداد کے سامنے بہت قلیل ہیں''

(ص ۲۱۸)

مزید مولانا مبارکپوری کا یہ ارشاد سن لیں، فرماتے ہیں۔

بہت سے مسائل ایسے پیش آتے ہیں جن کی نسبت حدیث میں کوئی حکم بتصریح موجود نہیں، بلکہ قواعد استنباط کے ذریعہ حکم متخرج ہوتا ہے یا حکم کی تصریح ہے لیکن اور حدیثیں اس کے معارض ہیں، ایسی صورتوں میں اجتہاد اور استنباط کی ضرورت پڑتی ہے اور فقہ دراصل اسی کا نام ہے اس قسم کے مسائل کا فیصلہ کرنا انہیں لوگوں کا کام تھا جو اس فن کے امام تھے (ص ۲۱۸)

احناف اس سے زیادہ نہیں کہتے جو مولانا عبدالسلام صاحب مبارکپوری کی تحقیق ہے۔ مزید غیر مقلدین کی جماعت کے سب سے بڑے عالم

یا نمبر ۲ کے مجدد کی تحقیق بھی سن لیں مولانا نواب صدیق حسن صاحب بھوپالی فرماتے ہیں:

والذين حفظت عنهم الفتوىٰ من اصحاب رسول اللهﷺ مأة ونيف وثلثون نفساً مابين رجل وامرأة

(الجنۃ ص ۵)

یعنی صحابہ کرامؓ کی جماعت میں سے جن مردوں یا عورتوں سے فتاویٰ منقول اور محفوظ ہیں ان کی تعداد تقریباً ایک سو تیس ہے۔ اور اس سے صریح عبارت علامہ عراقی کی ہے جس کو نواب صاحب نے نقل کیا ہے۔

ان الصحابةؓ ماكان كلهم فقهاء على اصطلاح العلماء فان فيهم القروى البدوى ومن سمع منه ﷺ حديثا واحد او صحبه مرة (ایضاً ص ۵۶)

یعنی علماء کی اصطلاح کے اعتبار سے تمام صحابہ کرامؓ فقیہ نہیں تھے، اسلئے کہ ان میں قصبے اور دیہات کے رہنے والے بھی تھے اور ایسے بھی جنھوں نے آنحضورﷺ سے صرف ایک حدیث سنی اور آپ کی صحبت میں رہنے کا ایک ہی مرتبہ ان کو اتفاق ہوا۔

افسوس یہ ہے کہ غیر مقلدین جب احناف پر اعتراض کرتے ہیں تو ان کو آنکھوں پر تعصب کی پٹی چڑھی ہوتی ہے اور اس لئے وہ ایک ثابت شدہ حقیقت کا بھی انکار کر دیتے ہیں ان کا مقصد صرف احناف کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم کو تیز سے تیز تر کرنا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے کہ وہ ہمیں حقیقت ثابتہ کا منکر نہ بنائے اور تعصب اور غلو کے مرض سے محفوظ رکھے۔

والسلام

محمد ابوبکر غازی پوری

کیاان خیانتوں کوتسامح کہاجائے گا؟

مکرمی مولانا غازی پوری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

زمزم کے شماروں میں آپ جس انداز سے اہل حدیث وسلفی جماعت حقہ پر برستے ہیں میرا خیال ہے کہ یہ اہل حق کی نشانی نہیں ہے، آپ اپنی تحریروں میں جماعت اہلحدیث علما کے خلاف نہایت جارحانہ انداز میں تنقید کرتے ہیں، ان کو جاہل متعصب خائن حدیثوں میں تحریف کرنے والے جیسے سنگین الزامات سے متہم کرتے ہیں، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ازراہ بشریت ان سے کچھ تسامحات ہوگئے ہوں، اس کو خیانت یا تحریف کہنا کہاں سے جائز ودرست ہے آپ کا طرز تحریر اہل علم کی شان کے مناسب نہیں ہے، براہ کرم یا تو اپنی روش درست کر لیجئے یا زمزم کو بند کردیجئے، امت

مسلمہ پر آپ کا بڑا احسان ہوگا۔ والسلام

زمزم کا ایک قاری

سدھارتھ نگر، یوپی

زمزم!

میں عام طور پر بلانام اور بلا پتہ مجہول قسم کے لوگوں کے خطوط کے جوبات زمزم میں دنیا مناسب نہیں سمجھتا، مگر اتفاق کی بات ہے کہ ادھر اس قسم کے کئی خطوط آئے بعض خطوط تو صرف گالی اور وہ بھی نہایت سنگین قسم کی تھی، اور بعض خطوط اس قسم کے تھے جس کا نمونہ اوپر نقل کیا گیا ہے، کچھ لوگ طٰہٰ شیرازی کے خمار سلفیت پر اتنے برہم ہیں کہ انہوں نے اس کی بنیاد پر مدیر زمزم کے جہنمی ہونے کا فیصلہ کردیا ہے۔

میں اپنے ان کرم فرماؤں اور دوستوں سے کیا کہوں، گالیوں کا جواب گالی سے دیا نہیں جاسکتا، ہاں ایسے لوگوں کے لئے دعائے خیر کرنا ضروری سمجھتا ہوں مدیر زمزم کے بارے میں جن حضرات کو یقین ہوگیا ہے کہ وہ جہنمی ہے تو ان سے گزارش ہے کہ ابھی مدیر زمزم باحیات ہے اور کوشش میں لگا ہے کہ اللہ اس کی سیئات کو حسنات سے بدل دے، اگر خاتمہ

بالخیر ہوگیا تو ان شاءاللہ اس کا بیڑا پار ہے، اس کے بارے میں دوسروں کو زیادہ تر دد وفکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

منقول نامہ گرامی کا جواب اس لئے دینا مناسب ہوا کہ اگر کسی اور کے ذہن میں بھی اس قسم کی باتیں ہوں تو وہ بھی میری گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کرلے۔

(۱) صاحب مکتوب نے اہلحدیث وسلفی جماعت کو جماعت حقہ کہا ہے، جماعت حقہ کا اگر یہ مطلب ہے کہ اس جماعت کا دین ومذہب

عقیدہ وفکر وہی ہے جس پر اسلاف تھے،تو ہمیں اس کو تسلیم کرنے میں بہت تر دد ہے،اس لئے کہ ہمارے نزدیک اس آسمان کے نیچے یہ بہت بڑا جھوٹ ہے کہ جماعت اہلحدیث یعنی غیر مقلدوں کی جماعت سلف کے عقیدہ پر ہے،اس جماعت کا پروپیگنڈہ تو اپنے بارے میں یہی ہے مگر اس پروپیگنڈہ کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے،ہمارے اسلاف کے دین ومذہب میں شرک وبدعت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے اور جماعت غیر مقلدین کے عوام ہی نہیں بلکہ اکابر تک شرک وکفر کا اپنی زبان سے برملا اظہار کرتے ہیں دیکھئے نواب صاحب صدیق حسن بھوپالی مرحوم کا یہ شعر

زمرہ رای در افتاد با رباب سنن

شیخ سنت مددے قاضی شوکاں مددے

(نفح الطیب ص ۶۳)

یعنی رائے وقیاس والے سنت والوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں اے سنت کے شیخ اور اے قاضی شوکانی آپ مدد فرمائیے۔

مصیبتوں میں غیر اللہ سے مدد مانگنا اہل سنت والجماعت کا مذہب نہیں ہے،یہ خالص مشرکانہ مبتدعانہ عمل ہے،اور جس کا اس قسم کا عقیدہ ہو اس کا توحید سے رشتہ کٹ جاتا ہے۔

نواب صاحب کا یہ شعر بھی سن لیں فرماتے ہیں

گفت نواب غزل در صفت سنت تو

خواجہ دیں صلۂ قبلہ (۱) پاکاں مددے (ایضاً)

یعنی نواب صدیق حسن نے (اے نبی اکرم ﷺ) آپ کی سنت کی تعریف میں غزل کہی ہے،تو اے دین کے سردار مجھے صلہ دیجئے اور متقیوں کے قبلہ وکعبہ میری مدد فرمائیے۔

نواب صاحب کے عقیدہ میں قاضی شوکانی اور حضور اکرم ﷺ سے مدد چاہنا جائز تھا ہی اس کے علاوہ ان کا زعم وعقیدہ یہ بھی ہے کہ نواب صدیق

حسن کے بخت وطالع یعنی ان کی قسمت سے بھی مدد چاہی جاسکتی ہے،سنئے نواب صاحب فرماتے ہیں

ہوس ما است حدیث از لب جاناں مددے

مددے طالع صدیق حسن خاں مددے (ایضاً)

(۱) قبلہ پاکاں آنحضور ﷺ کو کہا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نواب صاحب کے عقیدہ میں آپ ہی ﷺ ہر مصیبت وپریشانی میں صالحین کے قبلہ توجہ تھے یہ عقیدہ اہلسنت والجماعت کا ہرگز نہیں ہے۔پریشانی ومصیبت میں مسلمانوں کا مرکز توجہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی

ہے۔

یعنی میری خواہش ہے کہ محبوب کی زبان سے حدیث سنوں، نواب صدیق حسن خان کی قسمت تو میری مدد کر مدد کر، نواب صاحب کے یہ تمام اشعار شرکیہ ہیں ان اشعار میں غیر اللہ سے مدد حاصل کرنے کی ترغیب وتعلیم ہے، بھلا بتلایا جائے کہ جن کے عقائد اس قسم کے ہوں ان کو اہل سنت والجماعت کہنا کس طرح درست ہے، یہ نواب صاحب وہ ہیں جن کو غیر مقلدین مجدد سلفیت کہتے ہیں اور اپنا پیشوا اور مقتدا سمجھتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ من حلف بغیر اللہ فقد اشرک یعنی جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا

۔

اب دیکھئے نواب صاحب جو مجدد سلفیت ہیں اور غیر مقلدین کے مقتدیٰ اور پیشوا ہیں وہ کس شان سے غیر اللہ کی قسم کھاتے ہیں، ان کا ای شعر ہے

قسم بشاہ رسالت قسم بشوکت او

کہ نیست در سر من جز ہوائے سنت او (ایضاً ص ۵۶)

یعنی میں شاہ رسالت ﷺ اور ان کی شوکت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے سر میں ان کی سنت کے شوق کے علاوہ اور کوئی شوق نہیں

ہے۔

دین اسلام میں جس طرح عام مخلوق کی قسم کھانا حرام اور شرک ہے اسی طرح رسول اللہ یا اور کسی پیر و پیغمبر کی قسم کھانا شرک وضلالت

ہے۔

غیر اللہ کو سجدہ کرنا یا اللہ کے در کے علاوہ کسی اور در پر سجدہ کرنا یہ انتہائی درجہ کا شرک ہے، مگر نواب صاحب کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے آستانہ پر سجدہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اس شوق نے ان کو بےچین کر رکھا ہے فرماتے ہیں

بخاک رفتم ولیکن زتاب آتش عشق

ہوائے سجدہ براں خاک آستاں باقیست (ایضاً ص ۲۰)

یعنی میں مٹی ہو گیا مگر آتش عشق کی لپک یہ ہے کہ ابھی ان کے آستانہ کی خاک پر سجدہ کرنے کی خواہش باقی ہے

جن کا اس قسم کا عقیدہ ہو ان کو اہل سنت واہل حق کے زمرہ میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے۔

سارے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہر طرح کے فتنوں سے سلامتی کتاب اللہ وسنت رسول اللہ میں ہے، مگر نواب صاحب مجدد سلفیت کی دعوت ہے کہ اگر تم دین وعقیدہ کی سلامتی چاہتے ہو تو قاضی شوکانی کی کتابیں پڑھو فرماتے ہیں

اگر سلامت دین خود از خرد خواہی

بخواں صحیفۂ علم جناب شوکانی (ص ۶۴)

یعنی اگر تم عقل ورائے کے فتنہ سے اپنے دین کی سلامتی چاہتے ہو تو قاضی شاکانی صاحب کی کتابیں پڑھو۔

اللہ اللہ کیا مقام ہے قاضی شوکانی کی کتابوں کا، بخاری مت پڑھو، مسلم مت پڑھو، حدیث کی اور کتابیں نہ پڑھو، قرآن بھی مت پڑھو، اگر دین کی سلامتی چاہتے ہو تو قاضی شوکانی کی کتابیں پڑھو۔

(۲) ہم کسی مسلمان کو بلاوجہ خائن کاذب اور قرآن وحدیث میں تحریف کرنے والا کہنے کو بدترین گناہ سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے پناہ چاہتے ہیں کہ کسی مسلمان کے بارے میں بلاوجہ ہماری زبان سے اس قسم کے الفاظ نکلیں، مگر ہمیں بتلایا جائے کہ اگر واقعی کوئی آدمی دین کے پردہ میں بے دینی پھیلا رہا ہو ایمانداری کے پردہ میں بے ایمانی کرر ہا ہو سنت کے نام پر بدعت کو فروغ دے رہا ہو، حق کے نام پر ناحق کا پرچار کرر ہا ہو، قرآن وحدیث سے غلط الفاظ نقل کرر ہا ہو یا صحیح الفاظ نقل کر کے قصد وارادہ سے اور جان بوجھ کران کا غلط مطلب بیان کرر ہا ہو ، کتابوں کا غلط حوالہ دے رہا ہو، قرآن وحدیث کی طرف جان بوجھ کر غلط بات منسوب کرر ہا ہو تو ایسے شخص یا

ایسے اشخاص کو آخر ایماندار اور مخلص کیسے کہا جائے گا، اگر ایسے لوگ بھی ایماندار اور مخلص کہلائیں گے تو پھر بے ایمان اور خائن کن لوگوں کو کہا جائے گا۔

میں نے زمزم میں اپنی کتابوں میں غیر مقلدین حضرات کی اس طرح کی دانستہ حرکتوں کو بار بار مثالوں سے ظاہر کیا ہے، اب بجائے اس کے کہ اپنے علماء کی کوتاہیوں کا اعتراف کیا جاتا، غصہ مدیر زمزم پر اتارا جاتا ہے، اور اس کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ہمارے علما کی دانستہ علمی خیانتوں کو تسامحات سمجھ کر چپ ہو جاؤ، ان کا عیب ظاہر نہ کرو، یہ عجیب مشورہ انسان سے سہو ونسیان اور تسامح ہوتا ہے مگر دانستہ خیانتوں کے ارتکاب کو تسامح کا نام نہیں دیا جاسکتا، آیئے ایک دو تازہ مثالوں سے غیر مقلدین کے تسامح کی داد دیجئے۔

مولانا محمد جوناگڑھی مشہور غیر مقلد عالم ہیں، ان کی ایک کتاب مشکوٰۃ محمدی پڑھنے کا اتفاق ہوا، کتاب میں نے جب ہاتھ میں لی تو اس کے اندرونی ٹائیٹل پر ایک آیت اور اس کا ترجمہ دیکھ کر میں نے سر پیٹ لیا، آیت اور اس کا ترجمہ اہل علم ملاحظہ فرما کر بتلائیں کہ اس کو تسامح کا نام کس طرح دیا جاسکتا ہے۔

ردالذین کفروا بغیظھم لم ینالو خیراً

حق چھپانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے لوٹا دیا اور انہیں زبردست نقصان کے ساتھ واپس ہونا پڑا

یہ آیت اکیسویں پارہ کے آخر صفحہ کی ہے، صحیح آیت اس طرح ہے۔

ورد اللہ الذین کفروا بغیظھم لم ینالوا خیراً

آیت کریمہ سے اللہ کا لفظ ساقط ہو گیا ہے، اگر اس کو سہو تسامح اور پروف ریڈنگ کی غلطی مان بھی لیا جائے تو آخر اس ترجمہ کو کیا نام

دیا جائے گا۔ کیا اس آیت کریمہ کا یہی ترجمہ ہے (۱)

یہ قرآن کے ساتھ کتنا بھونڈا مذاق ہے، جو دین کے نام پر غیر مقلدین حضرات انجام دے رہے ہیں، یہ آیت قرآنی کی صریح معنوی تحریف نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

اس کتاب کے صفحہ ۵٦ پر جونا گڑھی صاحب نے یہ آیت اس ترجمہ کے ساتھ ذکر کی ہے۔

ان کل من فی السمٰوٰت والارض الأآتی الرحمن عبدا ،لقد احصاھم وعدھم عدا،وکلھم آتیہ یوم القیمۃ فرداً

یعنی زمین وآسمان میں جتنے جاندار ہیں سب اللہ کے غلام ہیں اس کے سامنے پیش ہونے والے ہیں سب اس کے قبضے اور اس کی قدرت میں گنے چنے ہیں اور ہر ایک قیامت کے دن اس کے سامنے تنہا جانے والا ہے (۱) (ص ۵٦)

(۱) آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کوئی نہیں اسمان اور زمین میں جو نہ آئے رحمٰن کا بندہ ہوکر اس کے پاس ان کی شمار ہے اور گن رکھی ہے ان کی گنتی اور ہر ایک ان میں آئے گا اس کے سامنے قیامت کے دن اکیلا

(۱) اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے، اور پھر دیا اللہ نے منکروں کو اپنے غصہ میں بھر ہوئے، ہاتھ نہ لگی (کافروں کو) کچھ بھلائی یعنی، کفار کا لشکر ذلت ونا کامی سے پیچ وتاب کھاتا ہوا اور غصہ سے دانت پیتا ہوا میدان چھوڑ کر واپس ہوا نہ فتح ملی اور نہ سامان کچھ ہاتھ آیا آیت کا مضمون کچھ ہے اور جونا گڑھی صاحب اس کی تحریف کر کے مقلدین پر فٹ کرر ہے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ جونا گڑھی صاحب کے گھر کی کوئی تصنیف ہے کہ آیت قرآنی کا جس طرح چاہیں ترجمہ کریں اور جو چاہیں مطلب بیان کریں، میں اہل علم سے گزارش کروں گا کہ وہ غور کریں کہ اس ترجمہ میں علم ودیانت کو کند چھری سے ذبح کرنے کی کتنی خطرناک جسارت کی گئی ہے، کیا اس کا نام سہو ونسیان اور تسامح رکھا جائے گا؟

ص ۵۷ پر یہ آیت ذکر کی گئی ہے۔

لاتسجدوا للشمس ولاللقمر واسجدوا للہ الذی خلقھن ان کنتم ایاہ تعبدون .

سورج چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ صرف اللہ ہی کو سجدہ کرو جو سب کا خالق ہے (۲)

آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے سجدہ نہ کرو سورج کو نہ چاند کو اور سجدہ کرو اللہ کو جس نے ان کو بنایا اگر تم اسی کی پوجا کرتے ہو۔

قرآن کی عبارت کیا ہے اور اس کا ترجمہ کس قابلیت سے کیا گیا ہے، اہل علم غور فرمائیں یہ تین نمونے ہم نے قرآن کے بطور عبرت

پیش کیے ہیں

ورنہ اس کتاب میں قرآن کی اور آیتوں کے ساتھ بھی اس قسم کا مذاق کیا گیا ہے

انما الطاعۃ بالمعروف کا جونا گڑھی صاحب ترجمہ کرتے ہیں یعنی اطاعت صرف قرآن وحدیث میں ہی ہے۔

بالمعروف کے اس فاضلانہ ترجمہ وتفسیر پر دنیائے غیر مقلدیت میں واہ واہ کا شور مچ گیا ہو گا مگر اہل علم نے جہالت کے اس نمونہ پر دانتوں تلے انگلیاں دبالی ہونگی

اس کتاب کے ص ۱۴۷ میں تو عجیب وغریب بات لکھی ہے لکھتے ہیں

ابن عبدالبر میں ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں

تعمل هذه الامة برهة بكتاب الله وبرهة بسنة رسول الله ﷺ (۱) يعملون بالراى فاذافعلو ذلک فقد ضلوا

(۱) غالباً یہاں ثم کا لفظ چھوٹ گیا ہے

یعنی میری امت کا عمل ایک زمانہ تک تو قرآن وحدیث پر رہے گا لیکن اس کے بعد وہ اپنی رائے کے عامل بن جائیں گے اس وقت گمراہ ہو جائیں گے۔

میں نے بہت سے لوگوں سے پوچھا کہ ابن عبدالبر کون سی کتاب ہے، مگر اس نادر ونایاب کتاب کا کسی کو پتہ نہیں تھا شاید غیر مقلدین علما اس کا پتہ رکھتے ہوں تو ضرور ہمیں بھی اس سے آگاہ کریں اور ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث کہاں ہے اس کا بھی پتہ ضرور دیں گے قطع نظر ان سب باتوں کے اہل علم برھۃ بکتاب اللہ اور برھۃ بسنۃ رسول اللہ کے جونا گڑھی ترجمہ پر غور کر کے بتلائیں کہ اس عبارت کا یہ ترجمہ کرنا صریح دھاندلی نہیں ہے؟ ایسے شخص کو امن کیسے کہا جا سکتا ہے۔

غیر مقلدین علما میں حافظ محمد گوندلوی مقام بہت ممتاز ہے، محدث العصر ان کو کہا جاتا تھا ان کی علمی تحقیقات کو اس جماعت میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ان کا رفع یدین کے سلسلہ میں ایک رسالہ ہے جس کا نام التحقیق الراسخ ہے میں نے اس رسالہ کو بڑی عقیدت سے ہاتھ میں لیا تھا کہ حافظ صاحب موصوف اگر چہ غیر مقلد ہیں مگر ان کی شہرت تدین وتقویٰ میں بھی بہت ہے؟ اس وجہ سے ان کی روش عام غیر مقلدین علما سے الگ ہوگی اور ان کے یہاں علم کے نام پر علم کو رسوا کرنے والی بات نہ ہوگی، مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موصوف حافظ صاحب بھی غیر مقلدوں

کی عام روش سے اپنے آپ کو بچا نہ سکے، انہوں نے اپنے اس رسالہ کے ص ۵۲ پر یہ عبارت نقل کی ہے۔

واسلم العبارات قول ابن المنذر لم يختلفوا ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يرفع يديه اذاافتتح الصلوٰة

اس کا صحیح ترجمہ جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں یہ ہوگا

اور سب سے معقول اور صحیح بات ابن منذر کی ہے کہ لوگوں کا اس میں اختلاف نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے۔

مگر محدث عصر حافظ گوندلوی صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

''یعنی اگر چہ مذاہب تو پہلی رفع یدین میں مختلف ہیں لیکن اس بارے میں اختلاف نہیں کہ حضور ﷺ رفع یدین کیا کرتے تھے''

میں حافظ صاحب موصوف کا یہ ترجمہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور کہنا پڑا کہ غیر مقلد اگر چہ محدث عصر ہو جائے مگر رہے گا وہ غیر مقلد ہی، اور علم و دیانت کے گلے پر چھری چلائے بغیر اس کا مذہب عدم تقلید زندہ باد نہیں بن سکتا۔

اس کتاب کے ص ۵۶ پر اتھمہ السلیمانی بوضع الا حادیث کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں

یعنی ان پر اتہام ہے در حقیقت کوئی حرج نہیں

ایک جعلی موضوع اور من گھڑت روایت کو صحیح بنانے کی اس ناروا کوشش کی اہل علم داد دیں۔

میں اپنے دوستوں سے پوچھتا ہوں جو مجھ پر ناراض ہیں کہ آخر ان باتوں کو وہ کیا نام دیں گے، کیا دیانت و امانت اسی کا نام ہے، یا ان کو کسی بھی درجہ میں سہو و نسیان اور تسامح کا نام دیا جا سکتا ہے؟

اختلافی مسائل پر صرف غیر مقلدین ہی داد تحقیق نہیں دیتے ہیں بلکہ اور مذاہب والے بھی لکھتے لکھاتے ہیں مگر اس قسم کی دیانت و امانت سے دور باتوں کے مرتکب وہ نہیں ہوتے اس کا ارتکاب یا تو شیعہ کرتے ہیں یا قادیانی یا پھر غیر مقلدین۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہ مستقیم پر قائم رکھے اگر اس قسم کی باتوں سے چشم پوشی اختیار کر لی جائے اور عوام کو غیر مقلدیت کی حقیقت سے واقف نہ کرایا جائے تو یہ چنگاریاں شعلہ بن جائیں گی اور پھر دین و ایمان کے بھسم

ہو جانے کا اندیشہ ہے ہم اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ بہت سوچ سمجھ کر اور اللہ کے حضور پیش ہونے کے پورے احساس کے ساتھ کر رہے ہیں زمزم جب تک اللہ چاہے گا اور اللہ کی جب مرضی ہوگی وہ بند ہو جائے گا، کسی کو اس بارے میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

والسلام

محمد ابو بکر غازی پوری

محدثین نے اپنی کتابوں میں ضعیف احادیث کیوں ذکر کی ہیں

مکرمی جناب مولانا غازی پوری دامت برکاتہم مدیر زمزم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ.........مزاج گرامی!

زمزم کے سال سات پورے ہوئے اور آٹھویں سال میں قدم رکھنے پر مبارکباد قبول فرمائیں آپ کی تحریریں اور مضامین اہل علم کی دنیا میں بہت دنوں تک یاد رکھے جائیں گے اور علما وطلبا اس سے استفادہ کرتے رہیں گے آپ نے سلفیت اور غیر مقلدیت کے فتنہ کا جس استقامت وپامردی اور پراز اعتماد حوصلہ سے مقابلہ کیا ہے اس پر اس کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے۔

ایں کار از تو آمد و مرداں چنیں کنند

بارک اللہ فی حیاتکم

ایک بات یہ پوچھنی ہے کہ جب احادیث ضعیفہ کا شرعی مسائل میں اعتبار نہیں ہوتا ہے تو پھر محدثین نے ان مردود وغیر معتبر روایتوں کو اپنی کتاب میں کیوں جگہ دی ہے، غیر مقلدین کے سامنے جب کوئی روایت پیش کی جاتی ہے جو ان کے مسلک کے خلاف ہو تو فوراً اس کو ضعیف کہہ دیتے ہیں اور وہ مردود ہو جاتی ہے براہ کرم اس پر تفصیلی روشنی ڈال کر ہمیں مطمئن کریں، اطلاعاً عرض ہے کہ بہت سے حضرات کو اس وجہ سے محدثین سے سوءظن پیدا ہو رہا ہے کہ اصل قصور محدثین ہی کا ہے۔

والسلام محمد طالب سکندر آباد حیدر آباد

زمزم!

آج کے اس دور کا بڑا فتنہ ضعیف احادیث کا انکار کرنا ہے دور اول میں اس فتنہ کا وجود نہ ہونے کا برابر تھا، لیکن آج اس فتنہ کو ہوا دینے والے جگہ جگہ ہیں اور سلفیت نے اس فتنہ کو دو آتشہ بنا دیا ہے خصوصاً شیخ محمد ناصر الدین البانی نے اس فتنہ کو شعلہ جوالہ بنا دیا ہے اور اس کی فکر سے متاثرین نے اس فتنہ کو عام کر دیا ہے۔

ضعیف احادیث کا مطلقاً انکار کرنا انکار حدیث کا دروازہ کھولنا ہے اور منکرین حدیث کی حمایت وتائید کرنی ہے یہ نہج اہل سنت کا کبھی نہیں رہا ہے محدثین کرام رحمہم اللہ کا امت محمدیہ پر یہ احسان ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے ہر قول وفعل اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر سنت کو پہلے اپنے

سینوں میں محفوظ کیا ہے پھر ان کو سفینہ میں درج کر کے تمام امت کے لیے شریعت پر عمل کرنے کا راستہ آسان کر دیا ہے، اس راہ میں انہوں نے جو جانفشانیاں اٹھائی ہیں ان کا اس زمانہ میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ایک ایک حدیث کے لیے راتوں اور دنوں کا سفر کیا خشکی کو طے کیا یا

بان کی خاک چھانی، سمندوں کو پار کیا مال لٹایا، فاقہ کیا کیا یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلط سلط باتوں کو جمع کرنے کے لیے یہ محنت ومشقت اٹھاتے تھے یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے دیوانے تھے اخلاص کا پیکر تھے۔

اللہ کو اپنا دین قیامت تک کے لیے محفوظ کرنا تھا اس کے لیے اللہ نے مختلف اسباب پیدا فرمائے محدثین رحمہم اللہ کو بھی اللہ نے اپنے دین کی حفاظت کا ایک بڑا ذریعہ بنایا اور ان کے ذریعہ سے اپنے پیارے رسول کی پیاری سنتوں کو قیامت تک کے لیے محفوظ رکھا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنتیں اور آپ کی حدثیں اسلام کی تعلیمات کا دوسرا ابنیادی ستون ہیں اس ستون کو سنبھالنے والے محدثین کرام تھے۔

ان محدثین کے بارے میں یہ تصور بھی ہمارے لیے گناہ ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب جھوٹی باتوں کو

درج دفتر کیا ہے اور انہیں سے دن ورات اشتغال رکھتے تھے اور اپنی زندگی کا سرمایہ بنایا تھا۔

آنحضور صلی اللہ کا ارشاد ہے کہ جس نے میرے اوپر جھوٹ گڑھا اس کا ٹھکانا جہنم ہے تو کیا امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام ترمذی امام ابن ماجہ، اور ان جیسے دوسرے محدثین کے بارے میں یہ لب کشائی جائز ہے کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب جو جھوٹی بات تھی اسی کو انہوں اپنی کتابوں میں درج کر کے اتنے بڑے گناہ کا کام کیا ہے اور اپنا ٹھکانہ معاذاللہ ثم معاذاللہ جہنم میں بنایا۔

آج کے اس دور کا بڑا فتنہ ضعیف احادیث کا انکار کرنا بھی ہے ضعیف احادیث مردود ہیں ان پر عمل کرنا جائز نہیں اور یہ دور حاضر کے سلفیوں کا پروپیگنڈہ ہے اسلاف کرام ائمہ عظام اور قدمائے محدثین کے زمانہ میں اس فتنہ کا وجود نہیں تھا، حضرات محدثین نے احادیث کے درجے تو قائم کئے ہیں مثلا جو احادیث بخاری ومسلم میں ہوگی وہ سب سے زیادہ صحیح ہوگی (۱) پھر جو تنہا بخاری میں ہوگی، پھر جو تنہا مسلم میں ہوگی، بعض حسن لذاتہ ہیں بعض احادیث حسن لغیرہ ہیں حسن لذاتہ کا درجہ حسن لغیرہ سے بڑھا ہے بعض موقوف ہیں بعض مرسل ہیں موقوف کا درجہ مرسل سے بڑھا ہوا ہے اسی طرح

بعض شاذ ہیں بعض منکر ہیں بعض معلل ہیں بعض معضل ہیں بعض سند کے اعتبار سے مشہور ہیں بعض عمل کے اعتبار سے مشہور ہیں بعض عملاً متواتر ہیں بعض سنداً متواتر ہیں محدثین سنداً مشہور اور متواتر کو مقدم رکھتے ہیں فقہاء عملا مشہور ومتواتر کو مقدم رکھتے ہیں بعض احادیث ثلاثی ہیں (جس کی سند میں صرف تین واسطے ہوں) بعض رباعی ہیں (جس کی سند میں چار واسطے ہوں) بعض خماسی ہیں (جس کی سند میں پانچ واسطے ہوں) ثلاثی کا درجہ رباعی سے اور رباعی کا درجہ خماسی سے بڑھا ہوا ہے بعض احادیث ایسی ہیں جس کی سند میں فقہاء کے واسطے ہیں بعض احادیث صرف محدثین کے واسطوں سے نقل کی گئی ہیں ایسی شکل میں محدثیوں کی سندوں والی روایتوں کو ترجیح دیتے ہیں فقہا فقہاء والی سند کو اختیار کرتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محدثین کی سندوں والی حدیث تو حدیث ہوگی اور فقہاء کی سندوں والی حدیث حدیث نہ

(۱) دو درجے تھے، صحیح وغیر صحیح جس کے رواۃ حفظ واتقان عدالت وغیرہ سے متصف ہوتے اسکو صحیح کہا جاتا اور جن میں یہ صفات کم تر درجہ میں ہوتیں ان کی احادیث کو ضعیف وغیر صحیح کہا جاتا بخاری ومسلم سے پہلے جو کتابیں وجود میں آچکی تھیں ان کا درجہ بخاری ومسلم سے زیادہ بڑ

ھاہوا ہے کہ ان کی سندو

ں میں راویوں کا واسطہ کم ہے دوسرے ان راویوں میں حدیث کی قبولیت کے شرائط بعد کی کتابوں کے روایوں سے بہت بڑھی ہوئی ہیں مثلا امام مالک کی موطا کا پایہ اس اعتبار سے بخاری سے بہت بڑھا ہوا ہے کہ اس کی احادیث کی سندیں تین چار واسطوں سے زیادہ کی نہیں ہیں اور امام مالک کے شیوخ اور ان کے شیوخ کا مقام و مرتبہ ہر اعتبار سے بخاری کے شیوخ اور ان کے شیوخ کے شیوخ سے بڑھا ہوا ہے،

(نورالدین نوراللہ الاعظمی)

ہوگی یا ان مذکورہ قسموں میں سے ایک قسم تو حدیث کہلائے گی اور اس کے مقابل والی قسم حدیث رسول نہ ہوگی اور اس پر عمل کرنا جائز نہ ہوگا

پھر محدثین کے نزدیک احادیث کے قبول کرنے کا الگ الگ پیمانہ ہے مثلا امام بخاری فرماتے ہیں کہ روای اور اس کے شیخ کی ملا قات کا تحقق ضروری ہے یعنی امام بخاری کے نزدیک وہی حدیث صحیح ہوگی جس کے سند کے روایوں کی اپنے استاذ اور شیخ سے ملاقات بالیقین ثابت ہو امام مسلم فرماتے ہیں کہ ملاقات کا تحقق ضروری نہیں ہے بلکہ صرف لقا کا امکان کافی ہے یعنی اگر دونوں ہم زمانہ ہے تو اس حدیث کے صحیح ہونے کے لیے یہی کافی ہے اب جو حدیث امام مسلم کے یہاں صحیح ہوگی ضروری نہیں ہے کہ امام بخاری کے یہاں بھی وہ صحیح ہو اگر روای اور مروی عنہ کے درمیان لقاء کا تحقق

نہیں ہے تو وہ حدیث امام بخاری کے نزدیک ضعیف ہوگی جب کہ وہی حدیث امام مسلم کے مذہب پر صحیح ہوگی۔

غرضیکہ احادیث کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کا معیار بھی الگ الگ ہے اب دیکھتے ہیں کہ کوئی روایت کتنی بھی صحیح سند سے ثابت ہو مگر اہل مدینہ کا عمل اس روایت کے خلاف ہو تو امام مالک کے نزدیک وہ روایت ضعیف ہوگی خواہ بخاری کی روایت کیوں نہ ہو اور اہل مدینہ کا عمل مقد م ہوگا، مگر اس روایت کا امام مالک کے یہاں ضعیف ہونا ان کے اصول کی بنیاد پر

یا مثلا امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر کوئی روای ظاھر ا العدالة والحفظ والا تقان ہے تو اس کی روایت قابل قبول ہوگی خواہ اس سے روایت کرنے والے ایک ہوں یا دو یا دو سے زائد، جب کہ عام محدثین کا مذہب یہ ہے کہ روای عادل بھی ہو اور اس سے روایت کرنے والے کم از کم دو آدمی ضرور ہوں ورنہ وہ روای مجہول ہوگا اور اس کی روایت ضعیف ہوگی جب کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے اس وجہ سے ان کے نزدیک اس کی روایت صحیح ہوگی (۱) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہے، عام محدثین کے نزدیک وہ روایت صحیح ہی قرار پائے گی بہر حال ہماری گزارش کا حاصل یہ ہے کہ ضعیف احادیث کا انکار کرنا اور ان کو احادیث کی فہرست سے خارج کر دینا اور ان کو مجہور و متروک قرار دینا یہ اسلاف کے طرز اور ان کے عمل کے خلاف ہے یہ وقت حاضر کا فتنہ ہے اور اس فتنہ کو سلفیوں نے خوب ہوا دے رکھی ہے یہ حدیث رسول اور شریعت اسلامیہ کیساتھ دوستی نہیں دشمنی ہے دین کے نام پر بے دین

کا کام ہے اور جو لوگ ضعیف احادیث کا مطلق انکار کرتے ہیں انہوں نے ایک بڑی بدعت قبیحہ کا دروازہ کھول رکھا ہے ان کا راستہ سبیل المو منین کا نہیں ہے ان کا شمار منکرین سنت میں کیا جائے گا،

ہم نے جو یہ عرض کیا ہے کہ ضعیف حدیث کا انکار کرنا یہ وقت حاضر کا فتنہ ہے اسلاف کا یہ طریقہ نہیں تھا، اور متقدمین محدثین وفقہاء ضعیف احادیث کو قبول کیا کرتے تھے

اور ان پر اپنے عمل کی بنیاد رکھتے تھے چونکہ ہماری یہ بات سلفیوں اور البانیوں کے پر شور نعروں میں گم ہو جانے کا اندیشہ ہے اس وجہ سے ہم اپنی اس بات کو مزید پختہ کرکے لیے امام ترمذی کی کتاب ترمذی شریف کی طرف رجو

ع ہوتے ہیں تاکہ ناظرین ہر طرح کے وسوسوں سے دور رہ کر میری بات کی صداقت کی داد دیں۔

رہا امام ابو حنیفہ کا یہ اصول کہ اگر کوئی روای ظاہر العدالۃ ہے تو اسکی روایت قبول کی جائے گی خواہ اس سے روایت کرنے والے ایک ہوں یا کئی تو اس کی بنیاد قرآن پاک یہ آیت ہے۔ واذاجاء کم فاسق بنًا فتبنو.. یعنی اگر کوئی فاسق کوئی بات کہے تو اس کی تحقیق کرو اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص فسق سے محفوظ ہو تو اس کی بات بلا کسی دوسری شرائط کے قبول کی جائے گی

(۱) یہیں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بہت سی وہ روایتیں جن پر محدثین ضعف کا حکم لگاتے ہیں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں وہ صحیح ہیں اب لوگ محدثین کے فیصلہ کے مطابق امام ابو حنیفہ کے مسائل جانچنا شروع کر دیتے ہیں تو ان کو ان مسائل کے دلائل ضعیف نظر آتے ہیں حالانکہ امام ابو حنیفہ کے اصول اور قاعدہ پر وہ احادیث اور وہ دلائل صحیح اور قوی ہوتے ہیں۔

(۱) عدی بن حاتم کی حدیث ہے،

قال سالت رسول الله صلی الله علیه وسلم عن صید البا زی فقال ما اامسک علیک فکل، یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باز کے شکار کردہ جانور کے بارے میں پوچھا کہ اس کا کھانا حلال ہے یا نہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شکار کو اس نے تمہارے لیے باقی رکھا ہے یعنی اس میں سے خود نہیں کھایا ہے تو اس کو کھاؤ

۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ہم صرف مجالد بن عبدالرحمٰن عن الشعبی کی سند سے جانتے ہیں یعنی شعبی سے اس حدیث کا روایت کرنے والا صرف ایک شخص مجالد ہے اور شعبی کے علاوہ کسی اور سے یہ حدیث مروی نہیں ہے۔

اور مجالد بن عبدالرحمٰن کے بارے میں تقریب میں ہے کہ لیس بالقوی وقد تغیر فی آخر عمرہ یعنی یہ قوی نہیں ہے اس کا حافظہ بھی آخر عمر میں خراب ہو گیا تھا، اور منذری فرماتے ہیں فیہ مقال یعنی مجالد کے بارے میں محدثین نے جرحیں کی ہیں یعنی یہ حدیث محدثین کے قاعدہ کے مطابق ضعیف ہے باوجود اس کے امام ترمذی فرماتے ہیں کہ العمل علی ھذا عند اہل العلم یعنی علم کا اسی پر عمل ہے۔

(ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۴۲)

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ حدیث کا ضعف اصول محدثین پر بالکل واضح ہے، مگر اہل علم یعنی صحابہ وتابعین اور تبع تابعین اور تمام ائمہ فقہ حدیث کا اس پر عمل ہے

یعنی ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے بارے میں ان اہل علم کا اجماع ثابت ہوتا ہے، اب کیسے یہ کہا جائے کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز نہیں ہے اور ضعیف حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہی نہیں ہے۔

(۲) ترمذی کی حدیث ہے مایقطع من البهيمة وهى حية فهو ميته .

یعنی زندہ جانور سے اس کے بدن کا جو حصہ کاٹ لیا جائے تو اس حصہ کا حکم مردار کا ہے اس کی سند میں ایک روای عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار المدینی ہے اس کے بارے میں امام الجرح والتعدیل یحیی بن معین فرماتے ہیں فی حدیثہ ضعف یعنی اس کی حدیث میں ضعف ہے، ابو حاتم فرماتے ہیں۔

لا يحتج به ،

یعنی اس سے حجت نہیں پکڑی جاتی ہے دوسرے محدثین نے بھی اس پر کلام کیا ہے یعنی محدثین کی اصطلاح کے اعتبار سے یہ حدیث ضعیف ہے، لیکن امام ترمذی فرماتے ہیں والعمل علی ھذا عند اہل العلم، یعنی تمام اہل علم یعنی فقہاء ومحدثین کا اسی پر عمل ہے ایضاح ۲۷ص ۲۴۶)

بھلا بتلائے کہ کتنے بڑے ظلم کی بات ہے کہ ضعیف حدیث کے بارے میں آج پروپیگنڈہ کیا جائے کہ اس پر عمل کرنا ناجائز اور حرام ہے فی الاصل ضعیف حدیث کا انکار کرنا احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت بڑے ذخیرے پر ہاتھ صاف کرنا ہے یہ کام ایک دشمن اسلام تو کرسکتا ہے مگر کسی مخلص اہل ایمان سے اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا یہ نہایت جاہلانہ بات ہے جو علم وتحقیق کے نام پر عوام میں پھیلا ئی جارہی ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز نہیں ہے یا ضعیف حدیث سے استدلال کرنا حرام وناجائز ہے یہ دور حاضر کی سلفیت اور غیر مقلدیت کا پروپیگنڈہ ہے۔

(۳) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

من ملک ذا رحم محرم فهو حر

یعنی اگر کوئی شخص اپنے کسی محرم کا مالک ہو جائے تو وہ آزاد ہوگا۔

حضرت امام بخاری فرماتے ہیں کہ لا یصح یعنی یہ حدیث صحیح نہیں ہے امام بخاری کے استاذ ابن مدینی فرماتے ہیں کہ انہ حدیث منکر یعنی یہ حدیث منکر ہے یعنی محدثین کی اصطلاح میں یہ حدیث ضعیف ہے مگر ابن اثیر نہایہ میں فرماتے ہیں

والذى ذهب اليه اكثر من اهل العلم من الصحابة والتابعين واليه ذهب ابو حنيفة واصحابه

واحمدان من ملک ذا رحم محرم عتق علیه ذکرا کان اوانثی

(ایضاص۲۹)

یعنی اسی حدیث پر اکثر صحابہ وتابعین کا عمل ہے اور اسی کے قائل حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب ہیں اور یہی مذہب امام احمد کا بھی ہے یعنی ان حضرات کے یہاں کوئی شخص اپنے کسی ذی رحم کا مالک ہو جاتا ہے تو وہ محرم آزاد ہو جائے گا خواہ وہ محرم مذکر ہو یا مونث
۔

ذرا آپ اندازہ لگائیں کہ ایک حدیث امام بخاری اور ابن مدینی کی تحقیق میں ضعیف ہے مگر ان سے پہلے علماء کے نزدیک وہ ایسی صحیح تھی کہ صحا
بہ وتابعین میں سے اکثریت کا اس پر عمل تھا اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور اہل سنت امام احمد بن حنبل نے اسے قبول کر کے اس کو اپنا مذہب بنایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعد کے ادوار میں جو حدیث ضعیف قرار پائے کوئی ضروری نہیں ہے کہ دور اول یعنی صحابہ وتابعین کے زمانہ میں بھی وہ حدیث ضعیف ہو اس لیے مطلقاً ضعیف حدیث کا انکار کرنا قطعا درست اور جائز نہیں ہے۔

میں مضمون کی طوالت سے بچنے کے لیے اس وقت صرف انہیں مثالوں پر اکتفاء کرتا ہوں ورنہ ترمذی شریف سے بلا مبالغہ میں پچا سوں کیا سیکڑوں حدیثیں ایسی نکال سکتا ہوں جن کے بارے میں محدثین کا فیصلہ ہے کہ وہ ضعیف ہیں مگر اہل علم نے انکو قبول کیا ہے اور ان پر عمل کی بنیا درکھی ہے اور یہاں اہل علم سے مراد ہما شا نہیں ہیں بلکہ صحابہ وتابعین اور ائمہ فقہ وحدیث ہیں۔

ایک بات یہاں نکتہ کی اور یا درکھئے کہ امام ترمذی کسی حدیث کے بارے میں فیصلہ اگر یہ کریں کہ وہ محدثین کے یہاں ضعیف ہے اور پھر یہ کہیں کہ اسی پر اہل علم کا عمل ہے تو گویا یہ امام ترمذی کی طرف سے اس
حدیث کی تصحیح ہے یعنی امام ترمذی صرف اصول محدثین پر اس کو ضعیف کہہ رہے ہیں ورنہ حقیقت کے اعتبار سے وہ حدیث ان کے نزدیک پا یہ ثبوت کو پہونچی ہوئی ایک واقعی حقیقت ہے اگر ایسا نہ ہوتا اور وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی واقعی حدیث نہ ہوتی تو صحابہ کرام اور تابعین کا اس پر عمل ہرگز نہ ہوتا۔

جس طرح امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ محدثین کی اصطلاح کے اعتبار سے ضعیف حدیث کو ذکر کرتے ہیں پھر یہ کہہ کر کہ اس پر فقہاء ومحدثین وصحابہ وتابعین کا عمل اس حدیث کی صحت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اسی طرح حضرت امام ابو داؤد اپنی کتاب میں اور امام نسائی اپنی کتاب اور ابن ماجہ اپنی کتاب میں یہی طرز اختیار کرتے ہیں یعنی یہ حضرات عام طور پر انہیں حدیثوں کو ذکر کرتے ہیں جس دور اول میں مسلمانوں کا عمل رہا ہے ان کتابوں میں گنتی کی چند ہی حدیثیں ایسی ہوں گی جو سنداً ایسی ضعیف ہوں جن پر عمل کرنا جائز نہ ہوگا ابو داؤد اور نسا ئی میں شاذ ونادر اس طرح کی حدیثیں ہیں ابن ماجہ میں کچھ ایسی حدیثیں ضرور ہیں جن پر لوگوں نے شدید جرح کی ہے امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ خود اپنی کتاب کی احادیث کے بارے میں فرماتے ہیں۔

اما ھذہ المسائل الثوری ومالک والشافعی فھذہ الاحادیث اصولھا . (رسالۃ ابی داود ص ۴۱)

یعنی امام ثوری امام مالک کے اور امام شافعی کے جو مسائل ہیں تو میری کتاب کی حدثیں ان کی اصل ہیں یعنی عام طور پر ان ائمہ کے مذاہب کی بنیاد انہیں احادیث پر ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اگر چہ ابو داؤد کی کچھ حدثیں اصول محدثین ضعیف بھی ہو تو بھی ان ائمہ کرام نے ان احادیث پر اپنے قول اور اپنے فقہ کی بنیاد رکھی ہے یعنی یہ تمام احادیث ان ائمہ کرام کے یہاں معمول بہا ہیں اور جب ان ائمہ کرام نے ان کو احکام میں قبول کیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ان ائمہ کرام کے نزدیک فی الاصل یہ احادیث ضعیف اس معنی میں نہیں ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نہیں ہیں بلکہ محض اصول محدثین پر ضعیف ہیں اور جو احادیث محدثین کے اصول پر ضعیف ہوں انکا ترک کرنا کسی امام کے یہاں ضروری نہیں ہے الا یہ کہ ان ائمہ کرام کو خود اس کا ضعف اتنا واضح ہو کہ اس کی نسبت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنا درست نہ ہو۔

امام ابو داؤد مزید فرماتے ہیں۔

والاحادیث التی وضعتھا فی کتاب السنن اکثر ھا مشاھیر ایضا ص ۴۷

یعنی میں نے اپنی سنن میں جو احادیث داخل کی ہیں ان میں سے بیشتر مشہور ہیں یہاں مشہور ہونے کے یہی مطلب ہے کہ عام طور پر ان پر فقہاء اور ائمہ کا عمل ہے اگر چہ وہ اس صطلاحا ضعیف ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے صحیح ہیں۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام ابو داؤد نے جن احادیث کو ذکر کر کے ان پر سکوت اختیار کیا ہے وہ چار قسم کی ہیں۔

(۱) بعض وہ ہیں جو بخاری و مسلم میں موجود ہیں یا وہ صحیح کی شرط پر ہیں۔

(۲) بعض وہ ہیں جو حسن لذاتہ کے قبیل کی ہیں۔

(۳) بعض وہ ہیں جو حسن لغیرہ ہیں (حافظ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں قسمیں زیادہ ہیں)

(۴) بعض وہ ہیں جو ضعیف ہیں۔

پھر فرماتے ہیں۔

وکل ھذہ الاقسام عندہ تصلح للاحتجاج بھا النکت علی ابن الصلاح (ص ۴۲۵)

یعنی تمام قسمیں امام ابو داؤد کے نزدیک حتجاج کے قابل ہیں دیکھئے محدثین کے نزدیک ضعیف حدیث سے حجت پکڑی جاتی تھی اور اسی وجہ سے ان محدثین نے ضعیف احادیث کو اپنی کتابوں میں داخل کیا ہے مگر آج ان ضعیف احادیث کو ہمارے سلفی دوستوں نے ایسا شجر ممنوعہ بنا رکھا ہے کہ اس قریب بھی جانا ان کے نزدیک حرام ہے، اور اس طرح انہوں نے احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک

بہت بڑے حصہ کو چھوڑ رکھا ہے اور اس کا انکار کیا ہے اور اپنی اس بے راہ روی پر افسوس کرنے اور شرمندہ ہونے کے بجائے دوسروں کو طعنہ دیتے ہیں کہ فلاں امام ضعیف حدیث پر عمل کرتا ہے اور فلاں مسئلہ میں حدیث ضعیف ہے خوب جان لیں کہ ضعیف حدیث کا مطلقاً انکار کرنا یہ دور جدید کا فتنہ ہے اور اس فتنہ کی البانی اور اس کے شاگردوں نے خوب آبیاری کی ہے۔ محدث شام شیخ ابوغدہ فرماتے ہیں۔

محدثین ائمہ مقد میں اپنی کتابوں میں ضعیف احادیث بھی ذکر کیا کرتے تھے تا کہ ان پر بھی عمل کیا جائے اور ان سے مسائل شرعیہ میں دلیل پکڑی جائے ضعیف احادیث سے ان کو پرہیز نہیں تھا اور نہ ان احادیث ضعیفہ کو وہ منکر اور پس پشت ڈالنے والی بات جانتے تھے۔

جیسا کہ آج بعض مدعیوں کا دعویٰ ہے ظفر الامانی ص ۱۷۶)

پھر انہوں نے حافظ ابن عبد البر کی کتاب التمہید سے ان کا یہ کلام نقل کیا ہے ورب حدیث ضعیف صحیح المعنی ، یعنی بہت سی احادیث سند کے اعتبار سے ضعیف تو ہوتی ہیں مگر معنی کے اعتبار سے صحیح ہوتی ہیں۔

اور معنی ہی تو اصل ہے سند تو محض حدیث تک پہونچنے کا ذریعہ ہے اگر ذریعہ خراب ہے اور اصل صحیح ہے تو اصل کو اختیار کرنے میں کو ن سی چیز مانع ہے اور محض ذریعہ کی خرابی کی وجہ سے اصل ہی کو چھوڑ دیا جائے اور اسکا انکار کیا جائے یہ کون سی عقلمندی کی بات ہے۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا سلفیوں کے نزدیک شاید کوئی دوسرا محدث نہ ہو صحیح بخاری کے سوا ان کی تمام کتابیں ضعیف احادیث سے بھری پڑی ہیں الادب المفرد میں تو ان کی اتنی ضعیف احادیث ہیں کہ بعض البانیوں کو اس کے دو ٹکڑے کردینے پڑے یعنی صحیح الادب المفرد اور ضعیف الادب المفرد اگر ضعیف احادیث مطلقا قابل رد ہوتیں تو امام بخاری جیسا محدث ان کو اپنی کتاب میں کیوں ذکر کرتا۔

اور میں تو کہتا ہوں کہ صحیح بخاری میں بھی امام بخاری نے تعلیقاً جن

احادیث اور اثار کو ذکر کیا ہے اس میں بہت سے سنداً ضعیف ہیں نمونہ کے طور پر اس کی تین مثالیں پیش کرتا ہوں۔

(۱) امام بخاری نے باب قائم کیا ہے باب من لم یر ا الو ضوء الامن المخر جین من القبل والد بر ،

یعنی یہ باب یہ مسئلہ بیان کرنے کے لیے کہ وضو صرف اسی صورت میں ٹوٹتا ہے جب پیشاب پاخانہ کے راستہ سے کوئی چیز خارج ہو اس کے ضمن میں امام بخاری نے حضرت جابر کی یہ حدیث تعلیقاً نقل کی ہے، وقال جا بر بن عبد اللہ اذا ضحک فی الصلوٰۃ اعادۃ الصلو ۃ ولم یعد الو ضو یعنی اگر نماز میں کوئی ہنسا تو صرف نماز کو دھرائے گا وضوء کو نہیں، یہ حدیث مرفوعاً ضعیف ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں واخرجہ الد ار قطنی من الطر یق اخریٰ مر فو عا ولکن ضعفھا یعنی امام دار قطنی نے اس کو دوسری سند سے مرفوعاً ذکر کیا ہے مگر اس کو ضعیف قرار دیا ہے حافظ ابن حجر کہتے ہیں، صحیح یہ ہے کہ حضرت جابر کا قول ہے، مگر حضرت جابر کا قول بھی تو حدیث موقوف ہوئی اور حدیث موقوف بھی ضعیف احادیث کی قسموں میں سے ہے۔

غیر مقلدین کا عام نعرہ ہے، در موقوفات صحابہ حجت نیست، یعنی

صحابہ کرامؓ کی موقوف حدیثوں میں حجت نہیں ہے۔ بہر حال یہ حدیث موقوف ہوتو بھی ضعیف اور مرفوع ہوتو بھی ضعیف۔اور یہ ضعیف حدیث بخاری کے یہاں قابل احتجاج ہے اور امام بخاری نے اس کو اپنی صحیح میں تعلیقاً ذکر کیا ہے۔

(۲) امام بخاری نے باب قائم کیا ہے باب وجوب الصلوٰۃ فی الثیاب

یعنی اس کا بیان کہ نماز کپڑوں میں پڑھنا واجب ہے، پھر فرماتے ہیں ویذکر عن سلمۃ بن الاکوع ان النبی ﷺ یزرہ ولو بشوکۃ

یعنی حضرت سلمہ بن اکوع سے روایت کی جاتی ہے کہ آنحضور ﷺ بٹن لگایا کرتے تھے اگر چہ کانٹا ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت سلمہ ابن اکوع کی یہ حدیث ضعیف ہے۔خود امام بخاری فرماتے ہیں فی اسنادہ نظر یعنی اس کی سند میں کلام ہے، یعنی سنداً یہ حدیث ضعیف ہے، دیکھئے امام بخاری کے نزدیک یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے مگر پھر بھی اس سے وہ استدلال کررہے ہیں اور اپنی کتاب میں درج کرتے ہیں۔

(۳) حضرت امام بخاریؒ نے باب قائم کیا ہے باب مایذکر فی الفخذ۔یعنی باب ران کے بیان میں۔یعنی ران کا شمار شرمگاہ میں ہے یا

نہیں اس کے ضمن میں امام بخاری فرماتے ہیں ویروی عن ابن عباس وجرهد ومحمد بن جحش عن النبی ﷺ الفخذ عورۃ یعنی حضرت ابن عباس حضرت جرہد اور حضرت محمد بن جحش سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ران شرمگاہ ہے، جرہد کی سند سے جو حدیث ہے وہ خود امام بخاری کے نزدیک ضعیف ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں ضعفہ المصنف فی التاریخ للاضطراب فی اسنادہ یعنی اس حدیث کو مصنف یعنی امام بخاری نے اپنی تاریخ میں ضعیف قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف کے نزدیک اس کی سند میں ا ضطراب ہے۔

اور حضرت ابن عباسؓ والی حدیث بھی ضعیف ہے اس کی سند میں ایک راوی ابو یحییٰ قتات ہے، حافظ ابن حجر اس کے بارے میں فرماتے ہیں وھو ضعیف مشھور بکنیۃ یعنی وہ ضعیف ہے اپنی کنیت سے مشہور ہے۔

اور حضرت محمد بن جحش والی حدیث بھی صحیح نہیں ہے اس کی سند میں ایک راوی ابو کثیر ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں لم اجد فیہ تصریحاً بتعدیل یعنی میں نے کسی محدث کو نہیں پایا کہ اس نے صراحتاً اس کو عادل کہا ہو۔

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ الفخذ عورۃ والی حدیث تین سندوں سے تین صحابہ کرامؓ سے مروی ہے، اور اس میں سے ایک حدیث بھی محدثین کے قاعدہ کے مطابق صحیح نہیں ہے، جرہد والی حدیث کو خود امام بخاری نے صراحۃً ضعیف کہا ہے مگر ان تمام کے باوجود حضرت امام بخاری ان تینوں حدیثوں کو اپنی سب سے صحیح کتاب بخاری شریف میں لائے ہیں اور ان احادیث کا ضعیف ہونا امام بخاری کو ان سے استدلال کرنے سے مانع نہیں بنتا کیا امام بخاری کے اس طرز سے یہ حقیقت نہیں کھلتی کہ ضعیف حدیث کا مطلقاً انکار کرنا متقدمین محدثین کا طریقہ نہیں تھا اور ان کے نزدیک ضعیف حدیث سے استدلال کرنا اور حجت پکڑنا ممنوع نہیں تھا یہ تو اس زمانہ کی بدعت ہے جس کے ایجاد

کا سہرا دور حاضر کے سلفیوں اور البانیوں کے سر ہے

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اصطلاحاً حدیث ضعیف ہوتی ہے اور اس کا مضمون خلاف قیاس ہوتا ہے یعنی قیاس کا تقاضا کچھ ہوتا ہے اور حدیث کا مضموں کچھ ہوتا ہے تو ایسی صورت میں تمام فقہاء خصوصاً ائمہ اربعہ قیاس کے مقابلہ میں اس ضعیف حدیث پر عمل کرتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں یہ بات تو پایہ شہرت کو پہنچ چکی ہے کہ

ان کا مذہب تھا الحدیث الضعیف اولیٰ من القیاس یعنی ضعیف حدیث پر عمل کرنا قیاس پر عمل کرنے سے بہتر ہے، ابن قیم فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل کا بھی یہی مذہب ہے پھر فرماتے ہیں۔

ولیس احد من الائمة الاهو موافقة على هذا الاصل من حيث الجملة فان مامنهم احد الاوقد قدم الحديث الضعيف على القياس .

یعنی عام طور پر سبھی ائمہ اس بارے میں امام احمد کے موافق ہیں ائمہ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ضعیف حدیث کو قیاس پر مقدم نہ رکھتا ہو

(اعلام الموقعین ص ۲۵ ج ۱)

پھر ابن قیم نے ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک سے اس کی کئی مثالیں دی ہیں مثلاً امام ابوحنفیہ کے بارے میں کہا کہ۔

امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ نماز میں قہقہہ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ وضو نہ ٹوٹے اس لئے کہ ناقض وضو فی الاصل وہ چیز ہے جو پیشاب پاخانہ کے راستہ سے نکلے قہقہہ سے وضو ٹوٹنے کی کوئی وجہ عقلاً سمجھ میں نہیں آتی ہے مگر امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے پیش نظر وہ حدیث ہے جس میں قہقہہ سے وضو ٹوٹنے کا حکم ہے۔

امام مالک علیہ الرحمہ کے مذہب کے بارے میں فرمایا کہ اس بارے میں امام مالک کا مذہب سب سے وسیع ہے، یعنی وہ ہر طرح کی ضعیف حدیث کو خواہ مرسل ہو یا منقطع یا موقوف قیاس پر مقدم رکھتے ہیں۔

امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ مکہ مکرمہ میں اوقات ممنوعہ اور مکروہہ میں بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے حالانکہ اس بارے میں جو حدیث ہے وہ ضعیف ہے جب کہ قیاس کا تقاضا ہے کہ اوقات مکروہہ میں نماز ہر جگہ مکروہ ہو خواہ مکہ ہو یا مکہ کے علاوہ کوئی دوسری جگہ، مگر امام شافعی نے قیاس پر ضعیف حدیث کو مقدم کیا۔

غرض امام احمدؒ، امام شافعیؒ امام مالکؒ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ سب اسی کے قائل ہیں کہ قیاس پر ضعیف حدیث کو مقدم کیا جائے گا تو کیا کسی کے وہم وگمان میں یہ بات آسکتی ہے کہ ضعیف حدیث ایک شی باطل ہو پھر بھی ان ائمہ نے جن کا اسلام میں مقام ومرتبہ سب کو معلوم ہے اس سے مسائل شرعیہ میں دلیل لائیں اور شرعی مسائل کی اس پر بنیاد رکھیں

علامہ ابن حزم کے متعلق اہل علم کو معلوم ہے کہ وہ پکے ظاہری تھے اور دنیائے غیر مقلدیت کے بے تاج بادشاہ تھے لیکن ان کو بھی

بہت سے

مسائل میں ضعیف احادیث کو قبول کرنا پڑا، اپنی مشہور کتاب محلی میں ایک جگہ فرماتے ہیں

هـذا الاثـروان لـم يكن ممايحتج بمثله فلم نجد عن رسول الله ﷺ غيره وقد قال احمد بن حنبل ؒ

ضعيف الحديث احب الى من الراى (ص ۱۴۸ ج ۴)

یعنی ہم نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے اس جیسی حدیث کو اگر چہ حجت نہیں بنایا جاتا مگر ہمیں اس کے علاوہ آنحضور ﷺ کی کوئی دوسری حدیث ملی نہیں اور امام احمد حنبل ؒ کا قول ہے ضعیف حدیث مجھے رائے سے زیادہ پسند ہے (۱)

حافظ ابن عبدالبر جلیل القدر محدث ہیں وہ فرماتے ہیں۔

لـم يثبت عن النبى ﷺ فى نصاب الذهب شئ الامار وى الحسن بن عمارة وهومجمع على ترك حديثه لكن عليه جمهور العلماء

یعنی آنحضور اکرم ﷺ سے سونے کے نصاب کے بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے ہاں ایک حدیث ہے جو حسن بن عمارہ کی سند سے ہے

مگر حسن بن عمارہ کے متروک ہونے پر محدثین کا اجماع ہے (یعنی ان کی یہ حدیث اجماعاً ضعیف ہے) لیکن جمہور کا عمل اس حدیث کے مطابق ہے (۲) (زرقانی علی المؤطا ص ۹۷ ج ۲)

(۲) حسن بن عمارہ حضرت علی سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضور اکرم ﷺ نے فرمایا ھاتواز کوٰۃ الذھب من کل عشرین دینار أنصف دینار یعنی سونے کی زکوٰۃ بیس دینار میں سے نصف دینار نکالو۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ آج کے مدعیان عمل بالحدیث ائمہ دین کے اس

(۱) ابن حزم کی یہ غیر مقلدیت بھی دیکھئے کہ ضعیف حدیث سے استدلال کرنے کے لئے وہ امام احمد کی تقلید کررہے ہیں ایک طرف ان کی کتابوں میں تقلید کے خلاف ایک طوفان ہے اور دوسری طرف امام احمد کی تقلید کا قلادہ بھی اپنے گلے میں علی الاعلان ڈالا جارہا ہے معلوم ہوا کہ بلا تقلید کے گاڑی چلنے والی نہیں ہے

طرز عمل کے خلاف ایک طوفان برپا کئے ہوئے ہیں اور جو عمل اجماعی طور پر جائز تھا اسی کو یہ حضرات حرام اور ناجائز قرار دے رہے ہیں اور اس زعم باطل

میں مبتلا ہیں کہ وہ حدیث رسول ﷺ کی خدمت کررہے ہیں ان کے طرز عمل نے امت کے ایک بڑے طبقہ میں احادیث کا استخفاف پیدا کر دیا ہے یہ لوگ بڑے حقیرانہ انداز میں ضعیف حدیث کا ذکر کرتے ہیں انہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ جس طرح قرآن کی کسی آیت کا استخفاف وانکار حرام اور کفر ہے رسول پاک ﷺ کی احادیث کا استخفاف بھی حبط اعمال کا باعث ہے جب تک کہ دلائل قطعیہ کسی حدیث کے حدیث نہ

ہونے پر قائم نہ ہو جائیں محض وہم وگمان کی بنیاد پر اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جب کہ وہ حدیث دور اول میں اسلاف میں متداول اور معمول بہ رہی ہو اس کا انکار کرنا تو بڑی جرأت کی بات ہے۔

حاصل گزارش یہ ہے کہ ضعیف حدیث کا ائمہ متقدمین نے مسائل شرعیہ میں اعتبار کیا ہے اور اس پر اپنے عمل کی بنیاد رکھی ہے اس کا انکار کرنا دن کے اجالے میں سورج کا انکار کرنا ہے۔

یہ گفتگو تو احکام اور مسائل کے سلسلہ کی تھی کہ ائمہ دین نے مسائل اور احکام میں ضعیف حدیث کا اعتبار کیا ہے یا نہیں، باقی رہا فضائل اور ترغیب وترہیب کے بارے میں ضعیف حدیث کو قبول کیا جائے گا یا نہیں، تو جمہور ائمہ فقہ وحدیث کا مذہب یہ ہے کہ فضائل میں اور ترغیب وترہیب میں

ضعیف احادیث مقبول ہوں گی، چونکہ یہ بات عام طور پر اہل علم کو معلوم ہے اس وجہ سے ہم اس بارے میں اختصار سے کام لیتے ہوئے اکابر محدثین سے چند نقول پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم اور غیر مقلدین اور سلفیوں کے منہ پر مہر لگانے والی بات یہ ہے کہ حضرت امام بخاریؒ کی کتاب الادب المفرد جن کو پڑھنے کا اتفاق ہوا ہوگا اسے خوب معلوم ہوگا کہ امام بخاری نے اس کتاب میں فضائل اور ترغیب وترہیب کے بارے میں پچاسوں حدیثیں ضعیف نقل کی ہیں اور ان کا ضعف واضح بھی نہیں کیا ہے۔یعنی یہ بھی نہیں بتلایا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس سے معلوم ہوا کہ فضائل اور ترغیب وترہیب میں عام طور پر محدثین کے یہاں ضعیف احادیث پر عمل تھا۔حتی کہ امام بخاری علیہ الرحمہ فضائل کے باب میں بلا تکلف ضعیف احادیث سے استدلال کیا کرتے ہیں۔

شیخ ابوغدہ فرماتے ہیں حضرت امام بخاری نے الادب المفرد میں فضائل کے باب میں ضعیف احادیث کے قبول کرنے کی جو روش اختیار کی ہے یہی طریقہ ان کے شیخ امام احمد کا بھی تھا جیسا کہ ان کی کتاب الزہد سے واضح ہے۔اور یہی طریقہ اس سے پہلے حضرت عبداللہ بن مبارک کا بھی تھا

جیسا کہ ان کی کتاب کتاب الزہد والرقائق سے واضح ہے۔اسی طرح جن لوگوں نے بھی زہد اور رقائق کے بارے میں تالیف کی ہے ان تمام محدثین نے فضائل میں ضعیف احادیث سے استدلال کیا ہے (۱)

بلکہ امام بخاریؒ تو اپنی سب سے صحیح کتاب صحیح بخاری میں بھی ضعیف احادیث سے استدلال کرتے ہیں اور اس کی وجہ ان کے مدافعین نے یہی بیان کی ہے کہ چونکہ اس حدیث کا تعلق فضائل اور ترغیب وترہیب سے ہے،اس وجہ سے امام بخاری نے اس میں زیادہ تشدد سے کام نہیں لیا،مثلاً بخاری کا ایک راوی ہے محمد بن عبدالرحمٰن الطفاوی جس کے

بارے میں ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ منکر الحدیث ہے یہ منکر حدیثوں کو بیان کرتا ہے بخاری میں اس کی تین روایتیں ہیں ایک روایت کتاب الرقاق میں ہے اس روایت کو بیان کرنے

(۱)ظفر الامانی جو شیخ ابو غدہ کی تحقیق و تعلیق سے شائع ہوئی اس کا صفحہ

۲۶۲ سے ص ۲۸۶ تک پڑھو، اس موضوع پر شیخ نے بڑی محققانہ اور منصفانہ گفتگو کی ہے

والا تنہا یہی طفاوی ہے۔اور منکر الحدیث راوی کی متفرد روایت ضعیف شمار ہوتی ہے، اب بخاری پر اعتراض ہوا کہ انہوں نے اپنی صحیح میں ضعیف حدیث کو کیوں ذکر کیا، تو اس کا جواب حافظ ابن حجر نے یہ دیا ہے۔

فهذا الحديث قدتفرد به الطفاوی وهو من غرائب الصحيح وكان البخاری لم يتشدد فيه لكونه من احاديث الترغيب و الترهيب (مقدمہ فتح الباری ص ۴۴۱)

یعنی اس حدیث کا بیان کرنے والا تنہا طفاوی ہے، یہ روایت بخاری کی غریب روایتوں میں سے ہے (یعنی ضعیف ہے) گویا امام بخاری نے

اس روایت میں تشدد سے کام نہیں لیا اس لئے کہ اس حدیث کا تعلق ترغیب و ترہیب سے ہے۔

جائے عبرت ہے ان لوگوں کے لئے جو امام بخاری کو حجت ثبت اور امیر المؤمنین فی الحدیث ہونے کا دم بھی بھرتے ہیں، اور ان کی کتاب کے اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہونے کی نغمہ سرائی بھی کرتے ہیں اور خود بخاری کا ضعیف حدیث کے سلسلہ میں کیا پیمانہ رہا ہے اس سے غافل بنے رہتے ہیں اور مطلقاً ضعیف احادیث کا حتی کہ فضائل میں بھی ضعیف حدیث سے استدلال کو حرام جانتے ہیں، اگر ان کی بات کسی بھی درجہ میں صحیح مان لی جائے تو پھر امام بخاری کی بخاری شریف سے بھی امت کا اعتماد اٹھ جائے گا۔

(۲) بخاری شریف کا ایک راوی ہے فلیح بن سلیمان جس کے بارے میں ساجی فرماتے ہیں کہ من اهل الصدق وكان يهم یعنی وہ اہل صدق میں سے تھا مگر وہمی تھا، یعنی احادیث کے بیان میں بہت زیادہ غلطیاں کرتا تھا یحیٰی بن معین امام نسائی اور امام ابو داؤد نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے ابن عدی فرماتے ہیں کہ له غرائب یعنی اس کے پاس غریب حدیثیں تھیں جب امام بخاری پر اعتراض ہوا کہ ایسے ضعیف راوی سے انہوں نے کیوں روایت کیا تو اس کا جواب حافظ ابن حجر نے یہ دیا

ولم يعتمد عليه البخاری اعتماده علی مالک و ابن عيينه واحزابهما واما اخرج له احاديث اكثرها فی المناقب وبعضهافی الرقاق (ایضاً ص ۴۳۵)

یعنی امام بخاری نے اس راوی پر اتنا اعتماد نہیں کیا ہے جتنا اعتماد امام مالک اور سفیان ابن عیینہ اور ان جیسے محدثین پر کیا ہے، بخاری میں اس کی کچھ حدیثیں ہیں، زیادہ تر کا تعلق مناقب سے ہے اور بعض کا رقاق سے ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مناقب زہد و رقاق میں کمزور روایت سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے خود امام بخاری نے اپنی سب سے صحیح کتاب میں اس کا نمونہ پیش کیا ہے تا کہ کسی سلفی والبانیے کو ضعیف احادیث کے خلاف نعرہ بلند کرنے کا حوصلہ نہ رہے

(۳) بخاری شریف کاایک راوی اسید بن زید الجمال ہے اس کے بارے میں نسائی فرماتے ہیں کہ متروک، یعنی محدثین کے نزدیک یہ متروک ہے، ابن معین فرماتے ہیں حدث باحادیث کذب یعنی اس نے جھوٹی حدیثیں بیان کی ہیں۔ دار قطنی اس کو ضعیف کہتے ہیں ابن عدی کہتے ہیں کہ

اس کی متابعت نہیں کی جاتی ہے ابن حبان کہتے ہیں کہ یروی عن الثقات المنا کیرویسرق الحدیث یعنی یہ ثقہ راویوں سے منکر روایت بیان کرتا تھا اور حدیث چوری کرتا تھا بزار کہتے ہیں کہ لوگوں نے اس کی حدیث کو برداشت کیا ہے حالانکہ اس میں سخت قسم کی شیعیت تھی ابو حاتم کہتے ہیں کہ لوگ اس پر جرح کرتے ہیں اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں قلت لم ارفیه توثیقاً یعنی میں نے کسی کی بھی اس کے بارے میں توثیق نہیں دیکھی یعنی کسی محدث نے اس کو ثقہ نہیں کہا ہے آپ اندازہ لگائیں کہ یہ راوی کیسا ضعیف ہے اور کیسا مجروح ہے مگر اس کی روایت بخاری اپنی صحیح میں لاتے ہیں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ قدروی عنه البخاری فی کتاب الرقاق حدیثاً واحداً یعنی امام بخاری نے کتاب الرقاق میں اس کی ایک حدیث ذکر کی ہے۔

امام بخاریؒ نے گویا فیصلہ کردیا کہ ان کے نزدیک شدید قسم کا مجروح راوی بھی فضائل کے باب میں مقبول ہے اور اس کی روایت کو قبول کیا جائیگا

(۱)

(۴) بخاری شریف کاایک راوی اسماعیل بن مجالد ہے، امام نسائی فرماتے ہیں کہ لیس بالقوی یعنی وہ قوی نہیں ہے دار قطنی فرماتے ہیں ضعیف یعنی یہ ضعیف ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ بخاری نے اس کی صرف ایک حدیث حضرت ابو بکرؓ کی فضیلت کے بیان میں ذکر کی ہے اخرج لہ فی الصحیح حدیثاً واحداً فی فضل ابی بکر رضی اللہ عنہ یعنی امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس کی صرف ایک حدیث حضرت ابو بکرؓ کے فضائل کے بیان میں ذکر کی ہے۔

معلوم ہوا کہ فضائل کے باب میں امام بخاری بھی جمہور کے ساتھ ہیں کہ اس میں ضعیف احادیث سے استدلال کرنا جائز ہے۔

(۵) بخاری شریف کاایک راوی حسن بن ذکوان ہے، امام احمد، ابن معین ابو حاتم، نسائی اور ابن مدینی نے اس کو ضعیف کہا ہے ابن عدی کے نزدیک یہ تدلیس کیا کرتا تھا اور فرماتے ہیں وہ متروک ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ فھذا احد اسباب تضعیفه یعنی اس کا مدلس ہونا اور متروک ہونا اس کے ضعیف ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، اور دوسرا سبب یہ ہے کہ کان قدریا یعنی وہ اعتقاداً بھی اہلسنت والجماعت میں سے نہیں تھا

(۱) آج کل غیر مقلدین اور سلفیوں نے حضرت شیخ زکریاؒ کی کتاب فضائل اعمال کے بارے میں طوفان برپا کررکھا ہے کہ اس کتاب میں ضعیف احادیث ہیں اگر ان میں شرم وحیا ہوگی تو امام بخاری کے ضعیف احادیث کے بارے میں اس عمل کو دیکھ کر اپنی زبان اب بند کرلیں گے ورنہ ایمان کا تقاضا یہ ہوگا کہ امام بخاری کے خلاف بھی وہ لب کشا ہوں

قدری تھا، پھر وہ فرماتے ہیں کہ روی لہ البخاری حدیثاً واحداً فی الرقاق یعنی کتاب الرقاق میں امام بخاری نے اس کی حدیث ذکر کی ہے۔

(۶) بخاری شریف کا ایک راوی ہے سلمہ بن رجاء اس کے بارے میں نسائی فرماتے ہیں کہ ضعیف ہے ابن معین فرماتے ہیں کہ لیس بشی یعنی وہ کچھ نہیں تھا، اس راوی کی ایک حدیث فضائل میں امام بخاری نے ذکر کی ہے حافظ ابن حجر کہتے ہیں لہ حدیث واحد فی الفضائل یعنی اس راوی کی ایک حدیث فضائل کے باب میں امام بخاری نے ذکر کی ہے۔

(۷) بخاری شریف کا ایک راوی سلام بن ابی مطیع ہے ابن عدی فرماتے ہیں کہ لیس بمستقیم الحدیث یعنی وہ ٹھیک حدیث والا نہیں ابن حبان فرماتے ہیں کان سیئ الاخذ لایجوز الاحتجاج بہ یعنی اس کے
حدیث حاصل کرنے کا ڈھنگ خراب تھا اس سے احتجاج درست نہیں ہے، حاکم فرماتے ہیں کہ اس کو غفلت اور سوء حفظ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے اس کی دو حدیثیں اپنی صحیح میں ذکر کی ہیں، ایک کا تعلق فضائل قرآن سے ہے احدھما فی فضائل القرآن (ایضاً ص ۴۰۰)

(۸) بخاری شریف کا ایک راوی عثمان بن ہشیم ہے اس کے بارے میں ہے کہ اس کا حافظ خراب ہو گیا تھا، دار قطنی کہتے ہیں کہ صدوق تھا لیکن بہت زیادہ غلطیاں کرنے والا تھا، امام احمد فرماتے ہیں کہ لیس بثبت کہ وہ ثبت اور پختہ کار نہیں تھا، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے آیۃ الکرسی کی فضیلت میں اس کی حدیث کو ذکر کیا ہے۔

(۹) بخاری شریف کا ایک راوی محمد بن طلحہ بن مصرف الکوفی ہے، ابن سعد کہتے ہیں کہ وہ اپنے باپ سے روایت کرتا ہے حالانکہ اس کا باپ قدیم الموت تھا، لوگ اس کو جھوٹا سمجھتے تھے، امام ابو داؤد کہتے ہیں کہ وہ حدیثوں میں غلطیاں کیا کرتا تھا۔

ابو کامل مظفر بن مدرک کہتے ہیں کہ محدثین میں یہ بات تھی کہ تین آدمیوں کی حدیث سے بچا جاتا تھا، ان میں سے ایک محمد بن طلحہ ہے، ابن
معین نے کبھی اس کو صالح کہا اور کبھی کہا کہ وہ ضعیف ہے امام نسائی فرماتے ہیں کہ وہ لیس بالقوی یعنی وہ قوی نہیں ہے حافظ ابن فرماتے ہیں کہ بخاری شریف میں اس راوی کی تین حدیثیں ہیں ایک کا تعلق فضائل سے ہے حافظ کا لفظ یہ ہے الا انہ فی فضائل الاعمال یعنی اس حدیث کا تعلق فضائل اعمال سے ہے (ص ۴۳۹)

(۱۰) بخاری شریف کا ایک راوی یحییٰ بن ابی زکریا ابو اسحٰق ہے، امام ابو داؤد اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں، ابن معین کہتے ہیں کہ میں اس کے حال سے بے خبر ہوں۔

ابو حاتم کہتے ہیں کہ وہ مشہور نہیں ہے، ابن حبان کہتے ہیں کہ لایجوز الروایۃ عنہ اس سے روایت کرنا جائز نہیں ہے امام بخاریؒ نے ہدیہ کے بیان میں اسکی روایت ذکر کی ہے۔

میں نے یہاں یہ دس مثالیں صرف بخاری شریف سے ذکر کی ہیں تاکہ جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ فضائل اعمال میں اور ترغیب و ترتیب میں ضعیف احادیث سے حجت نہیں پکڑی جاسکتی ان کی آنکھ سے پردہ ہٹ جائے اور انکی زبان پر لگام رہے

امام بخاری رحمۃ اللہ کا یہ طرز عمل بتلا رہا ہے کہ محدثین نے فضائل

کے باب میں ضعیف احادیث اور کمزور راویوں کی روایت سے کبھی گریز کا راستہ اختیار نہیں کیا۔

اب بعض دوسرے ائمہ ومحدثین حضرات کا بھی اس بارے میں فیصلہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) امام حاکم فرماتے ہیں:

واذا روینا فی فضائل الاعمال والثواب والعقاب والمباحات والدعوات تساھلنا فی الاسانید.

یعنی جب ہم فضائل اعمال اور ثواب وعذاب اور مباحات اور دعاؤں کے بارے میں احادیث ذکر کرتے ہیں تو اس میں کمزور حدیثوں کو بھی داخل کرتے ہیں۔ (کتاب الدعاء مستدرک ص ۴۹۰ ج ۱)

(۲) امام احمد فرماتے ہیں:

واذا روینا فی فضائل الاعمال تساھلنا فی الاسانید.

یعنی جب ہم فضائل اعمال کی حدیث ذکر کرتے ہیں تو اس میں کمزور روایتوں کو بھی لاتے ہیں۔ (الکفایہ ص ۲۱۳)

(۳) ابن قدامہ فرماتے ہیں:

النوافل والفضائل لا یشترط صحۃ الحدیث فیھا (مغنی ص ۴۴ ۱۰ ج ۱)

یعنی نوافل اور فضائل میں صحیح حدیث کا ہونا شرط نہیں ہے۔

(۴) شیخ الاسلام ابن تیمیہ شیخ ابو محمد مقدسی سے نقل کرتے ہیں کہ صلوۃ تسبیح پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اگر چہ اس بارے میں جو حدیث ہے وہ ضعیف ہے) **قال الفضائل لا یشترط لھا صحۃ الخبر** ۔لیکن فضائل میں حدیث کا صحیح ہونا شرط نہیں ہے **۔الاختیارات والعملیۃ ص ۱۰۰)**

(۵) ابو حاتم رازی فرماتے ہیں

منھم الصدق والورع المغفل الغالب علیہ والوھم والخطا والسھو ولغلط فھذا یکتب من حدیثہ فی الترغیب والترھیب والزھد والاداب (مقدمہ الجرح والتعدیل)

یعنی روای کی ایک قسم ایسی ہوتی ہے کہ اس میں صدق وررع کی صفت تو ہوتی ہے مگر مغفل ہوتا ہے وہم کا اس پر غلبہ رہتا ہے غلطی اور بھول چوک اس پر غالب رہتی ہے اس طرح کے رایوں کی رواتیں ترغیب وترھیب اور زہد وآداب میں قبول کی جاتی ہیں۔

(۶) امام نووی، امام نووی نے کتاب الاذکار میں بہت سی ضعیف احادیث ذکر کی ہیں اس لیے کہ ان کا تعلق فضائل سے ہے ایک حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں وھو حدیث ضعیف (۱)

(کتاب الاذکار ص ۲۴۹)

لکن احا دیث الفضا ئل یتسا مح فیھا
یعنی یہ حدیث ضعیف ہے مگر فضائل والی احادیث میں شدت اختیار نہیں کیجاتی ہے۔

یہ تحریر طویل ہوتی جارہی ہے، اس طول کلام کی مجھے زحمت اسلئے اٹھانی پڑی کہ جیسا کہ میں عرض کیا کہ موجودہ زمانہ کا ایک بڑا دینی فتنہ ضعیف احادیث کے انکار کا بھی ہے اور اس فتنہ کی آگ بڑھانے والے وہ لوگ ہیں جن کا زعم یہ ہے کہ وہ اہلحدیث ہیں اور اسلاف کے طریقہ پر ہیں، میری اب تک کی گفتگو سے واضح ہو چکا ہے کہ ضعیف حدیث کا انکار کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا یہ اسلاف اور متقدمین محدثین کا طریقہ نہیں رہا ہے، ہمارے محدثین کرام اور فقہاء کرام اور فقہاء عظام نے ضعیف احادیث کو احکام میں بھی قبول کیا ہے اور فضائل میں بھی فضائل میں تو بعض شاذ لوگوں کے علاوہ کسی سے انکار سنا ہی نہیں گیا ہے

(۱) وہ حدیث یہ ہے من احیی لیلتی العید ین لم یمت قبلہ حین یموت القلوب یعنی جو شخص عیدین کی راتوں کو جاگ کر گز ارے یعنی عبادت میں مصروف رہے تو جب دوسروں کے دل مردہ رہیں گے تو اس کا دل مردہ نہیں رہے گا۔
اس لیے اگر اس زمانہ میں کوئی جماعت اس کا انکار کرتی ہے تو وہ محدثین کے
طریقہ سے بھٹکی ہوئی اور گم کردہ راہ جماعت ہے، اس جماعت کا دینی و شرعی امور میں اعتبار نہیں کرنا چاہیے ہمارے لیے سلامتی کا راستہ یہ ہے کہ ہم اسلاف کے طریقہ پر رہیں انہیں کی تقلید واتباع میں دین اسلام کی سلامتی ہے۔
آپ کا سوال تھا کہ محدثین نے اپنی کتابوں میں ضعیف احادیث کیوں ذکر کی ہیں میری اس مفصل گفتگو میں آپ کے سوال کا مفصل جواب موجود ہے اور مختصر جواب یہ ہے کہ محدثین نے اپنی کتابوں میں ضعیف احادیث اسلئے ذکر کی ہیں کہا کہ اسلام کی ساری تعلیمات محفوظ اور مدون رہیں اور امت اس کو اپنی زندگی میں داخل کرے بہت سے شرعی مسائل انہیں ضعیف احادیث سے معلوم ہوتے ہیں اعمال کی فضلیتیں انہیں ضعیف احادیث سے معلوم ہوتی ہیں ترغیب وترہیب کی بہت سی باتیں انہیں احادیث سے معلوم ہوتی ہیں۔
الحمد اولا واخراوا صلی واسلم علی النبی الکریم .

غیر اللہ سے توسل واستعانت

اور غیر مقلدین کا عقیدہ

مکرمی حضرت مولانا محمد ابو بکر غازی پوری صاحب مدظلہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بندہ سال گزشتہ سے زمزم اور آپ کی کتابوں سے مستفید ہو رہا ہے کچھ غیر مقلدین کی صحبت میسر رہی ہے تو ان کی تبلیغ ودعوت سے متاثر ہو کر فقہ حنفی اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا تھا، ایک دوست کی رہنمائی سے زمزم اور آپ کی کتابوں تک رسائی ہوئی اور ان کو پڑھنے کا موقع ملا الحمد للہ سارے شکوک وشبہات ختم ہو گئے اور حضرت امام اعظم سے عقیدت بڑھی اور فقہ حنفی کی عمق وگہرائی وہمہ گیری پر ایمان پختہ

ہوا، غیر مقلدین کے بارے میں اب میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ پکے .... ہیں ان کا کام راہ حق سے کم پڑھے لکھوں کو گمراہ کرنا ہے۔

آپ نے توسل واستعانت بغیر اللہ کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس پر تھوڑا کچھ اور لکھ دیں غیر مقلدین اس کے منکر ہیں کہ ہمارے اکابر کا استعانت بغیر اللہ اور توسل کا عقیدہ نہیں تھا، آپ نے جو کچھ لکھا تھا حوالہ سے لکھا تھا مگر یہ فرقہ بڑا ڈھیٹ واقع ہوا ہے امید ہے کہ آپ توجہ فرمائیں گے۔ والسلام رحمت اللہ کرنول

زمزم!

جب آپ خود یہ لکھ رہے ہیں کہ یہ فرقہ بڑا ڈھیٹ واقع ہوا ہے اور اس کا تجربہ بھی آپ کو ہو چکا ہے تو کیا ضروری ہے کہ اگر اس موضوع پر ہم مزید کچھ لکھ دینگے تو اس فرقہ کا ڈھیٹ پنا ختم ہو جائے گا۔

غیر مقلدین نے غیر مقلدیت اور سلیفت کی آڑ میں جب اسلاف دشمنی کا مظاہرہ شروع کیا تو اللہ نے ان سے قبول حق کی توفیق سلب کر لی ہے اب ان کے عناد وتمرد کا حال یہ ہے کہ اگر آپ ان کے ہاتھ میں چاند سورج بھی لا کر رکھ دیں اور ان کو نہ ماننا ہے تو یہ اس چاند سورج کے وجود کا بھی انکار کر دیں گے قبول حق بلا توفیق الٰہی کے ممکن نہیں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا

کہ غیر مقلدین کو اللہ نے اسلاف دشمنی کی نحوست کی وجہ سے قبول حق کی سعادت سے محروم کر دیا ہے۔

ان کا تو حال یہ ہے کہ قرآن پیش کرو اس کا انکار کر دیں گے، حدیث پیش کرو اس کا انکار کر دیں گے صحابہ کے اقوال پیش کرو ان کا انکار کر دیں گے ائمہ دین کے تو یہ دشمن ہی ہیں بخاری ومسلم کو پیش کرو ان کا انکار کریں گے صوفیاء کی دل آویز باتیں پیش کرو ان کا انکار کریں گے جب کسی کے دل میں انکار رچ بس جائے تو اس سے کسی بات کا منوانا ریتلی زمین میں سرسوں جمانے کے مترادف ہے۔

اب ان پر ایک یہ آفت آئی ہے کہ یہ اپنی جماعت کے بڑے سے بڑے عالم کا انکار کرتے ہیں اس طرح یہ غیر مقلدین اپنی جماعت کے لیے خود ڈیٹنا منٹ بن گئے ہیں ان کا ہر فرد خود ہی ،،ہو حق،، ہے میاں صاحب نواب صاحب حید آبادی صاحب، مبا کپوری

صاحب، شوکانی صاحب، البانی صاحب، غیر مقلدین وقت حاضر کی نگاہ میں ان میں سے کسی کی کوئی حیثیت نہیں، کسی کی بات ان کے لیے قابل قبول نہیں ان کا کوئی اسوہ نہیں ان کا کوئی قدوہ نہیں، دعویٰ کریں گے یہ اہل حدیث ہونے کا مگر یہ سب سے بڑے حدیث کے دشمن ہیں دعویٰ کریں گے یہ محدثین سے محبت کا مگر وقت

آئے گا تو محدثین کا بخیہ ادھیڑ دیں گے، غیر مقلدیت نام ہے اکابر واسلاف کی عظمت وشان کے بخیہ ادھیڑنے کا اسی کو یہ اپنا کمال سمجھتے ہیں اور اسی کو یہ اپنی تحقیق سمجھتے ہیں ان کے بڑوں نے یہی حرکت کی اور زندگی بھر یہی حرکت کرتے رہے، تو چھوٹوں نے ان سے یہی سیکھا ہے، اب یہ چھوٹے اپنے بڑوں کا بھی بخیہ ادھیڑتے ہیں جو بڑوں نے کیا وہی چھوٹے کر رہے ہیں غیر مقلدین کی جماعت میں قریب ہی زمانہ میں ایک عالم گزرے ہیں نام تھا ان کا حافظ عبداللہ روپڑی، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ حافظ صاحب صائم الدھر تھے یعنی ہمیشہ روزہ سے رہتے تھے، روزہ کی صفت ہے کہ آدمی میں تقویٰ پیدا کر دیتا ہے خود قرآن میں اس کا بیان ہے تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی میں اللہ کا ڈر اور خوف پیدا ہو جائے بات کرے تو خلاف حق بات اس کی زبان سے نہ نکلے۔

حافظ عبداللہ روپڑی صاحب صائم الدھر تھے، زندگی بھر روزہ رکھنے کے باوجود ان میں کیسا تقویٰ پیدا ہوا، اس کا اندازہ لگانے کے لیے مولانا کا یہ غلیظ اور فقہ حنفی کے خلاف بغض وکینہ اور حسد سے بھرا ہوا بیان ملاحظہ فرمایئے، حافظ عبداللہ صائم الدھر صاحب ہدایہ اور شرح وقایہ سے نقل کرتے ہیں کہ ان کتابوں میں حنفیہ کی نماز کا طریقہ یہ لکھا ہے فرماتے ہیں:

حنفیہ کی نماز

دیکھئے شرح وقایہ اور ہدایہ وغیرہ میں یہ لکھا ہے

اگر بسم اللہ پڑھ کر کتا ذبح کر کے اس کی کھال کا تہبند بنا کر کھجوروں کے شربت سے وضو کر کے اللہ اکبر کی جگہ خدا بزرگ تر است کہہ کر قرآن مجید کی جگہ کسی آیت کا ترجمہ پڑھ کر جس طرح مرغ چوگہ چگتا ہے اس طرح جلدی جلدی نیچے اوپر ہوتا جائے نہ رکوع سے پیٹھ سیدھی کرے نہ دوسجدوں کے درمیان بیٹھے نہ رکوع سجود قومہ جلسہ میں کچھ پڑھے یہاں تک کہ التحیات بھی نہ پڑھے اور سلام پھیرنے کے بجائے زور سے پاد دے تو بس اس کے ذمہ سے فرض اتر جائے گا خواہ فاتحہ وغیرہ کے ترک سے گناہ گار ہی ہو جائے۔

اہلحدیث کے امتیازی مسائل ص ۱۰۲

یہ ہے صائم الدھر حافظ عبداللہ روپڑی صاحب کے نزدیک ہدایہ اور شرح وقایہ سے حنفیہ کی نماز کا نقشہ، اس قسم کا نقشہ غیر مقلدین کی فیکٹری میں تیار ہوتا ہے نواب صاحب بھوپالی کے بارے میں ان کے لڑکے نے لکھا ہے کہ نواب صاحب بھوپالی ہمیشہ حنفیہ کے طریقہ پر نماز پڑھتے تھے میرا خیال ہے کہ نواب صاحب ضرور زندگی بھر اسی طرح کی نماز پڑھتے رہے ہوں گے۔

خیر بات دور جا پڑی آپ نے توسل اور استعانت بغیر اللہ کی بابت غیر مقلدین کے عقیدہ کے بارے میں مزید کچھ لکھنے کو کہا ہے۔

غیر مقلدین چاہے لاکھ انکار کریں مگر ان کے اکابر کا یہی عقیدہ تھا کہ غیر اللہ سے مدد طلب کرنا اور ان سے توسل کرنا جائز ہے غیر مقلدین کے بڑوں کا اس پر عمل بھی رہا ہے نواب صاحب بھوپالی بہت بڑے غیر مقلدین تھے وہ فرماتے ہیں۔

زمرئہ رائے در افتاد بار باب سنن

شیخ وسنت مددے قاضی شوکاں مددے

نواب صاحب نے اس شعر میں قاضی شوکانی یمنی سے مدد طلب کی ہے، دوسرے مصرعہ کا ترجمہ ہے، اے سنت کے شیخ مدد فرمایئے اے قاضی شوکانی مدد فرمایئے۔

اس صاف صریح شعر کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی یہ کہے کہ نواب صاحب غیر اللہ سے استعانت کو جائز نہیں سمجھتے تو اسکو اپنی عقل کا علاج کرنا چاہیے۔

نواب صاحب کا دوسرا شعر سنیئے:

گفت نواب غزل در صفت سنت تو

خواجہ دیں صلہ قبلہ پاکاں مددے

اس میں بھی دوسرے مصرعہ میں نواب صاحب نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد طلب کی ہے دوسرے مصرعہ کا ترجمہ ہے، اے دیں کے سردار صلہ دیجئے اور اے پاکوں کے قبلہ مدد فرمایئے۔

اگر نواب صاحب استعانت بغیر اللہ کو اور مردوں کی ندا کو جائز نہ سمجھتے تو بھلا یہ شعر ان کی زبان سے کیوں نکلتا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ومنقبت میں نواب صاحب کی ایک طویل عربی میں نعت شریف ہے اصل عربی عبارت نقل کرنے میں طول ہے

اس کے چند شعروں کا ترجمہ سن لیجئے جس کو اصل شعر دیکھنا ہو نواب صاحب کی سوانح حیات میں دیکھ لے۔

اے میرے آقا میرے سہارا اور وسیلہ، اور اے خوشحالی وبدحالی میں میری متاع میں روتا گڑگڑاتا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا آپ کے در پر آیا ہوں آپ کے علاوہ میرا کوئی فریادرس نہیں سوائے رحمۃ اللعالمین میری گریہ رازی پر رحم فرمایئے۔

کیا ان اشعار میں نواب صاحب نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے استعانت اور توسل نہیں کیا ہے؟

نواب وحید الزماں حیدرآبادی صاحب تو صاف صاف لکھتے ہیں کہ غیر اللہ سے توسل مطلقا جائز ہے، زندوں سے بھی اور مردوں سے بھی فرماتے ہیں

التوسل الی اللہ تعالی با نبیائہ والصالحین من عبادہ جائز ویستوی فیہ الاحیاء والاموات (نزل الابرار

یعنی اللہ کے بندوں سے انبیا اور صالحین سے توسل پکڑنا جائز ہے اور اس میں زندہ اور مردہ برابر ہیں۔

یہی نواب صاحب ھدایہ المھدی میں لکھتے ہیں۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سوال مردوں سے نہیں ہوتا بلکہ صلحاء کی ارواح سے ہوتا ہے اور ارواح موت کا ذائقہ نہیں چکھتی ہیں ان پر فناطاری نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ ادراک اور احساس کے ساتھ باقی رہتے ہیں خصوصا انبیاء اور شہدا کی ارواح کیونکہ انبیاء اور شہدا زندوں کے حکم میں ہیں۔نیز اسی
کتاب میں لکھتے ہیں۔

ہاں یہ ضروری ہے کہ یہ استعانت اور طلب مدد ان کی قبروں کے پاس ہو۔

نواب صاحب بھوپالی نے اپنی کتاب التاج المکلل میں جن بزرگوں کا تذکرہ کیا ہے ان تمام کے بارے میں اپنا عقیدہ یہ بیان کرتے ہیں فرماتے ہیں:

اگر چہ یہ لوگ تعداد میں کم ہیں تاہم کیفیت میں بہت زیادہ ہیں اسلئے کہ یہی لوگ کامل مدد کا ذریعہ ہیں۔

غیر مقلدین اپنے اکابر کی ان صریح عبارتوں سے منہ چراتے پھرتے ہیں اور ڈھونگ یہی رچائیں گے کہ ہم غیر مقلدوں کا عقیدہ تو سل اور غیر اللہ سے استعانت اور مدد کرنے کا نہیں ہے، اگر نہیں ہے تو فیصلہ فرمادیں اپنے ان اکابر کے بارے میں یہ لوگ مشرک تھے یا مومن؟

آجکل غیر مقلدین نے ایک طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ اپنے اکابر کی باتوں کا بھی یہ کہہ کر انکار کر دیتے ہیں کہ ہم تو صرف کتاب وسنت کی مانیں گے اکابر نے کیا لکھا ہے اس سے ہمیں مطلب نہیں ہے سوال یہ ہے کہ ان اکابر کے سامنے ان چھوٹوں کی کیا حقیقت ہے اگر آپ اپنے اکابر کا
انکار کرتے ہیں تو صاف صاف ان کے بارے میں فیصلہ کریں کہ جنہوں نے اس طرح کی باتیں اپنی کتابوں میں لکھی ہیں ان کا یہ عقیدہ تھا یا نہیں اور اگر تھا تو اور یقیناً تھا تو شرکیہ عقیدہ رکھنے کے باوجود ان کو آپ اہلحدیث اور اہلسنت والجماعت کا مقتدی اور پیشوا کیوں سمجھتے ہیں اور ان کی عزت وتکریم کیوں کرتے ہیں؟ براہ کرم غیر مقلدین اس کا جواب دیں۔

محمد ابوبکر غازی پوری

کیا مذہب حنفی حکومت کی طاقت سے پھیلا؟

محترم المقام زید مجدکم و متعنا اللہ بطول حیاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ　　　　مزاج گرامی

زمزم شمارہ نمبر ۶ جلد نمبر ۸ وقت پر مل گیا، اللہ آپ کو جزائے خیر دے آپ نے جامعہ سلفیہ بنارس کے محدث و مفتی کے جہل کو طشت ازبام کردیا، اس کی گندی تحریرات کا جواب لکھنا اور اس کی جناتی زبان کو سمجھنا واقعی ایک مجاہدہ ہے یہ شخص اکابر واسلاف کے بارے میں کتنا زبان دراز اور گستا

خ ہے اس کا اندازہ زمزم سے ہوتا رہتا ہے اب ایسے ہی لوگ مسند حدیث کو زینت دیں گے انا اللہ وانا الیہ رجعون۔

ایک سوال یہ ہے کہ غیر مقلدوں کا کہنا یہ ہے کہ حنفی مذہب کے پھیلنے میں حکومت کی طاقت کا دخل رہا ہے، حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ چونکہ قاضی القضاۃ تھے وہ اسلامی صوبوں میں قاضی کے عہدہ پر انہیں کو مقرر کرتے جو مسلک حنفی کا پیرو ہوتا براہ کرم اس بارے میں اپنے خیالات سے آگاہی عطا فرمائیں۔

والسلام نور احمد، احمد روف بنگلور کرناٹک

زمزم!

جامعہ سلفیہ بنارس کے شیخ الحدیث صاحب کی تحریرات کا پڑھنا اس کا سمجھنا اور پھر اس کا جواب دینا واقعۃً مجاہدہ ہے اور اس مشکل کام کو مولانا نورالدین نوراللہ الاعظمی نے واقعی بخوبی انجام دیا، میں نے تو جب بھی اس شخص کی کوئی کتاب پڑھنے کے لیے ہاتھ میں لیا تو میرا سر درد کرنے لگا۔

مولانا نورالدین کے مضمون کی عام طور پر تعریف کی گئی ہے اور جامعہ سلفیہ میں محدث صاحب پر لعن وطعن ہورہا ہے اس لئے کہ موصوف کی اس کتاب سے جس کا مولانا نورالدین نے جائزہ لیا ہے، جامعہ کے ذمہ

داران بھی خوش نہیں ہیں ان کی اس طرح کی تحریروں سے جامعہ سلفیہ بنارس کا وقار مجروح ہورہا ہے اور جامعہ کی ساکھ کو نقصان پہونچ رہا ہے، جامعہ سلفیہ بنارس کے طلبہ نے بھی محدث صاحب کا ناک میں دم کردیا ہے وہ ان سے پوچھ رہے ہیں جناب درس قرون کا ترجمہ دس ہزار سال کس ڈکشنری میں ہے قرآن پاک کی آیات کا غلط ترجمہ اور اس کا معنی غلط بیان کرنے پر بھی طلبہ نے ان کی خوب کھینچائی کی ہے جیسا کہ معلوم ہوا ہے کہ موصوف کا حال اس وقت جامعہ میں بڑا نازک ہے آپ کے سوال کا جواب یہ ہے اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی ایسا دور نہیں گزرا ہے کہ طاقت کے ذریعہ سے کسی مسلمان کو مذہب کے بدلنے پر یا اس کو قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔

اصل میں غیر مقلدین نے یہ بات اسلام کے دشمن یہود نصاری سے لی ہے ان اسلام کے دشمنوں نے دنیامیں اسلام کے پھیلنے کا سبب تلوار کو بتلایا ہے یعنی تلوار کے زور سے اور طاقت وقوت کے ذریعہ اسلام پھیلا ہے یہ اسلام دشمنوں کا پروپیگنڈہ ہے جس کو بڑی قوۃ وطاقت سے پھیلایا گیا ہے تا کہ عام لوگوں کی نگاہ اسلام کی معنوی خوبیوں سے پھری رہے۔

انہیں دشمنان اسلام سے غیر مقلدوں نے بھی سبق سیکھا ہے اور چونکہ مذہب حنفی کا پھیلاؤ اوراس کی آفاان کی نگاہوں میں کانٹوں کی طرح

کھٹکتی ہے اس وجہ سے مذہب حنفی کی واقعی خوبیوں کا اعتراف ان سے ہوتا نہیں ان کاظرف اتنا کشادہ نہیں ہے کہ وہ حق بات کو اپنی زبان سے نکالیں۔

حضرت امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ قاضی القضاۃ تو بلاشبہ رہے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ قضاء کے عہدہ پر احناف ہی کو وہ عام طور پر مقرر کرتے تھے مگراس سے یہ کیسے لازم آ گیا ہے کہ مذہب حنفی حکومت کی طاقت سے پھیلا جج کو یہ پاور کبھی حاصل رہا ہے کہ وہ لوگوں کا مذہب تبدیل کرے؟ جج اور قاضی کا کام تو عدالت تک محدود ہوتا ہے چونکہ حضرت امام ابو یوسف کے زمانہ میں حنفی فقہ کے علاوہ کوئی دوسری فقہ مرتب اور مدون ہوا ہی نہیں تھا صرف فقہ حنفی وہ فقہ تھی جس کی باقاعدہ تبویب وتدوین ہو چکی تھی اس لیے حکومت کو عدالتی فیصلہ کرنے میں اسی فقہ سے مدد ملا کرتی تھی تو ظاہر ہے کہ احناف قاضی ہی جو اپنے فقہ سے بخوبی واقف تھے انہیں کو عدالت میں قاضی اور جج مقرر کرنا زیادہ مناسب تھا جہاں فقہ مالکی کا شیوع تھا وہاں اس زمانہ میں مالکی کا قاضی مقرر ہوتا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی کتاب بستان المحدثین میں ہے۔

در اندلس یحی بن یحی رانزد سلطان آں وقت بحدے مکنت وجاہ حاصل گشت کہ ہیچ قاضی وحاکم بے مشورہ او منصوب نمی شود پس اوغیراز

یاراں ہمد ماں خود را متولی نمی ساخت

یعنی اندلس میں یحی بن یحی کو سلطان وقت کے نزدیک بڑا مقام حاصل ہو گیا تھا کوئی قاضی ان کے مشورہ کے بغیر مقرر نہیں ہوتا تھا ،اور وہ صرف اپنے ہی لوگوں کو اس منصب پر مقرر کرتے تھے۔

سب کو معلوم ہے کہ اندلس میں فقہ مالکی کا شروع ہی سے غلبہ وبدبہ تھا اور عام طور پر اندلس کے لوگ اسی مذہب کے پیرو تھے تو اب یہاں کسی اور مذہب کے قاضیوں کو مقرر کر کے فقہ مالکی کے خلاف فیصلہ کرانا کس قدر بے دانشی کی بات ہوتی اور اسے مملکت کا نظام کیسا درہم برہم ہوتا۔

بہر حال یہ صرف پروپیگنڈہ ہے جس کو ابن حزم نے بڑے زور شور سے پھیلایا تھا اور پھر اس کی بات کو بلا تحقیق غیر مقلدوں نے بھی دہرانا شروع کیا۔

ابن حزم کا حال یہ ہے کہ ان کو فقہا سے خصوصا مالکیہ اور احناف سے بڑی جلن تھی وہ ان دونوں مذہبوں کے سخت مخالف تھے اس

لیے احناف اور مالکیہ کے خلاف ان کی زبانوں بڑی تیز تھی اوران کی تحریروں میں ان دونوں مذہبوں کے خلاف نفرت وعداوت کی بو ہر شخص محسوس کرسکتا ہے، یہ صاحب پہلے شافعی المسلک تھے پھر غیر مقلدیت کا شوق دامن گیر ہوا تو غیر
مقلد ہوکر مجتہد مطلق ہونے کے مدعی بن گئے مگر جب انکو کسی نے منہ نہیں لگایا تو آتش زیر پا ہوکر فقہ حنفی اور فقہ مالکی کو بطور خاص اپنا نشانہ بنا کر انکے خلاف زہر اگلنا شروع کردیا اور جب زبان اسلاف کے خلاف چل پڑی تو ان کی زبان سے بہت ہی کم لوگ محفوظ رہے اکثر اہل علم اور کبار امت کی انہوں نے پگڑیاں اچھالی ہیں غیر مقلدین تقلید کے خلاف زہر اگلنے میں ابن خزم کا بڑا اسہارا لیتے ہیں اور چونکہ ابن حزم اکابر کے بارے میں بڑے جری تھے اس لیے غیر مقلدین بھی اکابر اسلاف کے بارے میں اسی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہیں ابن حزم کے بارے میں نواب صاحب فرماتے ہیں۔

وبود کثیر الوقوع در علمائے متقدمین ونر دیک نیست که هیچ یکے از بانش سالم ماند ازیں جهت ولهاازدے گریخت وهدف فقهاء وقت شد ......

لهذا ملوک اوراں اندخته واز بلا دبدر کردند

(اتحاف لنبلاء ص ۳۲۱)

یعنی یہ شخص (ابن حزم) علمائے متقدمین کی شان میں بہت زیادہ بکواسیں کرتا تھا، بہت کم ہی لوگ اس کی زبان سے محفوظ رہے اسی وجہ سے
لوگوں کے دل اس سے پھر گئے اور اہل علم کے اعتراضات کا یہ نشانہ بنا............................... انکی انہیں باتوں کی وجہ سے بادشاہوں نے اس کونظر انداز کیا اور ملک بدر کردیا۔

غرض یہ پرپیگنڈہ کہ حنفی مذہب حکومت کی طاقت سے پھیلا ہے یہ ابن حزم ہی کی ایجاد ہے مگر اس باطل پرپیگنڈہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ بالکل اسی طرح کا پروپیگنڈہ ہے جیسا کہ دشمنان اسلام اسلام کے بارے میں نشر کیا کرتے ہیں کہ اسلام بذریعہ تلوار پھیلا ہے
۔

اسلام کی پوری تاریخ میں ایک حنفی ایسا نہیں ملتا جس کے بارے میں یہ صراحت ہو کہ اس نے طاقت اور قوت سے مرعوب ہوکر حنفی مذہب قبول کیا ہو مجھے کوئی غیر مقلد صرف ایک مثال پیش کرکے بتلائے۔

بات یہ ہے کہ حنفی مذہب کی جس انداز میں تدوین ہوئی ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ یہ مذہب اپنی ذاتی خوبیوں سے پھیلے اور حکومت وقت اسی فقہ کو اپنا سرکاری قانون بنائے اس فقہ کی جو سب سے بڑی خصوصیت رہی ہے وہ یہ کہ یہ تنہا ایک شخص کی جد جہد وکاوش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس فقہ کی تدوین میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ اکابر امت کی ایک جماعت جو چند افراد پر مشتمل تھی وہ شریک رہی ہے اس وجہ سے اس فقہ کی بنیاد بڑی مضبوط اور پا
ئیدار ہے پھر یہ کہ یہی سب سے پہلا فقہ ہے جس میں پوری شرح وبسط سے ایک ایک بات کے مسئلے کو مدون کیا گیا ہے، یہ امام ابوحنیفہ اور

ان کے اصحاب کا کارنامہ ہے اس لیے اس فقہ کوشرف اولیت حاصل رہا ہے اور مفصل اور جامع ہونے کیوجہ سے اس فقہ کے سامنے اس وقت کے موجود فقہاء کے علم کا چراغ زیادہ روشن نہیں ہوسکا یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں ایک شافعی محدث کی زبانی سنئے۔

حافظ جلال الدین سیوطی مشہور شافعی محدث وعالم ہیں انہوں حضرت امام ابوحنیفہ کے مناقب میں ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام تبییض الصحیفہ ہے اس کے صفحہ نمبر ۳۰ پر رقمطراز ہیں۔

امام ابوحنیفہ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے علم شریعت کومدون کیا اور اس کو باب، باب کرکے مرتب کیا پھر اس کے بعد امام مالک نے حضرت امام ابوحنیفہ کی اتباع کی اور موطا کو باب باب کرکے مرتب کیا لیکن امام ابوحنیفہ سے پہلے یہ کام کسی نہیں کیا تھا، اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین نے علم شریعت کو باب، باب کرکے جمع نہیں کیا تھا اور نہ اس کے لیے انہوں نے کتابیں مرتب کی تھیں وہ علم کے بارے میں اپنی قوت یاداشت پر اعتماد کرتے تھے پس جب امام ابوحنیفہ نے دیکھا کہ علم پھیل چکا ہے اور اسکے ضائع ہو
نے کا اندیشہ ہے تو اس کو مدون کیا اور ایک ایک باب الگ کیا انہوں نے باب الطہارت سے شروع کیا پھر باب الصلوۃ پھر اسی طرح کے تمام عبادات کے ابواب پھر معاملات کے ابواب اور کتاب المواریث پر ختم کیا اسلئے کہ وراثت کے مسئلہ انسانوں کے معاملات میں سب سے آخری حال سے تعلق رکھتا ہے اور طہارت اور نماز سے اس لئے آغاز کیا کہ نماز ہی عبادتوں میں سب سے اہم عبادت ہے۔

امام ابوحنیفہ ہی نے کتاب الشرائط اور کتاب الفرائض کی داغ بیل ڈالی اسی وجہ سے حضرت امام شافعی فرماتے تھے لوگ فقہ کے بارے میں حضرت امام ابوحنیفہ کے محتاج ہیں۔

یہ کسی حنفی کا نہیں ایک جلیل القدر شافعی محدث اور محقق کا بیان ہے اس بیان سے فقہ حنفی کی عظمت وجلالت اس کی قیمت کا اندازہ ہر شخص لگا سکتا ہے بشیر طیکہ وہ حق پسند ہو معاند اور تعصب کا مارا نہ ہو۔

اچھا اگر کسی درجہ میں غیر مقلدین کی یہ بات قابل تسلیم بھی ہو کہ حنفی مذہب قاضی ابو یوسف کا حکومت وقت میں بے تہاء رسوخ کا رہین منت ہے اور حکومت کے پاور سے پھیلا ہے تو ان لوگوں کے بارے میں یہ غیر مقلدین کیا کہیں گے جہاں نہ ابو یوسف کا اثر تھا اور نہ جس حکومت کے ابو
یوسف قاضی القضاۃ تھے اس کا اثر تھا یعنی دنیا کا بالکل آخری کنارا وہاں جو مذہب حنفی اور اسلام پہونچا تو وہاں کے لوگوں پر کس نے تلوار اٹھا ئی تھی کہ وہ مسلمان ہوگئے تھے اور وہ کون سی طاقت تھی جس کے زیر اثر وہ لوگ حنفی مذہب کے پابند اور امام ابوحنیفہ کے مقلد تھے؟

بنی عباس کا مشہور خلفیہ واثق باللہ کے زمانہ کا واقعہ سنو وہ اس کی زبانی یہ واقعہ مجدد غیر مقلدیت امام سلفیت نواب صدیق حسن بھوپا لی صاحب کی زبانی سنو وہ اپنی کتاب ریاض المرتاض میں لکھتے ہیں۔

در کتاب مسالک وممالک نوشتہ واثق عباسی خوست تابر حقیقت سدآگاهی یا بد در ۲۳۸ درصد بست وهشت سلام نام ترجمان رابا پنجاه نفر بازا دوراحلہ بتفحص آں فرستاد ....بحصنے رسید ندنزدیک کوهے کهسد یاجوج درشعب آنجا است اگر چہ بلادش اندک

بـوداما صحراو اما کن بسیار داشت محافظا ن سد که درآنجا بو دند همه دین اسلا م داشتند ومذهب حنفی زبا ن عربی وفارسی می گفتند ص۳۱۶)

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ کتاب مسالک الممالک میں لکھا ہے کہ واثق باللہ عباسی خلیفہ نے چاہا کہ سد سکندری کا حال معلوم کرے تو اس نے سلام نامی ایک شخص کے ساتھ پچاس لوگوں کو کردیا اوران کے زادراہ اور سواری کا انتظام کیا، اوران کو سد سکندری کا پتہ لگانے کے لیے بھیجا یہ لوگ مختلف ملکوں اور شہروں سے ہوتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ایک قلعہ تھا وہیں ایک گھاٹی میں سد یاجوج تھی وہ ملک اگرچہ چھوٹا تھا مگر جنگلات اور کھلی جگہیں بہت تھیں سد سکندری کے جو محافظ تھے سب کے سب مسلمان تھے اور حنفی المذہب تھے عربی اور فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔

آپ اندازہ لگائیں کہ سد سکندری کے پاس نہ واثق کی حکومت تھی نہ ابو یوسف قاضی کا وہاں کوئی اثر رسوخ تھا وہ جنگلات اور پہاڑوں سے گھرا دور دراز کا ایک علاقہ تھا مگر اسلام کی شعاع سے وہ خطہ درخشاں تھا اسی طرح حنفی مذہب وہاں پہنچ چکا تھا، گویا اسلام کے ساتھ ساتھ مذہب حنفی کا قافلہ بھی رواں دواں تھا یعنی جس طرح اسلام اپنے ذاتی محاسن سے پھیل رہا تھا اسی طرح مذہب حنفی بھی اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں اپنا گھر بنا رہا تھا، یہیں سے حضرت سفیان ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی صداقت کا ظہور ہوتا ہے فرماتے ہیں میرا خیال تھا امام حمزہ کی قرأت اور امام ابوحنیفہ کی فقہ دجلہ کا پل بھی پار نہیں کرسکیں گے مگر وہ تو کوفہ سے نکل کر اطراف عالم میں پھیل گئے ہیں۔

(تاریخ بغداد)

یہ خودان کے زمانے کا واقعہ ہے اور وہ اپنا مشاہدہ بیان کرر ہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی لوگوں کو امام ابوحنیفہ کے فقہ کی آفاقیت اور اس کی وسعت اور ہمہ گیری اور قبولیت عامہ نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔

اہل اللہ نے اس فقہ کے بارے میں جو اپنا مکاشفہ بیان کیا ہے اس کو بھی سن لیں حضرت مجدد الف ثانی کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں ہے وہ فرماتے ہیں۔

بے شائبہ تکلف وتعصب گفتہ می شو د کہ نورا نیت ایں مذھب حنفی بنظر کشفی دورنگ دریائے عظیم می نماید وسائر مذ اھب دورنگ حیاض وجداول بنظر می آیندوبظرھر ھمہ کہ ملاحظہ نمودہ می آید سواد اعظم ازاھل اسلام

متابعان ابی حنیفہ علیہم الرضوان (مکتوب حصہ ھفتم دفتر دوم مکتوب نمبر ۵۵)

یعنی بلا تکلف اور بلا ادنی تعصب یہ کہا جارہا ہے کہ نظر کشفی میں امام اعظم کے مذہب کی نورانیت کی مثال ایک بڑے دریا کی نظر آتی ہے اور دوسرے مذہب اس مذہب کے مقابلہ میں نہروں اور حوض جیسے نظر آتے ہیں اور ظاہر میں بھی دیکھو تو حضرت امام ابوحنیفہ کے ماننے

والے دوسرے مذاہب سے زیادہ ہیں۔

آپ دیکھیں حضرت مجدد نے یہاں جو لفظ استعمال کیا ہے وہ نورانیت کا ہے یعنی مذہب حنفی کو اس کی باطن اور معنوی خوبیوں کی وجہ سے عنداللہ وعندالناس یہ مقام حاصل ہوا ہے نہ کہ زور وزبردستی اور طاقت سے اس نے اپنا رنگ جمایا ہے۔

بہرحال یہ بہت ہی بے ہودہ خیال ہے کہ حنفی مذہب حکومت کی طاقت کے بل بوتے پر پھیلا ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ یا تو حسد کے مریض ہیں یا حقیقت حال سے جاہل ہیں انکی یہ بات اسی طرح سے قابل رد ہے جس طرح اسلام کے خلاف یہود ونصاریٰ کا یہ پر پیگنڈہ کہ اسلام بزور طاقت پھیلا ہے،

(محمد ابوبکر غازی پوری)

شیخ البانی کی خدمت حدیث وسنت

انکی تحقیقات کی روشنی میں:

شیخ محمد ناصر الدین البانی تین دہائی قبل تک عالم عرب کی ایک ایسی شخصیت شمار ہوتے تھے کہ دنیائے عرب میں ان سے بڑا علم حدیث کا ماہر کوئی دوسرا نہیں سمجھا جاتا تھا، ان کی کتابوں میں سلسلہ الاحادیث الصحیحہ کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ ان کے معتقدین کے لیے کسی حدیث کی صحت وضعف کی تحقیق کے لیے یہی دونوں سلسلے اصل مرجع تھے عرب محققین خصوصا سلفی مزاج احادیث سے شغل رکھنے والوں کے لیے کسی حدیث کے بارے میں صححہ الالبانی وضعفہ الالبانی کہہ دینا کافی تھا اور اسی سے اس حدیث کا درجہ ان کے نزدیک متعین ہوجاتا تھا اس صححہ الالبانی وضعفہ الالبانی کی اہمیت ان کے نزدیک صححہ البخاری ومسلم وضعفہ البخاری ومسلم سے بھی زیادہ تھی۔

شیخ البانی کی قیمت اور اہمیت خود ان کی اپنی نگاہ میں اتنی بڑھ گئی کہ وہ کسی دوسرے فن حدیث کے ماہر ومحقق کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھے اور آخر میں تو ان پر انانیت اور علمی عجب وپندار کا ایسا غلبہ ہوگیا تھا کہ وہ اپنے سامنے امام بخاری امام مسلم اور صحاح ستہ کے دوسرے مصنفین ائمہ حدیث کو بھی کچھ بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے احادیث کے بارے میں ان ائمہ حدیث کے خلاف اپنی تحقیق بلا تکلف پیش کرتے اور اسی اپنی تحقیق پر ان کو اعتماد ہوتا البانی کے معتقدین سلفی حضرات کو بھی ان ائمہ کرام کے مقابلہ میں البانی ہی کی تحقیق وتصویب قابل قبول ہوتی۔ اور البانی کی حدیث میں کسی تحقیق کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

شیخ البانی کا جادو لوگوں کے سروں پر اتنا چڑھا ہوا تھا اور ان کی شخصیت سے لوگ اتنا مرعوب تھے کہ احادیث رسول کے بارے میں البانی کی بڑی سے بڑی جرأت بیجا پر بھی لوگ خاموش رہتے اور کسی کو اس کے خلاف لب کشائی کی ہمت نہ ہوتی۔

خدا جزائے خیر دے محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن

صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو انہوں نے پہلی مرتبہ شیخ البانی کی احادیث کے بارے میں تحقیقات کا خالص محدثانہ انداز میں جائزہ لے کر البانی کو ان کی اوقات بتلادی، حضرت اعظمی نے علم وتحقیق کی روشنی میں البانی کی قابلیت وعلمیت کا ایسا پوسٹ مارٹم کیا کہ دنیائے اہل علم عش عش کرتی رہ گئی اور پھر البانی کا سروں پر چڑھا ہوا جادو ایسا ٹوٹا کہ ان کے خلاف خود عرب علماء کے قلم چلنے لگے اور انہوں نے البانی اور ان کی کتابوں کا بھرپور تعاقب کیا اور ان کی حدیث کے سلسلہ کی خدمات وتحقیقات کی حقیقت سے عالم عرب کو باخبر کیا۔

حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا البانی کے خلاف جو قلمی کارنامہ ہے اس کا نام ہے البانی شذوذہ واخطاءہ:

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ البانی صاحب میں عجب وپندار اور انانیت کا زبردست جرثومہ پیدا ہوگیا تھا، یہ خطرناک جرثومہ ان کی زندگی کو ان کی آخری سانس تک لگا رہا اگرچہ مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کے بعد البانی صاحب کا علمی بھرم جاتا رہا اور اہل علم ان کے علمی مقام وتحقیق کی شان سے واقف ہوگئے لیکن چونکہ البانی فطری طور پر بہت ہی عجب پسند اور انانیت پسند تھے اس وجہ سے علامہ اعظمی کے رسالہ میں اپنی حقیقت کا حدود اربعہ ملاحظہ فرمانے کے بعد بھی البانی صاحب کا قلم اسی عجب وپندار کے سا

تھ چلتا رہا اب اللہ ہی جانتا ہے کہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ فقہ وحدیث کے بارے میں قلم کو اس بد احتیاطی سے چلانے کا کارنامہ انجام دینا یہ خود ان کا اپنا داعیہ تھا یا کسی باہر کی دنیا کی خطرناک سازش تھی اور البانی صاحب بطور خاص اس سازش کا نشانہ بنایا گیا تھا تاکہ ایک بڑی اسلامی اور معروف شخصیت کے ہاتھ سے دین اسلام کی ایک اساس کو کمزور کر کے مسلمانوں کو حدیث رسول اور سنت رسول کے بارے میں مشکوک وبدگمان کر دیا جائے۔

یہ بات بڑی حیرتناک ہے کہ البانی نے عام کتب حدیث کے سوا احادیث کا جو سب سے معتبر مجموعہ مسلمانوں کے نزدیک شمار ہوتا ہے اور جس کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے بطور خاص اس کو اپنے قلم اور اپنی تحقیق کا نشانہ بنایا اور اسے مجروح کرنے کی ناپاک کوشش کی۔

بخاری ومسلم کی احادیث کے خلاف البانی کا قلم چلا سنن اربعہ، یعنی ابوداؤد ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کی وہ کتابیں جو زمانہ سلف سے لے کر آج تک مسلمانوں میں متداول رہی ہیں اور جنھیں بخاری ومسلم کے بعد سب سے زیادہ اہم مقام حاصل تھا احادیث کے اس مجموعہ کو پایۂ اعتبار سے گرانے کے لئے البانی نے عجیب وغریب حرکت کی،

ایسی حرکت جس کا واہمہ کسی دشمن اسلام کے ذہن میں بھی اس سے پہلے نہیں گزرا ہوگا۔

البانی نے خدمت حدیث کے نام پر ان چاروں کتابوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ایک حصہ کو ضعیف حدیث والا حصہ قرار دیا اور دوسرے حصہ کو صحیح حدیث والا قرار دیا، یعنی اب یہ چاروں کتابیں آٹھ کتابیں بن گئیں، ضعیف ترمذی، صحیح ترمذی، ضعیف ابی داؤد، صحیح ابی داؤد، ضعیف نسائی، صحیح نسائی، ضعیف ابن ماجہ، صحیح ابن ماجہ،

البانی صاحب نے اپنے اس خطرناک عمل کے ذریعہ دنیا کو تاثر دیا کہ احادیثِ رسول کا یہ مجموعہ جس پر اب تک اہل اسلام کا عمل تھا، نا قابل اعتماد تھا اور مسلمانوں کے اس مجموعہ کا نام جو صحاح رکھا گیا تھا وہ بھی غلط تھا احادیث کی یہ کتابیں ایسی نہیں تھیں کہ ان پر مطلقاً اعتماد کیا جاتا۔

اب البانی صاحب نے احادیث کی ان کتابوں کو ضعیف احادیث سے پاک کر کے اور ان کتابوں کا خالص صحیح احادیث والا مجموعہ تیار کر کے مسلمانوں کے لئے قابل عمل بنا دیا ہے، اب کسی کو امام ترمذی والی ترمذی دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے اب جسے دیکھنا ہو البانی والی ترمذی دیکھے، البانی
کی نسائی دیکھے، البانی کی ابوداؤد دیکھے، البانی کی ابن ماجہ دیکھے۔ البانی صاحب کے کارنامہ نے اصل کتابوں سے مسلمانوں کو مستغنی کر دیا ہے اعتماد اب امام ترمذی پر نہیں کیا جائے گا امام ابوداؤد پر نہیں کیا جائے گا، امام نسائی پر نہیں کیا جائے گا، امام ابن ماجہ پر نہیں کیا جائے گا ان ائمہ کرام کا علم حدیث ناقص تھا ان کی امامت فی الحدیث مشکوک تھی، ان ائمہ کرام کو صحیح وضعیف حدیث میں تمیز کی لیاقت وصلاحیت نہیں تھی، ان ائمہ کرام کی کتابوں پر اب تک جو اعتماد کیا جاتا رہا ہے وہ ہدایت کی راہ نہیں تھی وہ گمراہی کا راستہ تھا۔

اب البانی کی کتابوں کو مسلمان پڑھیں البانی کی تحقیقات پر اعتماد کریں البانی نے ان چاروں کتابوں کا جو خالص مجموعہ تیار کیا ہے

اسی کو ذریعہ نجات سمجھیں۔

البانی صاحب نے اپنے اس کارنامہ سے مسلمانوں کو اوران کی نئی نسل کو یہی خاموش پیغام دیا ،اور حدیث اور ائمہ حدیث کے بارے میں تشکیک کا ذہن پیدا کر دیا اب ایک ذرا سا پڑھا لکھا البانی الذہن سلفی اٹھتا ہے اور وہ بلا تکلف امام بخاری و امام مسلم جیسے اجلہ محدثین کے خلاف قلم اٹھاتا ہے اوران کی کتابوں میں ضعیف احادیث کا سراغ لگاتا ہے۔

البانی زدہ سلفیوں کے اس تماشائے عبرت کارناموں کو دیکھ کر ایک
عرب کا دردمند عالم چیخ اٹھتا ہے وہ سوال کرتا ہے اور اہل علم سے پوچھتا ہے۔

تری هل كان البخاری ؒ عاجزا من انتفاء احاديث الادب المفرد كما انتفى احاديث الصحيح وهل كان ابن القيم ؒ غير قادر على اختيار ماصح فقط فی موضوع كتابه الوابل الصيب ؟ام هل كان احدهما يفتقد الغيرة على السنة وعلى صحيها والعمل به

(التعریف باوھام من قسم السنن ج ا ص ۳۱)

یعنی یہ جو امام بخاری کی کتاب الادب المفرد اور ابن قیم کی کتاب الوابل الصیب کو البانیوں کی طرف سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے ذرا بتلاؤ تمہارا کیا خیال ہے، کیا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح اپنی کتاب الجامع کا صحیح احادیث والا مجموعہ تیار کیا تھا وہ امام بخاری الادب المفرد میں صرف صحیح احادیث لانے پر قادر نہیں تھے ،امام بخاری اس سے عاجز تھے ، یا حافظ ابن قیم عاجز تھے کہ وہ الوابل الصیب اپنی کتاب میں صرف صحیح احادیث لاتے یا ان دونوں کو سنت اور صحیح سنت کے بارے میں وہ غیرت
حاصل نہیں تھی جو آج البانیوں کا حصہ بنی ہوئی ہے۔

البانی اور البانیوں کا یہ کیسا خطرناک عمل ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے یہی عرب عالم کہتا ہے۔

وهذا العمل العظيم كما وصفه اصحابه سيئو دی الى قطع صلة الا مة والا جيا ل القادمة باصول السنة . (ایضا ج ا ص ۲۹)

اور یہ شاندار کارنامہ جیسا کہ البانیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ انجام دے رہے ہیں ان کا وہ عمل ہے جو امت اور آنے والی نسلوں کا رشتہ احادیث و سنت کی اصل کتابوں سے کاٹ دینے والا ہے۔

یعنی امت مسلمہ اور ہماری آنے والی نسلیں اب انہیں چھٹی چھٹائی احادیث اور چھٹی چھٹائی کتابیں جو بقول البانیوں کے منقح اور مصفی شکل میں پیش کی جارہی ہیں انہیں سے واقف رہیں گی ،امام ترمذی کی اصل کتاب کا نام کیا تھا،اس کی خصوصیات کیا تھیں امام ترمذی نے اس کتاب میں امامت فی الحدیث اپنے تبحر علمی اور اپنی بے نظیر فقاہت کے جو نقش و نگار قائم کئے ہیں ان کو بھلا دیا جائے گا اور یہی حال احادیث کی بقیہ ان کتابوں کا بھی ہوگا
جو البانیوں کی کاٹ چھانٹ کا نشانہ بنیں گی۔

خدمت حدیث کے نام پر حدیث کے خلاف کیسا محاذ قائم کیا جارہا ہے اور سنت رسول کے بارے میں کیسا فتنہ پیدا کیا جارہا ہے، اور منکرین سنت کے ہاتھوں کو کس طرح مضبوط کیا جارہا ہے اس کا اندازہ ہر باغیرت مسلمان کو ہوگا، اس کا اندازہ ان کو ہوگا جو اسلاف کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں اور اس کو اپنے سینوں سے لگائے رکھنا چاہتے ہیں۔

ایک طرف ہمارے اسلاف کی خدمت حدیث کے سلسلہ میں جو جانکاہی رہی ہے اس کا علم حاصل کیجئے، انہوں نے کس طرح سے احادیث وسنت کے سرمایہ کو جمع کیا احادیث کی تحقیق وطلب میں کتنی جان کھپائی ایک ایک حدیث کی چھان بین کے لئے کتنے اسفار کئے کتنے دوروں کی خاک چھانی، اپنی عمر کا کتنا وقت لگایا اور جب ان کی محنتوں کا ثمرہ ہمیں پکا پکایا مل گیا تو البانی جیسے محقق لوگ پیدا ہوئے جو ہاتھ میں پنسل لے کر اٹھتے ہیں اور کسی حدیث پر ضعیف اور کسی پر صحیح کا نشان لگا کر خدمت حدیث کا شاندار کارنامہ انجام دے رہے ہیں الاستاذ محمد عبداللہ شاکر فرماتے ہیں۔

وشتان بین هذا العمل العظیم و الجهد النافع الکبیر وبین ان تمسک بقلم الرصاص ثم تعلم علی بعض الاحادیث فی کتاب تجعلها فی قسم الصحیح وعلی آخر تجعلها فی الضعیف (ص ۳۲)

علمائے سلف اور ائمہ حدیث کا حدیث کے سلسلہ میں جو عظیم الشان کارنامہ اور ان کی جو مفید اور عظیم کوشش رہی ہے اس میں اور تمہارے اس عمل میں کہ تم پنسل پکڑ کے کسی حدیث پر صحیح کا نشان لگا کر کے اس کو ایک کتاب میں جمع کر دو اور کسی پر ضعیف کا نشان لگا کر دوسری کتاب تیار کرو، کتنا فرق ہے۔

احادیث کے بارے میں البانی صاحب کی تحقیق کا یہی انداز تھا البانی صاحب احادیث کی تحقیق اور اس کی بحث میں کتنی محنت برداشت کرتے تھے اس کا اندازہ کرنے کے لئے ان کے ایک شاگرد کا وہ بیان کافی ہے جو آئندہ سطروں میں آرہا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک حدیث کے بارے میں البانی صاحب نے اپنی تحقیق کی روشنی میں ضعیف ہونے کا فیصلہ کر دیا اور اس کی سند کے ایک راوی کو مجہول بتلایا، اس پر اعتراض ہوا کہ جناب والا یہ حدیث نہ ضعیف ہے اور نہ راوی مجہول ہے آپ نے حافظ ابن حجر کی صرف تقریب دیکھ کر یہ فیصلہ کیا

ہے، اگر تراجم کی مزید کتابیں دیکھتے بلکہ حافظ ہی کی تہذیب بھی دیکھ لیتے تو بھی آپ نے حدیث پر اور اس سند کے راوی پر جو حکم لگایا ہے ، یہ غلط تحقیق آپ سے صادر نہ ہوتی تو ان کے ایک شاگرد نے شیخ البانی کے قصور اور ناقص کارکردگی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے شیخ کا دفاع اس انداز سے کیا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

لم ینشط شیخنا حفظه الله المراجعة التهذیب (ص ۳۳۱)

یعنی ہمارے شیخ حفظہ اللہ کو تہذیب کی مراجعت کے لئے نشاط نہیں رہا اندازہ لگائیے کہ احادیث رسول کے بارے میں یہ حضرات کتنے جری ہیں البانی صاحب رسول اللہ ﷺ کی ایک صحیح حدیث کو ضعیف قرار دینے کی ہمت کر رہے ہیں اور انہیں یہ توفیق نصیب نہیں ہو رہی ہے کہ اس کے بارے میں رجال کی متداول کتابوں اور تہذیب جیسی معروف ومشہور اور عام طور پر ہر کتب خانہ میں پائی جانے والی

کتاب کی طرف بھی رجوع کریں شاگرد کا اپنے استاذ کی طرف سے یہ کتنا شاندار دفاع اور جواب ہے شیخ محمود سعید شاگرد کے اس جواب کے بارے میں فرماتے ہیں۔

قلت الامر متعلق براوٍ حدث حوله اخذ وردو

انکار سنة واثبات بدعة توهما فاذا عدم التحقيق والبحث والنشاط فی التهذيب الذی هو فی متناول الجميع فی مثل هذا لموضع فعدمه فی غيره اولیٰ (ج ا ص ۳۳۲)

یعنی معاملہ یہاں ایک ایسے راوی کا ہے جس کے بارے میں فیصلہ یہ کرنا ہے کہ اس کی حدیث قابل اخذ ہے یا قابل رد، اور معاملہ محض وہم کی بنیاد پر ایک سنت کو رد کرنے اور ایک بدعت کو ثابت کرنے کا ہے پس جب ایسے اہم موقع پر تہذیب جیسی عام طور پر پائی جانے والی کتاب کے بارے میں بحث وتحقیق اور نشاط معدوم ہے تو دوسری جگہوں اور دوسری کتابوں میں تو بدرجہ اولیٰ یہ بحث وتحقیق اور یہ نشاط معدوم ہوگا۔

حدیث رسول ﷺ کے بارے میں البانی صاحب کی جرأت اور سہولت پسندی کا یہ حال ہے جو ناظرین نے ملاحظہ فرمایا اور بحث وتحقیق کی اسی نادر مثال کے بل بوتہ پر ان کو جرأت ہوتی ہے کہ وہ امام بخاری، امام مسلم امام ترمذی امام ابوداؤد امام نسائی امام ابن ماجہ اور دوسرے ائمہ حدیث کی کتابوں کے بارے میں فیصلہ فرمائیں اور ان کتابوں کو صحیح وضعیف میں تقسیم کریں اس جرأت وجسارت پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

کسی حدیث پر صحت وضعف کا حکم لگانا بچوں کا کھیل نہیں ہے معاملہ احادیث رسول کا ہے اس وجہ سے ایک محتاط محدث کسی حدیث کے بارے میں پہلے تمام متعلقہ امور پر غور کرتا ہے اس حدیث پر ہر زاویہ سے نگاہ ڈالتا ہے کتنی سندوں سے یہ حدیث مروی ہے اس حدیث کے شواہد اور کیا ہیں ان شواہد کا حال کیا ہے امت کا اس حدیث پر عمل ہے یا نہیں ائمہ حدیث کا اس حدیث کے بارے میں فیصلہ کیا ہے غرض پوری تحقیق اور پوری چھان بین کے بعد ہی ایک محتاط محدث حدیث کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے پھر اس محدث کو دین ودیانت کے اعتبار سے بھی بہت اعلیٰ معیار پر ہونا چاہئے تاکہ حدیث کے بارے میں کوئی فیصلہ اس کے نفس کا تقاضا نہ ہو۔

افسوس اس کا ہے کہ البانی صاحب نے ان تمام باتوں کا اپنی کتابوں میں خیال نہیں کیا اور قلم برداشتہ جو چاہا لکھ دیا، اور اب یہی ذہن زمانہ حال کے ان سلفیوں کا بھی ہوگیا ہے جو البانی کی فکر ومزاج سے متاثر ہیں۔

اس وقت میری زیر مطالعہ ایک کتاب ہے جس کا پورا نام "التعریف باوهام من قسم السنن الی صحیح وضعیف" اس کتاب کے مصنف کا نام شیخ محمود سعید ہے دبئی کے دارالبحوث والدراسات الاسلامیہ واحیاء التراث میں حدیث کی خدمت انجام دیتے ہیں اور بڑے محقق اور وسیع المطالعہ فن حدیث کے عالم ہیں شیخ محمود نے اپنی اس کتاب میں بطور خاص البانی صاحب کی چاروں کتابوں کا یعنی ضعیف ابی داؤد، ضعیف ترمذی، ضعیف نسائی اور ضعیف ابن ماجہ کا بڑی دقت نظر اور مہارت فن سے جائزہ لیا ہے، اور احادیث کے بارے

میں البانی صاحب کی جرأت بیجا کا پورا محاسبہ کیا ہے اور ان کی غلطیوں سے اہل علم کو باخبر کیا ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ شیخ البانی کا علم حدیث بہت ناقص اور سرسری مطالعہ والا تھا اس وجہ سے انہوں نے بہت سی ان احادیث کو بھی ضعیف قرار دیا ہے جن کا ضعف محدثین کو تسلیم نہیں ہے، یا اگر وہ ضعیف بھی ہیں تو امت کا اس پر عمل رہا ہے امت کے تعامل کی وجہ سے اس حدیث کا ضعف جاتا رہا ہے یہ کتاب بڑی دلچسپ اور اہل علم کے لئے لائق مطالعہ ہے اس وقت میرے زیر مطالعہ اس کی چوتھی جلد ہے میں اسی سے ناظرین کی عبرت کے لئے البانی صاحب کی خدمت حدیث کے چند نمونے پیش کر رہا ہوں اور بقیہ کے لئے عرض کروں گا کہ قیاس کن از گلستان من بہار مرا

(۱) ابو داؤد اور ترمذی میں ابو بسرۃ الغفاری کی حضرت براء بن عازبؓ کی یہ حدیث ہے

قال صحبت رسول الله ﷺ ثمانية عشر سفراً فمارأيته ترک الرکعتين اذازاغت الشمس قبل الظهر .

حضرت براءؓ فرماتے ہیں کہ اٹھارہ سفروں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ میں رہا سورج ڈھلنے کے بعد ظہر کی نماز سے پہلے دو رکعت کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے چھوڑا ہو۔

البانی صاحب نے ترمذی اور ابو داؤد کی اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور ابو بسرۃ الغفاری کے بارے میں اپنی یہ تحقیق پیش کی ہے کہ وہ غیر معروف ہیں اس وجہ سے ان کی یہ روایت ضعیف ہے۔

البانی صاحب کا یہ کہنا کہ ابو بسرۃ غیر معروف ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی یہ روایت ضعیف ہے بالکل غلط ہے ابو بسرۃ غفاری ثقہ تابعی ہیں امام بخاری نے ان کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا ہے اور ان پر کوئی جرح نہیں کی ہے، ابو حاتم نے بھی ان کو ضعیف نہیں قرار دیا ہے، امام ابو داؤد نے ان کی یہ حدیث ذکر کر کے اس پر کوئی کلام نہیں کیا ہے، امام بخاری کو ابو بسرۃ کا نام کیا ہے صرف یہ نہیں معلوم تھا کسی راوی کی کنیت معلوم ہو اور اس کی شخصیت معرف ہو محدثین اس کو ثقہ قرار دیتے ہوں اس کی روایت ذکر کرتے ہوں تو صرف اس کا نام نہ معلوم ہونے کی وجہ سے اس کی حدیث ضعیف نہیں قرار پا سکتی، کتنے ایسے راوی ہیں جن کا نام معروف نہیں مگر ان کنیت معروف ہے اور وہ اپنی کنیتوں ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔

غرض جلیل القدر محدثین اور ماہرین فن تو ابو بسرۃ کی اس حدیث کو صحیح اور حسن قرار دیتے ہیں مگر البانی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور کیوں؟ تو اس وجہ سے کہ البانی صاحب کو ابو بسرۃ کا نام معلوم نہ ہو سکا حضرت ابو بکرؓ تو صحابی رسول ہیں ان کا نام کتنے لوگوں کو معلوم ہے؟

کاش البانی صاحب یہ سمجھتے کہ جس طرح ضعیف حدیث کو صحیح قرار دینا جرم ہے اسی طرح صحیح حدیث کا انکار کرنا اور اس کو بلا وجہ ضعیف قرار دینا بھی بہت بڑا اور سنگین جرم ہے، (اس حدیث پر پوری بحث کے لئے دیکھئے جلد چہارم حدیث نمبر ۴۹۳)

(۲) جعفر بن ابی مغیرہ سعید بن جبیر سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ:

قال کان رسول الله ﷺ یطیل القرأۃ فی الرکعتین بعد المغرب حتی یتفرق اھل المسجد

اللہ کے رسول ﷺ مغرب کے بعد کی دو رکعت سنت میں اتنی طویل قرأت فرماتے تھے کہ مسجد والے مسجد سے چلے جاتے

یہ روایت ابوداؤد شریف کی ہے، البانی نے اس کو ضعیف ابی داؤد میں ذکر کیا ہے، یعنی یہ روایت ان کے نزدیک ضعیف اور مردود ہے، البانی صاحب فرماتے ہیں کہ جعفر بن ابی مغیرہ سعید بن جبیر سے روایت کرنے میں قوی نہیں ہے۔

البانی نے اس کے لئے محدث ابن مندہ کا حوالہ دیا ہے اب محدثین اور ماہرین حدیث کا اس روایت کے بارے میں فیصلہ ملاحظہ فرمایئے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے محدث عبدالحق کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، حافظ ذہبی نے جعفر کو صدوق کہا ہے، ابن مندہ کی جرح کو محدثین نے قبول نہیں کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ ابن مندہ کی جرح جعفر پر عقیدہ میں اختلاف کی وجہ سے ہے اور عقیدہ کے اختلاف کی وجہ سے جو جرح ہو محدثین اس کو عام طور پر قابل اعتبار نہیں سمجھتے جعفر ابن ابی مغیرہ سعید بن جبیر سے روایت کرنے میں مشہور ہیں اگر سعید بن جبیر سے ان کی روایت صحیح نہ ہوتی تو دوسرے محدثین اس کا تذکرہ ضرور کرتے، امام ترمذی

نے جعفر بن مغیرہ عن سعید بن جبیر کی سند کو حسن قرار دیا ہے ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے، امام بخاری نے بھی جعفر کی حدیث کو ضمناً ذکر کیا ہے، اور تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ خود البانی صاحب نے بھی اس سند کو اپنے صحیحہ میں حسن قرار دیا ہے اور صاف صاف لکھا ہے ھذا اسناد حسن ورجالہ ثقات یعنی یہ سند حسن ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔

ذرا آپ انصاف سے کام لیں اور بتلائیں کہ کیا حدیث کی خدمت اسی طرح ہوتی ہے البانی صاحب کو یہ بھی پتہ نہیں کہ اس سند کے بارے میں اپنے صحیحہ میں وہ خود کیا فرما چکے ہیں، اب اس قسم کے علم والے لوگ احادیث رسول کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ قابل عمل ہے کہ نا قابل عمل، مردود ہے کہ مقبول صحیح ہے کہ ضعیف، اور ہمارے علمی افلاس کا حال یہ ہے کہ ہم ایسے ناقص لوگوں کی تحقیقات پر اعتماد کرتے ہیں۔ (پوری بحث کے لئے اس جلد کی حدیث نمبر ۵۲۷ دیکھو)

(۳) ابن ماجہ میں حضرت ابن عمرؓ کی یہ روایت ہے۔

ان رسول الله ﷺ قال صلوٰۃ اللیل مثنیٰ مثنیٰ

یعنی آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ رات کی نماز دو دو رکعت ہے

البانی نے اس حدیث کو ضعیف ابن ماجہ میں شامل کیا ہے، اور اس پر

کوئی کلام نہیں کیا ہے ضعیف ابن ماجہ میں اس حدیث کو داخل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث البانی کے نزدیک معتبر نہیں ہے، حالانکہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی ہے اور متعدد طرق سے نقل کی گئی ہے مگر البانی صاحب کی جرأت کا عالم یہ ہے کہ صحیحین یعنی بخاری و مسلم کی اس روایت کو بھی ضعیف بتلا رہے ہیں

(پوری بحث کے لئے دیکھو حدیث نمبر ۵۳۹)

(۴) سنن ابی داؤد میں حضرت عائشہؓ کی روایت آئی ہے۔

ان رسول الله ﷺ صلى العشاء ثم صلى ثمان ركعات قائما وركعتين بين الاذانين ولم يكن يدعهما.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھ کر آٹھ رکعت نماز کھڑے ہو کر پڑھی اور دو رکعت فجر کی اذان اور اقامت کے درمیان ادا کی اور ان دو رکعت کو آپ کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔

البانی نے اس حدیث کو ضعیف ابی داؤد میں داخل کیا ہے اور بتلایا ہے کہ یہ حدیث بین الاذانین کے جملہ کے ساتھ ضعیف ہے اور البانی صاحب کی تحقیق میں بین الاذانین کے بجائے بعد الوتر کا لفظ محفوظ ہے۔

یہ شیخ البانی کی تحقیق کا حاصل ہے حالانکہ البانی صاحب کی یہ تحقیق

بالکل ناقص ہے، اور بین الاذانین کے ساتھ یہ حدیث بالکل صحیح ہے شیخ محمود سعید فرماتے ہیں بل الحدیث صحیح جدا بھذا اللفظ یعنی اس لفظ کے ساتھ یہ حدیث بالکل صحیح ہے، امام بخاری نے بخاری شریف میں اس کو ذکر کیا ہے بخاری شریف کی روایت میں صاف موجود ہے ورکعتین بین الندائین۔

البانی صاحب کی ساری زندگی بقول البانیوں کے حدیث کی خدمت میں گزری مگر افسوس کہ ان کو پتہ بھی نہیں چل سکا کہ اللہ کے رسول کی رات نماز کی حالت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہی، کبھی آپ نے کسی طریقہ سے پڑھی اور کبھی کسی طریقہ سے پڑھی آپ کی نماز بتلانے والے صحابی نے کبھی ایک حالت کا ذکر کیا ہے اور کبھی دوسری حالت کا ذکر کیا، کبھی اس نے رات کی نماز کی پوری تصویر کھینچ دی کبھی اس کا ذکر مختصر انداز میں کیا اس وجہ سے روایت کے الفاظ مختلف ہو جاتے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کسی حدیث میں راوی نے کسی بات کو ذکر نہیں کیا یا اس کو اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا اور دوسری روایت میں وہ بات مذکور ہے تو اس دوسری حدیث کا محض اس وجہ سے انکار کر دیا جائے کہ اس میں وہ بات ہے جو دوسری روایتوں میں نہیں ہے محض زبردستی کی بات ہے اگر کوئی متضاد اور مخالف بات دو حدیثوں میں ہے تب تو اس کی تحقیق کی جاتی ہے کہ کون سی بات محفوظ ہے اور کون سی

بات غیر محفوظ مگر جب روایات میں تضاد نہیں کوئی اختلاف نہیں تو پھر محض اس وجہ سے کہ فلاں بات فلاں راوی نے ذکر کی ہے اور فلاں نے نہیں ذکر کی ہے اس وجہ سے وہ لفظ غیر محفوظ ہے اور اس کو ذریعہ بنا کر بخاری و مسلم کی بھی روایات کا بھی انکار کر دیا جائے کتنی جسارت اور انانیت کی بات ہے شیخ محمود سعید فرماتے ہیں کہ البانی کا اعتراض بالکل غلط ہے اس لئے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی ہے، فرماتے ہیں،

وقوله بين الاذانين صحيح متفق عليه من حديث البخاري (۱۱۶۴) (ومسلم ۷۳۸ وغيرهما)

یعنی حدیث میں بین الاذانین کا لفظ ہے اور متفق علیہ ہے یہ بخاری کی حدیث نمبر ۱۱۶۴۔ اور مسلم کی حدیث نمبر ۷۳۸ میں موجود ہے۔

(پوری بحث کے لئے دیکھو حدیث نمبر ۵۴۳)

(۵) ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے اسود بن زید نے ان سے حضورﷺ کی رات کی نماز کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔

کان یصلی ثلاث عشر رکعة من اللیل ثم انه

صلی احدی عشرة رکعة وترک رکعتین ثم قبضﷺ حین قبض وھو یصلی من اللیل تسع رکعات وکان آخر صلوته من اللیل الوتر.

آنحضورﷺ رات میں تہجد کی نماز تیرہ رکعت ادا کرتے تھے پھر دو رکعت چھوڑ دیا اور گیارہ رکعت پڑھتے تھے اور پھر وفات کے وقت آپ تہجد کی نماز نو رکعت ہوا کرتی تھی اور آخر میں وتر پڑھتے تھے۔

شیخ البانی نے اس حدیث کو ضعیف ابوداؤد میں ذکر کیا ہے شیخ محمود فرماتے ہیں ھذہ خرافۃ والحدیث صحیح یعنی یہ البانی کی محض بکواس ہے یہ حدیث ضعیف نہیں صحیح ہے، نو رکعت والی حدیث کو امام احمد، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی وغیرہ نے بھی ذکر کیا ہے اور ابوداؤد کی اس مذکورہ حدیث احمد، امام ترمذی، نسائی ابن ماجہ، نے دوسری سند سے ذکر کیا ہے نو رکعت والی حضرت عائشہؓ کی ذکر کر کے امام ترمذی فرماتے ہیں حسن صحیح یہ حدیث حسن صحیح ہے حدیث کا آخری حصہ جس میں وتر کا ذکر ہے س کی تخریج مسلم نے بھی کی ہے شیخ محمود سعید فرماتے ہیں والحاصل ان تضعیف الالبانی لھذا الحدیث خطأ یعنی خلاصہ کلام یہ ہے کہ البانی نے اس حدیث کو جو ضعیف قرار دیا ہے وہ غلط ہے پھر لکھتے ہیں۔

اگر البانی زحمت اٹھا کر حافظ منذری کی مختصر سنن ابی داؤد کو دیکھ لیتے تو ان کو نظر آتا کہ حافظ منذری نے س حدیث کو ذکر کر کے صراحت سے لکھ دیا ہے کہ اس حدیث کی تخریج امام ترمذی اور نسائی نے کی ہے اور اس کے آخر کا ٹکڑا امام مسلم نے ذکر کیا ہے (پوری بحث کے لئے حدیث نمبر ۵۴۴ دیکھو)

(۶) حضرت عائشہؓ کی حدیث ابن ماجہ میں اور اس کے الفاظ یہ ہیں

کان النبیﷺ یصلی من اللیل ثلث عشرة رکعة

یعنی نبیﷺ رات کی نماز تیرہ رکعت پڑھتے تھے

البانی نے اس حدیث کو ضعیف ابن ماجہ میں ذکر کیا ہے اور تیرہ رکعت کے لفظ کو شاذ بتلایا ہے اور کہا کہ گیارہ کا عدد محفوظ ہے پھر کہا کہ تیرہ کہنا ہشام کی غلطی ہے۔

البانی صاحب کی اس تحقیق کو دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی اور دل نے کہا کہ اگر احادیث کی اسی قسم کی تحقیق ہوتی رہی تو پھر احادیث کا خدا ہی حافظ تیرہ کے لفظ کو شاذ کہنا البانی صاحب کی ایسی فاش غلطی ہے کہ جس کو حدیث کا معمولی سا بھی علم حاصل ہے وہ البانی صاحب کی اس جرأت پر تعجب ہی کرے گا حضرت عائشہؓ کی تیرہ والی حدیث تو خود بخاری میں ہے

، یہ حدیث ضعیف اگر ہے تو بخاری پر سے اعتماد ختم۔

آنحضورﷺ کی رات کی نماز تیرہ بھی تھی اور گیارہ بھی، اور نو بھی حضرت عائشہؓ نے اپنی مختلف احادیث میں سب کو بتلایا ہے اس میں سے کوئی عدد بھی شاذ نہیں ہے۔

(۷) ابوداؤد میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

وهب بن منبه عن عبدالله بن عمر و انه سال النبی ﷺ فی کم یقرأ القرآن ،قال فی اربعین یوماً ثم قال فی شهر ثم قال فی عشرین ثم قال فی عشر ثم قال فی سبع لم ینزل من سبع .

وہب بن منبہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضورﷺ سے پوچھا کہ کتنے دنوں میں قرآن ختم کرنا چاہئے تو آپﷺ نے فرمایا چالیس روز میں پھر فرمایا ایک مہینہ میں پھر فرمایا بیس روز میں پھر فرمایا دس روز میں پھر فرمایا سات روز میں اور آپﷺ اس سے نیچے نہیں اترے۔

البانی صاحب نے اس حدیث کو ضعیف ابی داؤد میں شامل کیا ہے اور کہا ہے کہ لم ینزل من سبع کا لفظ شاذ ہے اور شاذ اس لئے کہ اس سے پہلی
روایت میں تین تک کی اجازت ہے۔

شیخ محمود فرماتے ہیں کہ الحدیث صحیح محفوظ بھذا اللفظ یعنی یہ حدیث صحیح ہے اور اس لفظ کے ساتھ محفوظ ہے اس حدیث کو امام احمد نے اپنی سند میں کئی جگہ ذکر کیا ہے، بخاری نے بھی اس کو کہیں مطول اور کہیں مختصر ذکر کیا ہے۔امام
مسلم نے بھی اس لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے ترمذی نے بھی اس کو مختصراً ذکر کیا ہے نسائی اور ابن ماجہ نے بھی اسی لفظ کے ساتھ اس کو ذکر کیا ہے

۔

باب فضائل القرآن میں بخاری کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں

عن عبدالله بن عمرو قال لی رسول الله ﷺ اقرأ القرآن فی شهر قلت انی اجدقوة حتی قال فاقرأه فی سبع ولاتزد علی ذلک

یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ قرآن ایک مہینہ میں پڑھو میں نے عرض کیا کہ مجھ میں اس سے زیادہ کی قوت ہے (تو آپ نے مزید کچھ دن کم کردیئے) مگر آخر میں فرمایا کہ سات دن سے کم میں مت پڑھو۔غرض سات کا لفظ عام طور پر روایات میں موجود ہے، بلکہ بخاری کے بقول تین سے زیادہ سات کا لفظ محفوظ ہے

بخاری کی بات یہ ہے **وقال بعضهم فی ثلاث اوفی سبع واکثر هم علیٰ سبع** بعض نے تین یا سات کا ذکر کیا ہے مگر اکثر سبع ہی کا ذکر کرتے ہیں (پوری بحث کے لئے دیکھو حدیث نمبر ۵۵۳) البانی صاحب کی احادیث رسول کے بارے میں اس جرأت بیجا پر تعجب کرتے ہوئے شیخ محمود فرماتے ہیں:

ویاسف محب السنة لتضعیف الاحادیث الصحیحة بهذه الجرأة و الشناعة نعوذبالله من شهوة التظاهر بالاستدراک علی المتقدمین والله اعلم بالنیات.

یعنی صحیح حدیثوں کو اس جرأت اور قباحت کے ساتھ ضعیف قرار دینے کے عمل پر ایک سنت کا شیدائی افسوس کرتا رہ جاتا ہے۔ متقدمین کے برخلاف احادیث پر احکام صادر کرنے کی خودنمائی کی شہوت سے اللہ کے ذریعہ ہم پناہ چاہتے ہیں۔

ناظرین کرام یہ قضیہ بڑا طویل ہے اور یہ المیہ بڑا دردناک ہے اور یہ داستان بڑی عبرتناک ہے ہم نے محض ان چند مثالوں سے احادیث رسول کے خلاف جو ایک محاذ قائم کردیا گیا ہے اور جس کی سربراہی البانی نے کی تھی اس کا کچھ نمونہ پیش کیا ہے ہم اہل علم حضرات اور عام مسلمانوں سے گزارش کریں گے کہ البانی اور البانیوں کے اس فتنہ سے وہ آگاہ رہیں ،اور حدیث کی خدمت کے نام پر جو حدیث دشمنی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے اس سے وہ دھوکہ نہ کھائیں۔

کارما تبلیغ رسالت بتو بس ست

بعداز دعا شمارا خدارا سپرده ایم